Babar

بابر

مصنف

ہیرلڈ لیم

This is an Urdu Translation of Tiger By Harold Lamb

فہرست

مقدمہ

وسط ایشیا کی ایک گمنام سی وادی میں بابر 1483 میلادی میں پیدا ہوا۔(۱)ان پہاڑیوں کے سوا حکومت واقتدار کی صرف دوطرفہ یادا سے ورثہ میں ملی تھی۔وہ یوں کہ وہ ماں کی طرف سے تو چنگیز خاں کی اولاد میں تھا۔ جوالوس مغول کا سردار اور کچھ عرصے تک دنیائے معلومہ کے بڑے حصے کا فرمانروا تھا۔باپ کی طرف سے اس کا اور بھی قریبی براہ راست نسب تیمور لنگ (لفظی معنی لنگڑا فولاد) تک پہنچتا تھا، جسے یورپ والے تاتاری فاتح ''تمرلین'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔اس طرح بابر کے کون میں منگول نسل کی موقع شناس بربریت کا چھینٹا،اوراس سے بھی قوی تر ترک قوم کی توانائی شامل تھی۔پھر یہ دوگونہ ترک ومغل ترکہ اورآگے جا کر ایک بعید طرز زندگی یعنی خانہ بدوشی سے متوارث ہوا تھا۔

نامحدود زمانے سے وسطی ایشیا کے بدوی قبائل اپنے مواشی کے گلوں پر زندگی بسر کرتے تھے۔جس میں ان کی مل کر شکار کھیلنے کی مہارت مدد ہوتی تھی۔ندی نالوں کی تپلی گزرگاہیں ان کے راستے تھے۔صحرا کی اچھی چراگاہیں ان کی مقبوضہ اراضی تھی۔بن والے پہاڑ ان کے امن تھے۔انہیں پناہ گاہوں اور بہتر مرغزاروں کی تلاش میں وہ اپنی بھیڑ بکری،گھوڑے،کمل کے لپٹ جانے والے ڈیرے،غرض تمام اثاث البیت کے ساتھ برف پوش پہاڑوں کے پار ہجرت کرآتے تھے۔کبھی کبھی یہ متحرک قبیلے کسی صاحب عزم خداداد سردار کے ماتحت ایک بڑا جنگی جتھا بن جاتے

تھے۔ جس میں تمام تندرست مرد صحرا کے جان دار ٹٹوں پر سوار ہوتے، اور ان کا خاص ہتھیار سینہ بند رہتا تھا۔ یہ لشکر اپنے گم نام گوشوں سے یا تو سخت قحط پڑ جانے کے باعث یا کسی زیادہ طاقت ور جتھے کے دباؤ سے نکلتے یا دور دست متمدن شہروں کی دولت لوٹنے کی طمع انہیں باہر لاتی تھی۔ ان غارت گروں کا یہ خروج قدرت کی سی باقاعدگی کے ساتھ عمل میں آتا۔ مغربی یورپ کے بعید اقطاع میں موج در موج ہن، اوار، بلغار، ترک و مغول کی ان طغیانیوں کو قہر الٰہی اور یا رکے ہوئے یاجوج ماجوج کا رسیاں تڑا کر نکلنا سمجھ کر لوگ صبر کر لیتے تھے۔

بابر کے معاملے میں اسلاف قدیم کا یہ طریق زندگی محض بھولی بسری یاد نہیں تھا۔ ممکن ہے خود اس کی سرشت میں خانہ بدوشی کے دبے ہوئے اثرات موجود ہوں ،لیکن زندہ خانہ بدوش تو اس کے لئے عمر بھر بلائے جان بنے رہے۔ کیونکہ وسط ایشیا کے یہ نو وارد خاص صفات کے مالک ہوتے تھے۔ بھیانک سرزمینوں میں موسم کے شدائد کا پیہم مقابلہ کرتے رہنے سے ان میں بڑی جفاکشی اور خطرات کے وقت فوری تدبیر کر گزرنے کی قابلیت آ جاتی تھی۔ کمزور بال بچوں کی حفاظت گلوں کے ٹھکانے اور خود اپنے ڈیرے ڈالنے کی ضرورتیں شروع سے ان میں تنظیم کا بڑا سلیقہ پیدا کر دیتی تھیں۔ جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ ان وسط ایشیا کے جفاکش تیر انداز سواروں کے مقابلے میں آرام سے رہنے والے شہری عموماً نہیں ٹھہر سکتے۔ تھے۔ لیکن ایک حقیقت جس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تھی۔ یہ تھی کہ ان بدوؤں کی فوقیت کا سبب ان کے ذہن کی تیزی اور موقع کے مطابق بدل جانا بھی ہوتی تھی۔ رومہ

کے قدیم ترین مسیحی دعاۃ میں سے ایک کا مشاہدہ یہ تھا کہ جنگ میں ''تا تاری'' اس قدر وحشی اور خون خوار نہ تھے، جتنا مسیحی یورپ کے عسکری، بابر سے ایک ہی نسل سے کچھ ہی زیادہ مدت پہلے عثمان لی ترکوں نے جو اپنے اوطان سے کہاں کہاں سے جتے ہوئے آتے تھے۔ شہر قسطنطنیہ کو تسخیر کیا۔ کہ قریب قریب نا قابل تسخیر مقام تھا۔ تو یہ عظیم کامیابی محض جسمانی مشقت کی بنا پر نہ تھی۔ بلکہ اس میں آبنائے باسفورس میں پل بنا لینے، اور اسے دونوں جانب مستحکم کر لینے، نیز اعلیٰ قسم کے آلات قلعہ شکنی سے کام لینے کی حربی تدابیر کا بہت کچھ دخل تھا۔

علی ہذا القیاس یہ بات بھی لوگوں کے ذہن میں کم آتی ہے کہ وسط ایشیا کے قدیم فاتح خوانین وسلاطین نے اپنی فتوحات کی کارگر تنظیم کرنے میں کیسی لیاقت کا ثبوت دیا تھا۔ چنگیز خان کے تحت نہایت وسیع پیانے پر مغول کی تاخت وتاراج کو دو پشتیں بھی نہ گزری تھیں کہ منہدم بعید شہروں کی نئی تعمیر ہونے لگی۔ ملک چین کو مغل ''یورت کبیر'' یعنی بڑا پڑاؤ کہتے تھے۔ وہاں کے فرمان روا قبلائی خان نے عیش ونشاط کے قریب قریب ہر ''شہانہ گنبد'' کی تعمیر کے ساتھ شکارگاہوں کے اندر مسکونہ محلات بنانے کا بھی حکم دیا تھا۔ اور تجارت کے راستوں کو دوبارہ بحال کیا۔ جیسا کہ اطالوی سیاح مارکوپولو شہادت دے گیا ہے۔ تنظیمی مہارت کے علاوہ یہ مغل فرمانروا دنیا کے سامنے ذمہ داری کا احساس رکھتے تھے۔ چین میں ان کا خانوادہ، یوآن ایک وسعت پذیر سلطنت کا سربراہ تھا۔ ایران میں ایل خانیوں نے ترقی پذیر شہر تبریز کو مرکز بنایا، اور نہایت باقاعدگی کے ساتھ ان ممالک پر حکمرانی کی۔ جن میں سخت ابتری

پھیلی ہوئی تھی۔ آگے چل کر عثمانیوں نے ایک مضبوط سلطنت دولت عثمانیہ کو' اسی شہر کو مرکز بنا کر قائم کر دکھائی، جو ان کی آمد سے قبل مکمل جمود کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کم بالو، تبریز، قسطنطنیہ، جو دور گزشتہ میں ایک دوسرے سے منقطع پڑے تھے۔ اب تجارتی اور سفارتی دونوں قسم کے روابط سے مربوط ہو گئے۔ اور اس طرح وہ امن عامہ جسے مغول سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ظہور میں آیا اور یہ محض جنگی قوت کی بیشی سے کہیں بڑھ کر ان کی عمدہ حکومت کا نتیجہ تھا۔ یہی صورت ''پیکس رومانا'' (امن رومہ) کے مغلوں کی آمد سے ایک ہزار سال پہلے تھی۔ (۲)

رومیوں کی آہنی حکومت قوانین کے محکم نظام پر مبنی تھی۔ مغل فرمانرواں کے پاس اول اول خانہ بدوشوں کا قانون ''یسا'' تھا جسے چنگیز خان قید الفاظ میں لایا۔ اس کے ذہن میں اپنے صحرائی خیمہ نشین (کمل کے یورتوں میں رہنے والے) امیروں کی سیادت مفتوحہ زراعت پیشہ رعایا پر مسلم تھی۔ اس کا تصور کچھ ایسا تھا کہ ان مغول امیروں کی قوت اروہائے مغل یعنی ان کے جنگ جو بہادر جو لشکروں پر مبنی ہوں۔ اور یہ سب اس کی اولاد کے بڑے لشکر ''التون ارود'' (طلائی لشکر گاہ) کے زیر اقتدار رہیں۔ ان فرمانرواؤں کو مشورہ دینے کا حق صرف آزمودہ کار سپہ سالاروں یا ''نونئیوں'' کو حاصل ہو گا۔ مگر اس عظیم فاتح نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے اخلاف تعلیم یافتہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ دو ہی پشتیں گزریں تھیں کہ اکثر چنگیزی شہزادوں نے بیرونی دولت مند شہروں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور خانہ بدوشوں کی نقل مکانی کا سلسلہ ختم کر دیا۔ یہاں تک کہا جائے اور کچھ غلط نہیں ہے کہ چنگیز خاں کے

پوتے قبلائی خان نے جب ضعیف شدہ سونگ خاندان سے ملک پوری طرح چھین لیا تو چین کو فتح کرنے سے پیشتر ہی چین اس کو فتح کر چکا تھا۔ مغلوں کے التون اردو نے مذہب میں بھی رخنہ ڈالا۔ اپنی فتوحات کے وقت یہ تاتار و مغول جاہلی مذہب رکھتے تھے۔ اور بیرونی دنیا کے مذاہب سے انہیں کوئی تعصب یا اعتنا نہ تھی، رفتہ رفتہ یوآن بادشاہوں نے بدھ مت اور ایران کے ایل خانیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حقیقت میں بابر کا زمانہ آنے تک تبت کی برفانی سطح مرتفع سے بعید دریائے والگا تک یسا کی بجائے شریعت اسلامی کا کامل عمل دخل ہو چکا تھا۔ یہاں محمد صلعم کے احکام چنگوی اقتدار پر غالب آ گئے۔

غرض اس طرح فاتح اول کے ورثا بیرونی تہذیبوں کا جزو بن کر ایک دوسرے سے منقطع ہو گئے۔ اور مغل نونینوں اور ترک ترخانوں کے صحرائی امیروں کا خاندان منتشر ہو کر جق گیرداروں، تاجروں۔ مذہبی علما اور فلاسفہ کے تہذیب یافتہ معاشرے میں گھل مل گئے۔ اب وہی زراعت پیشہ مستقل آبادیوں اور باقی ماندہ خانہ بدوشوں میں باہمی آویزش کا طبعی قانون عمل میں آیا۔ کیونکہ چنگیز نے یورپ کے دو علاقے اپنے بیٹوں کا جاگیر میں دے دیئے تھے۔ اور کم وبیش یسا کے قانون پر عامل رہے۔

ترک و مغل سیلاب نے بیرونی ممالک میں جاگیردار پولینڈ و لتھوانیہ کی سرحدوں اور روس کے شہر کیوان سے لے کر ڈین بوب کی ندیوں تک بہت کچھ تغیر پیدا کیا۔ بایں ہمہ جہاں تک ترک و مغل آباد تھے۔ ان علاقوں میں بہت کم تبدیلی ہوئی۔ یہاں والے بدستور خانہ بدوش رہے، جو تجارتی شہروں کو چھوڑ کر دوسری

بستیاں تاخت وتاراج کرتے رہتے تھے۔اوریا قبائلی گروہ حصول سیادت کے لئے آپس میں دائمی کشت وخون کرتے تھے۔

بابر کی پہاڑی وادی سے دور شمال مغرب میں دریائے یورال سے آرتیش تک وہ نیم صحرائی علاقہ تھا۔جو چنگیز خاں کے سب سے بڑے اور خودسر بیٹے جوجی کی ریاست میں دیا گیا تھا۔اس کے بیٹے باتو کے عہد میں اسی علاقے کے دوردست اردو کو یورپ والے التون اردو کے نام سے جانتے تھے۔جس کا سبب شاید وہ پرشکوہ خیمہ وخرگاہ تھے۔جو والگا کے مشرقی کنارے رواں رہتے تھے۔اسی زمانے میں انگریز شاعر چوسر نے لکھا تھا کہ۔

ارض تاتاریہ کے شہر (سرا) میں ایک بادشاہ رہتا ہے کہ روسیہ کا دردسر ہوگیا ہے۔

خانوادہ جوجی کے یہ خان دوسری خانی ریاستوں سے الگ تھلگ رہے،اور روس کی کچی بستیوں کی فصیلوں کے سوا کسی بیرونی تمدن سے بھی ان کا سابقہ نہیں پڑا۔اس تاریک نیم صحرائی سرزمین میں اسلامیت کا قدم بھی سست رہا۔پھر جب اس التون اردو کے مرکز گریز مجادلات نے ٹکڑے ٹکڑے کیےتو چند گروہ والگا کے مشرق میں ہٹ آئے اور ''قپچاق'' یعنی صحرانشین کہلائے۔جس زمانے میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کے تسخیر کیا،اسی کے قریب ان قپچاقوں کی ایک نئی اور جان دار گروہ بندی وجود میں آئی۔جو اپنے آپ کو'' ازبک'' یعنی خودسر موسوم کرتے تھے۔اس لفظ کی اصلیت کسی قدر مشکوک ہے۔لیکن ازبک تیراندازوں سواروں کا فوج درفوج خان وادہ چغتائی کے علاقوں پر پل پڑنا ایک تاریخی واقعہ ہے۔

چغتائی یا ''چغتے''چنگیز خان کا دوسرا بیٹا تھا۔وسط ایشیا کا قلب جو سطح مرتفع تبت کے اوپر واقع ہے۔اس کی وسیع جاگیر تھا۔اس میں صحرا اور نیم صحرا شامل ہیں۔ جو بلند ہوتے ہوئے ایشیا کی ریڑھ تک چلے گئے ہیں۔ جہاں تھیان شان کا سلسلہ ابر آلود پامیر پر کوہستان ہندوکش سے آملا۔ مذکورہ بالا سرزمین بھی ازبکی اوطان کی طرح عملاً بدوی ہی رہی ۔تاہم جہاں کاروانی راستے آ کر ملتے تھے۔خصوصاً نسطوری نصاریٰ یا اسلامی زیارت گاہوں کے گرد تہذیب کے جزیرے سے بنے اور برابر قائم رہے تھے۔ کاشغر،المانیق،شبالیق (پنج شہر) جیسی بستیاں اگرچہ مغلوں کی پہلی یورش میں تاریخ ہوئیں،لیکن اب چغتائی کے اخلاف وہاں آن بسے تھے۔ ایسی مستقل سکونت ان کے قانون یسا کی خلاف ورزی تھی۔چنانچہ اگرچہ وہ اپنے ذاتی خزانے فصیل بند شہروں میں محفوظ کر دیتے تھے۔خود ابھی تک اپنے قبائل کے ساتھ جاڑے ندیوں کے نارے مرغزاروں میں اور گرمیاں پہاڑوں پر چراگاہوں میں گزارتے چلے جاتے تھے۔ان چغتائی خوانین کی جماعت انگھڑ قسم کی شان امارت رکھتی تھی۔اور تخت حکومت کی بجائے وہ زیادہ تر گھوڑے کی زین پر بیٹھ کر فرماں روائی کرتے تھے۔جہل کے اندھیرے میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ان کی اپنی کوئی کتاب نہ تھی۔ وہ بیرونی جنگ وجدال میں بھی الجھتے رہتے تھے۔ پہاڑوں کی پشت کے مشرق میں ان کا بڑا شہر کاشغر تھا۔ جواب چین کے دائرہ اثر میں ہے۔وہاں اس علاقے کو مغولستان یعنی ارض مغول کہتے تھے اور چینیوں کی نظر میں مغول اور راہزن میں کوئی فرق نہ تھا۔

کوہستانی حد فاصل کے مغرب کے خوانین دعویٰ دار تھے۔ کہ چغتائی کے اصل وارث وہی ہیں۔ ان کا خاص گڑھ تاشقند یعنی پتھر کا شہر فصیل بند تھا۔ یہ ان وسیع گیاہ زاروں میں واقع تھا۔ جن کے درمیان سے چین کی بڑی شمالی شاہراہ گزرتی تھی۔ تجارتی راستے اسی راستے سے چین جاتے اور وہاں کا ریشم ادھر لاتے تھے۔ ان خوانین کو بت پرست کرغز اور جنگلی قزاق قبائل سے اپنی چراگاہوں کی حفاظت کرنا ہی دشواری سے خالی نہ تھا۔ کہ اب وہ خاص طرح ازبکوں کے راستے میں آگے جو جنوب کی طرف ڈھل رہے تھے۔ بابر کا سخت کوش نانا خاندان چغتائی کی اسی شاخ میں تھا۔ اور ہر چند شہر تاشقند پر اسی کی حکومت تھی، جب اسے بابر کا اصلی نام بتایا گیا تو وہ اسے بلا دقت ادا نہ کر سکا۔

واضع رہے کہ چغتائیوں کے خطے کا یہ جنوب مغربی قطعہ دوسرے اقطاع سے اتنا مختلف تھا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ سرسبز پہاڑی وادیاں اسی علاقے سے نیچے ہوتے ہوتے وسیع میدان سے مل جاتی تھیں، جو بحر ارال تک جانے والے دو بڑے دریاؤں کے درمیان واقع ہے۔ اسی میدان میں اور گویا خانہ بدوشی کے سمندر میں تہذیب اور ثقافت کے دو جزیرے آگئے تھے۔ ایک بخارا جو اسلامی درس گاہوں اور مزاروں کے باعث مشہور تھا۔ اور دوسرا سمرقند جہاں عالی شان محلات اور تجارت کی گرم بازاری تھا۔ ان شہروں کے گرد زراعت پیشہ آبادی دریائی آب پاشی کے سہارے زندگی بسر کرتی تھی۔ آمو اور سیر (جیحوں، سیحوں) کے اس دوآبے میں وادیوں کے پورے سلسلے پر شریعت اسلام کا نفاذ ہو گیا تھا۔ اور قانون ایسا ایسا قریب

قریب معدوم ہو چکا تھا۔ یہی سر زمین تھی جہاں مغلوں کے درمیان تنہا درخشندہ ترک تیمور لنگ کا چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ظہور ہوا۔ تیمور نے سمرقند ہی کو اپنا محکم حصار بنایا۔ اور اپنے ترک تازیوں کے غنائم سے اسے مالا مال کیا۔ یہ "دلنگڑا فولاد" اسلام کا جھنڈا لے کر اٹھا اور خانہ بدوشوں پر ایسے تابڑ توڑ حملے کیے کہ باتو کے اردو کا رہا سہا جتھا پراگندہ ہو گیا۔ اور مغلستان کے چغتائی خوانین کا شیرازہ بکھر گیا۔ تیمور نے اپنے آخری سینین میں سمرقند کا چار چاند لگا دیے۔ شمالی ہندوستان کو تاخت و تاراج کیا، عثمانی سلاطین کی فتح مند فوجوں کو پامال کر ڈالا۔ اور اقصائے یورپ تک میں "تمرلین" نام کی ہیبت پھیلا دی۔ 1405ء میں وہ چین پر لشکر لے کر چلا تھا۔ جہاں منگ خاندان کے عروج کے سامنے یوان خاندان کا چراغ جھلملا نے لگا تھا، جب کہ قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا تھا۔

پائے تخت سمرقند ہونے کے باوجود تیمور کی چند روز سلطنت اپنے مغرب کی سطح مرتفع ایران کی تہذیب کے زیر اثر قائم ہوئی تھی۔ سمرقند کے باغوں کے محلات میں چوکے تک ایرانی معماروں نے لگائے تھے۔ اور ایرانی اہل قلم نے ہی اس بزرگ فاتح کے نام کو بقائے دوام بخشی تھی۔ جو اپنے لئے صرف امیر یعنی صاحب امر کا لقب پسند کرتا تھا۔ تیمور چنگیز کی اولاد میں نہ تھا، اگرچہ مقبرے کے کتبے پر چنگیز کا نام بھی تیمور کی ازدیاد شہرت کے لئے کندہ کر دیا گیا ہے۔

محاربات تیموری کے بعد نہضت تیموریہ کی وہ ایک صدی آئی جو وسط ایشیا کی تاریخ فنون میں سب سے درخشاں دور ہے۔ ایک بیٹے کے ماتحت سمرقند میں اور

ایک پوتے کے وقت ہرات ملک خراسان میں یہ چمک دمک قائم رہی۔ارباب صنعت اسی سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ جیسے یورپ کے شہر فلورنس میں، پھر چالیس برس مخدوش امن کے گزرے، جس میں آل تیمور نے اپنے مرکز اقتدار کو بچائے رکھا۔ 1465ء تک ہم تیموری فرماں روا ابوسعید (3) کو دامن قاف سے مشرقی پہاڑوں کے پار کاشغر تک بادشاہی کا دعویٰ کرتے دیکھتے ہیں۔حالانکہ اب ازبک خانوادہ جوجی کے وارث بن کر بھتنوں کی طرح کنج خمول سے دوبارہ یسا کا وہی قانون لیے ہوئے نمودار ہو گئے تھے۔جسے روشن خیال تیموریوں نے کب کا ترک کر دیا تھا۔

1465ء کے بعد تیموریہ دعویٰ داروں کی باہمی جنگ وجدال سے پارہ پارہ ہونے لگی۔

پائے تخت سمرقند کے وارث کو یہی غنیمت نظر آتا تھا۔ کہ جس طرح بنے اپنے بھائیوں سے فی الوقت صلح صفائی رکھے۔ان میں ایک بھائی تو جنوب مغرب میں ہرات پر قابض تھا۔ جہاں صنعت وفن ترقی پر تھے۔ دوسرا جنوب مشرق کی بلند سر زمین پر جہاں سے جیحون سیحون نکلتے ہیں۔ ہندوکش تک فرمانروائی کرتا تھا۔اور جنوب میں تیسرے بھائی نے ہندوکش کے پار افغانی علاقے میں کابل دبا لیا تھا۔ سب سے مجہول چوتھے بھائی کو سمجھیے کہ جو انتہائے مشرق میں فرغانہ پر قابض رہا۔ یہ بابر کا باپ تھا۔

ان دور دست پہاڑوں میں بابر کا پیدا ہونا تقدیر کی بے مہری تھی۔ کہ ایک طرف

تو برف پوش اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے۔اور دوسری طرف سے تاشقند سے جو چغتائی کے وارثوں کا مسکن تھا۔فرغانہ پہنچ جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ بالفاظ دیگر یہ آبادی حقیقت میں آباد اور ابھی تک نہایت بارونق شہر سمرقند اور دوسری جانب صحرا نوردخانہ بدوشوں کے درمیان حد فاصل تھی ۔اس کے ایک طرف کاشتکار اور دوسری طرف شکاری، ادھر صاحبان علم وفن اور ادھر وحشیوں کا دور دورہ تھا۔ بعید فرغانہ کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ تھا۔اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کوئی سرگزشت صفحہ تاریخ پر باقی نہ رہے گی۔ بایں ہمہ بابر نے قلم سے کام لیا۔اپنی گمنام سی مادری زبان چغتائی ترکی میں فرغانہ اور خود اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ اس عہد خاموشی میں اس نے اپنی آواز لوگوں کے کان تک پہنچا دی۔ چنانچہ آج بھی کہ اس تحریر کو لکھے ہوئے پانچ سو برس کے قریب گزر چکے ہیں۔وہ داستان ہمیں کچھ یوں سنائی دیتی ہے۔کہ گویا کہنے والا رات ہوتے پڑاو پر پہنچا ہے۔دن بھر دشمن کے تعاقب میں اور یا زیادہ تر یہ کہ دشمن اسی کے تعاقب میں تھا۔گھوڑے سے اتر کر ڈیرے میں آگ کے پاس بیٹھا اپنی روئیداد سنا رہا تھا۔اسی روزینہ روداد میں ہم کو اس عہد کی تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ جو یورپ والوں کے ''زرنگار'' مشرق پر قبضہ جمانے سے پہلے یہاں کی کیفیت تھی۔

بابر کا زمانہ وہ تھا جب کہ یورپ میں ایک دھندلے جزیرے انگلستان میں وہاں کا ایک امیر کم سن وارث تاج ایڈورڈ کی بجائے رچرڈ ثالث کے لقب سے خود بادشاہ بن جانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ادھر طوفانی رودبار کے پارہ دہ سالہ

سیارد(bayard.) شمشیر زنی سیکھ رہا تھا اگر چہ بہادر شہسوار بننے سے بڑھ کر اس کا مطمع نظر فرانس کے بادشاہی پرچم کو اونچا رکھنا ہے۔ آگے مشرق میں سوزنرالا راہب سامعین کے روز افزوں مجمع کو عقبیٰ کے خطرات سے اور قہر الٰہی سے جسے وہ بھولے ہوئے تھے، ڈرا رہا تھا۔ براعظم یورپ کی مشرقی سرحد ان دنوں تیوتانی سرداروں کے قلعوں سے بہ مشکل آگے جاتی تھی اور یہ سردار ابھی اپنے جذبہ جہاد کو بالٹک تاریک ساحلوں کے بت پرستوں کو ہلاک کرنے تک ہی محدود رکھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ پرتگال کے بادبانی جہاز افریکہ کے مغربی سواحل پر ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ مشرق کے افسانوی ملک کا جہاں پر پرسٹر کی کبھی حکومت تھی، راستہ مل جائے۔ ایک ہٹیلے ملاح نے جو اس بحری گشت میں ان کے ساتھ رہا لزبن میں یہ حجت بھی کی کہ ادھر پھرنے کی بجائے سیدھے مغرب میں سمندر کو پار کریں تو ایشیا میں جانکلیں گے لیکن اس ملاح کرسٹوفر کولمبس کی درخواست کو اسے ''اوشن سی'' کا ناخدا بنا کے چند چھوٹے جہاز دیئے جائیں، اس وقت منظور نہیں کی گئی تھی۔

باب اول :: وادی کی روداد

بابر 1483ء کے وسط سرما میں پیدا ہوا جب کہ برف پہاڑوں سے پھسل پھسل کر شاہ دانہ کے باغوں تک پہنچ جاتی ہے۔ان دنوں وادی محصور تھی کیونکہ برف نے آمدورفت کے درے بند کر دیے تھے سوائے اس راستے کے جو دریا کے کنارے سمرقند جاتا تھا۔بابر پہلا بیٹا تھا لہذا اس کی ولادت پر محل سرا میں بہت خوشیمنائی گئی۔شکستہ حال قلعے کے دریچوں سے عورتوں نے قالین باہر لٹکائے۔بابر کی بہن پانچ برس کی تھی، یعنی اتنی بڑی کہ ننھے بھائی کی دیکھ بھال کرنے کا شوق رکھتی تھی۔

ملک کے گوشے گوشے سے قبائلی سردار اوران بستیوں کے والی جو عمر شیخ مرزا کی مطیع تھیں گھوڑوں پر سوار جوق در جوق ولادت با سعادت پر باپ کو مبارک باد دینے اور خوب دعوتیں کھاتے ئے۔کیونکہ عمر شیخ عقل و تدبیر سے نہ ہی فیاضی کی صفت سے متصف تھا اور قریبی زمانے میں اس کے معاملات کچھ بے طور سے رہے تھے لہذا اس موقع پر مہمانوں کے ساتھ جو بھی ہم پیالہ ہوئے ،اس نے آب ممنوعہ پیا ،نجومی کو بلوا کر بچے کے طالع سعد کا زائچہ کھنچوایا اور نشے میں سرشار ہوا تو مسنون قرآن کی بجائے شاہ نامے کی پیش گوئیاں پڑھنے لگا۔(4)عمر شیخ کے بلند عزائم تو کبھی خیال کی منزل سے آگے نہیں بڑھے البتہ اس کے شوق کا مشغلہ کبوتر پالنا تھا ۔وہ پیام بر کبوتروں کا عاشق تھا اور کبوتروں کو بڑی محنت اور صبر سے ہوا میں پلٹیاں کھانی سکھایا کرتا تھا۔اس پاس باز وغیرہ اڑانے کی اجازت نہ تھی۔تاہم بابر کی

ولادت نے اب اسے بچے کی طرف زیادہ متوجہ کرلیا۔

سن رشد کو پہنچنے کے بعد بابر سمجھ گیا تھا۔ کہ ظاہری آؤ بھگت کی تہہ میں اس کے باپ کا نکما پن مخفی تھا۔ (اپنی تزک میں لکھتا ہے)

''عمر شیخ میرزا کی فیاضیاں وسیع تھیں، اسی طرح اس کا دل وسیع'' تھا، بڑے ہی شان دار منصوبے اور بڑی بڑی امیدیں باندھتا تھا۔ اور ہمہ وقت کشور کشائی کی تجویزیں سوچا کرتا تھا۔ اگر چہ جب کبھی فتح کرنے نکلا، شکست کھا کر مایوس وملول واپس آیا۔ وہ سلطان ابوسعید میرزا کا جس نے آخری مرتبہ امیر تیمور کی سلطنت کے جملہ اقطاع کو مجتمع رکھا۔ چوتھا فرزند تھا۔ کسی قدر پستہ قامت تراشیدہ نکیلی داڑھی ہرخی مائل بال اور بڑے تن وتوش کا آدمی تھا۔ اتنا تنگ جامہ پہنتا کہ پیٹ دبا کر بند باندھے جاتے، اور بدن ڈھیلا چھوڑتا تو اکثر ٹوٹ جاتے۔ اپنی غذا یا لباس کے بارے میں اسے کوئی خاص لحاظ نہ تھا۔ ڈھیلی دستار کے دونوں سرے پڑے لٹکتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں مغلی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا۔

وہ اپنے عقائد میں پکا تھا، پنج وقتہ نماز ادا کرتا اور اکثر قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ اگر چہ شاہ نامہ پڑھنے کا اسے بہت شوق تھا، مزاج کا نرم لیکن اچھا بہادر آدمی تھا۔ قادر انداز بھی برا نہ تھا۔ مگر اس کے مکے میں غضب کی قوت تھی۔ جس کے بھی مارے وہ گرے بغیر نہ رہتا تھا۔۔۔۔ آگے چل کر وہ دو ایک بار بزم ناؤنوش میں شریک ہونے لگا تھا۔ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا، اکثر چوسر کبھی کبھی پانسوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔

برخلاف اس کے بابر کی ماں امور خانہ داری میں مصروف رہتی، اور محل کا جس کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ تھا، انتظام کرتی تھی۔ یہاں اسے مغل ہی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ کیونکہ اس کا باپ جس نے عمر شیخ سے عقد کیا تھا۔ تاشقند کا مغل حاکم یونس خاں تھا۔ (وادی فرغانہ میں منگول کا تلفظ مغل کیا جاتا تھا۔) وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھی، شعراء کے کلام سے لطف اندوز ہوسکتی تھی۔ لیکن ان تفریحات کی اسے فرصت کہاں تھی۔ بچوں کے دیکھ بھال کے علاوہ اسے مختصر دربار کی آن بان قائم رکھنا پڑتی تھی، جو تاشقند کے دربار سے جہاں وہ پلی بڑھی تھی، بہت ادنیٰ تھا۔ مگر فربہ اندام من کے موجی امیر کی، جسے کبوتر بازی، مے نوشی اور کشور کشائی کے لا طائل منصوبوں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ صدر بیگم ہونے کے باعث یہ سب کام کرنے پڑتے تھے۔

بچے کی ولادت کی تقریب میں آنے کے لئے اس بیگم کے ماں باپ کو پورا ایک سال لگا، کیونکہ وہاں چغتائی مغلوں کے خاندان یونس خان کا ساتھ چھوڑے جا رہے تھے۔ اصل میں ان مغلوں کو اپنا پرانا طرز زندگی چھوڑنا کہ ادھر سے ادھر گلے لئے پھرتے ہیں، اور چھاپے مار کر دولت لوٹتے تھے، گوارا نہ تھا۔ ادھر یونس خان جما ہوا تھا کہ نئے اصول معاشرت کو ہاتھ سے نہ دے گا۔ کم سے کم تاشقند کی فصیلوں کے اندر جہاں وہ اپنے جنگ جو رفیقوں پر آئین و مذہب و تجارت چلا سکتا۔ اور خود سیب کے باغوں میں آرام سے بیٹھ کر حافظ کے لطیف کلام کا اتباع کر سکتا تھا۔ اسے عیاریاں کرنی آتی تھیں، چنانچہ اس موقع پر بھی اس نے ایک نئی جنگ چھیڑ دی اور شوریدہ سر قبیلوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ یونس خان

نے زمانے کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے تھے۔ کئی بار زندانوں سے نکل کر محلات پہنچتا تھا۔ یہاں تک کہ مرحوم ابوسعید میرزا نے اسے جلاوطنی میں ایران کے عشرت کدوں سے اسے واپس بلایا تھا۔ اور چغتائیوں کی رہی سہی مملکت پر چنگیز کے وارث صحیح کی حیثیت سے حکومت کرنے کی دعوت دی۔

بہر حال اب جو یونس خان نواسے کو تحفہ تحائف دینے وادی فرغانہ آیا تو پوری شان وشوکت سے قبائل کی فوج لے کر آیا، جن کے ساتھ نفریاں کان اڑائے دیتی تھیں۔ اور گھوڑوں پر پڑے ہوئے دف کی تال پڑ رہی تھی۔ ادھر سے عمر شیخ مرزا باں تن وتوش عاجلانہ چلا کہ ایک منزل آگے بڑھ کر خان کا استقبال کرے اور آداب خوردانہ بجالائے۔ اس کے ساتھ دل میں یہ تشویش بھی ہوگی کہ یہ بزرگ مغل واقعی کچھ اعانت کرے گا یا دامادکی کچھ اور زمین ہتھیا لے گا۔ کیونکہ، مدت بعد بابر بیان کرتا ہے کہ بارہا میرے باپ نے مشکل کے وقت میرے خسر کو مدد دینے کے لئے بلایا، مگر ہر مرتبہ اپنے ملک ہی کا کوئی حصہ اس کے حوالے کر دیا۔ حتیٰ کہ خود تاشقند شہر بھی جو اصل میں میرے باپ کی ملکیت تھا۔ یونس خان کو دے دیا۔

مگر اس آمد کے وقت یونس خان بزرگ خان دان بن کر آیا، اور لطف وعنایت پر مائل تھا۔ یہ بابر کے عقیقہ کی تقریب تھی، جس میں وہ شریک ہوا۔ اور چونکہ بچے کے نام ظہیر الدین،،، محمد کو ادا نہ کر سکتا تھا۔ لہذا اس بوڑھے نے لاشعوری طور پر اسے بابر کے لفظ سے یاد کیا۔ پھر یہی عرف چلا گیا۔

مولود کی نانی ایسان بھی بچے کو دیکھ کر فریفتہ ہوگئی، وہ بے نقاب صرف سفید براق

رومال سر پر ڈالے سواری کا گہرے رنگ کا پوستین پہنے ہوئے تھی۔اس کی آمد پر قلعے کی تمام عورتیں خاموش ہو کر آداب بجالائیں۔ایسان (6) کے شریفانہ اوصاف کا قصہ سن کر یونس خاں نے 41 برس کی عمر میں اسے ایک صحرائی قبیلے سے اپنے عقد میں لیا تھا۔اور اب تیس سال سے یہی بیوی اس کے دکھ درد میں شریک اور اس کے روز افزوں مرض فالج میں اس کی تیماردار تھی۔ایک مرتبہ جب یونس خاں کو غلے کی تلاش میں مغلستان کے باہر اپنے رشتہ داروں کے پاس جانا پڑا تو اس کے ایک جانی دشمن نے چھاپہ مار کر ایسان کو گرفتار کر لیا۔اور اپنے کسی ساتھی کو دے دیا۔ایسان نے اپنے نئے مالک کا خیر مقدم کیا،اور کپڑے اتارنے میں مدد دیتے وقت اسے قتل کر ڈالا۔ اور پھر اپنے گرفتار کرنے والے خان کو اطلاع کرائی اور کہلا بھیجا کہ تم مجھے جان سے مار سکتے ہو،لیکن یونس خاں کے سوا اور کسی کے حوالے نہیں کر سکتے۔چنانچہ اعزاز کے ساتھ وہ اپنے شوہر کے پاس واپس بھیج دی گئی۔ایسان کی تعلیم صرف زمانے کا گرم وسرد تجربہ تھا۔صحرانوردوں کی طرح خطرے کا تاڑ جانے اور اس سے بچ نکلنے کا ہنر جانتی تھی۔اس کی چوکسی آئندہ بابر کے بہت کام آئی۔

بابر، جواب اسی نام سے پکارا جانے لگا تھا۔پہلی دفعہ وادی سے بارہ سمر قند گیا تو اس سے ایک سال پہلے یونس خان اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔وہ اگر چہ ابھی پانچ سال کا بچہ تھا،لیکن پھر بھی شان دار باغوں کے محلات،سورج میں مقبروں کی لاجوردی چمک دمک دیکھ کر تعجب کرنے کی اس میں سمجھ تھی۔اپنے افسانوی جد امجد کا عظیم مقبرہ ''گور امیر'' دیکھ کر شاید اتنا حیران نہیں ہوا،جتنا کہ ایک چینی پگوڈا میں ہاتھی دانت کے جانور

دیکھ کر یا، گونجتی مسجد میں آواز کا جواب سن کر، جس کا پکارنے والا نظر نہ آتا تھا۔ ایک اور باغ دل کشا نام کی بارہ دری میں تیمور کی فتح ہند کی تصویریں منقوش تھیں۔ اور یہ دیکھ کر کہ اس کی وادی جیسے شہسوار عجیب قسم کے جنگلی ہاتھیوں کو مار کر بھگا رہے ہیں، ضرور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں گی۔ مگر ہمارے شیر کو لوگوں نے اس کی دلہن دکھائی تو وہ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ یہ اسی کی ہم عمر شہزادی عائشہ تھی جو منگنی کی رسم ادا کرنے کے لئے گھونگھٹ ڈالے لائی گئی، اور رسم ادا ہوتے ہی الٹے پاؤں بھاگ گئی۔ بابر نے اسے خودرائے لونڈیا سمجھا، اور آئندہ بھی کچھ ایسا ہی سمجھتا رہا۔

لیکن ایک اور تماشا جس نے شاید اس کے دل پر بہت پائے دار نقش چھوڑا'' یہ ہوا کہ اس کے چچا سلطان احمد مرزا نے ایک اور شادی انہی دنوں رچائی۔ یہ چچا اس وقت سمرقند کا مالک تھا اور اپنے بھائیوں میں صلح صفائی کی کوشش کے ساتھ درپردہ انہیں بے وقعت کرنے کی فکر میں تھا۔ اس پوری عمر کی شادی میں اس نے ننھے بابر کو بلا کر کہا کہ دلہن کا گھونگھٹ منہ سے ہٹا دے۔ جس وقت وہ تعمیل حکم کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے حاضرین امرا کے قہقہے کی آواز سنی جو گویا اس کی تضحیک کر رہے تھے۔ (۷)

بابر اب اپنے آس پاس کی عورتوں کے جذبات سمجھنے لگا تھا۔ عائشہ اسے ناپسند کرتی تھی۔ بہن خانزادہ وجواب بڑی عورت کے سے زیورات کی خواہش مند ہو چلی تھی۔ اس کی طرف دار چاہنے والی تھی۔ ماں خیر خواہی سے ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی۔ نانی کی ہر وقت دیکھ بھال رہتی تھی۔ ان باتوں نے بابر پر بہت اثر کیا۔ اگلے سال اسے زنان خانے سے باہر بھیج دیا گیا کہ اپنے باپ کے ساتھ رہا کرے۔

یونس خاں کے مرنے سے بابر اور اس کا باپ اپنے ایک حمائتی سے محروم ہو گئے ۔وہ انہیں نوچتا کھسوٹتا رہتا تھا مگر کنبے بھر ان کا سچا حلیف اور محافظ بھی تھا۔ورنہ تینوں بڑے سگے بھائی عمر شیخ میرزا ، کا ملک نکال لینے کی خواہش میں متحد تھے اور سمرقند میں پچھلے دنوں ملاپ کا جو سوانگ رچایا گیا۔اس کے بعد صرف آپس کی بدگمانیوں نے ان بھائیوں کو فوراً ایسا اقدام کرنے سے باز رکھا تھا۔ان کی طمع کا سبب یہ تھا کہ گو موٹے بھائی کے ہاتھ میں روپیہ نہ تھا اور اسی لئے کوئی مضبوط فوجی جمعیت بھی اس کے پاس نہ تھی ۔تاہم اس کی وادی خوب آباد اور سرسبز تھی ۔بابر جب اس قابل ہوا کہ گھوڑے پر چڑھ کر باپ کے ساتھ دورے کرے تو اس کی سب سے پہلی محبوب شے یہی وادی فرغانہ بنی ۔

کابک ٹوٹتی ہے

ایک مدت بعد بابر کیفیت لکھتا ہے ۔''سرزمین فرغانہ آباد (ممتدن) دنیا کے سرے پر واقع ہے۔اس کے مشرق میں کاشغر ،مغرب میں سمرقند اور جنوب کی طرف بدخشاں کے بلند اقطاع ہیں ۔شمال میں جیسا کہ تاریخ بتلاتی ہے ۔سابق میں المالیق اور الما اتا (سیبوں کا باپ) جیسے شہر آباد تھے لیکن جب سے ازبکوں کے قدم آئے وہ قریب قریب سب اب ویران ہو گئے ہیں ۔

خود فرغانہ کا رقبہ زیادہ نہیں ہے لیکن یہاں غلہ اور پھل افراط سے ہوتے ہیں ۔ اس کے ہر طرف پہاڑیاں کھڑی ہیں ۔سوائے مغرب کے جو سمرقند اور مجند کی سمت

ہے ادھر پہاڑیوں اٹھی ہوئی نہیں ہیں۔اوراسی طرف سے دور دور کے دشمن فرغانہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔اس علاقے میں ریتیلا سیر (سیحون) بہتا اور خجند سے گزر کر شمال کا رخ کرتا ہے۔پھر وہ ترک قبائل کی میدانی زمینوں میں پہنچتا ہے اور راستے میں کوئی معاون ندی نہ ملنے کی وجہ سے آخر ریگستان میں جذب ہو جاتا ہے۔"

ان شمالی گیا ہستانوں پر پہلے یونس خاں کا پہرا رہتا تھا۔نوعمر بابر کی نظر میں اب وہ مخدوش زمین بن گئے تھے۔جس کے پار وحشی جتھے ایسے نظر آتے تھے جیسے میدانوں سے افق پر کالی گھٹا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔یہاں پہاڑوں کی فصیل بھی کوئی مضبوط حائل نہ تھی کیونکہ ندیوں کی گزرگاہوں کے ساتھ ساتھ سواروں کا انہیں طے کر جانا کچھ مشکل نہ تھا۔یہ ندیاں برف کے پانی سے جاری رہتیں اور نیچے کی مزروعہ اراضی تک پہنچنے میں پہاڑیاں کاٹ کے راستے تیار کر دیتی تھیں۔فی الواقع اسی قسم کے راستوں سے تجارتی قافلے منزل بہ منزل آتے اور خطا (چین) کا مال سمر قند کی منڈیوں میں لاتے تھے۔کبھی کبھی کوئی ایسا قافلہ بابر کے شہر کے قریب مرغزار میں پڑاؤ لگاتا تھا کہ برفستان طے کرنے کی تکان دور کرے اور ایال دار یاک اور ٹٹوؤں سے سامان اتار کر گھوڑوں پر منتقل کرے جو سمر قند کے آگے ،سرخ ریگستانوں سے گزرنے کے لئے دوبارہ اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔زیادہ بلندی والے درے جاڑوں میں عموماً مسدود ہو جاتے تھے۔ایک دفعہ ان بلندیوں کو طے کرنیوالے ایک قافلے کو برف نے آ دبایا اور صرف دو آدمی زندہ بچ کر نشیبی وادی تک پہنچ سکے۔جو نہی میرے باپ نے یہ خبر سنی ،دار وغہ روانہ کئے کہ قافلے کے ہلاک ہونے والوں کا

مال اسباب تحویل میں لے لیں اور اگر چہ اس وقت اپنے جملہ مداخل وہ ٹھکانے لگا چکا تھا اور روپے کا ضرورت مند تھا۔ مگر اس نے یہ تمام سامان مقفل کرا کے وارثوں کے واسطے محفوظ کر دیا۔ انہیں اطلاعیں بھیجیں تا آنکہ ایک دو سال میں سمرقند اور خراسان سے مال کے وارث آئے اور اس نے بجنسہ سارا مال اسباب ان کے حوالے کر دیا۔ وہ ایسا متدین آدمی تھا۔''

عمر شیخ میرزا دوسروں کے حق میں فیاض مگر خود اپنے لئے نفع رساں نہ تھا وہ اپنے شہر اندجان میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا کرتا تھا مگر اتنا نہ ہوا کہ اسکی مورچہ بندی بھی کرالیتا۔

تھوڑی ہی مدت میں بابر نے پتا چلا لیا کہ اس وادی دو مختلف علاقوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو ندیوں کے کنارے کے نشیبی دیہات، دوسرے غیر آباد پہاڑیوں، اس کے شہر کے ندی سے تو نہریں بستی میں آتی تھیں۔ وہ بہت دن اسی حیرت میں رہا کہ یہ گھروں میں پہنچ کر کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کا تجسس اسے اوپر پہاڑیوں پر لے گیا جہاں نرسل کے جھنڈ اور وہ تنگ گھاٹی تھی جسے جست گوسفند'' کہتے تھے اور پھر اوپر برفانی چوٹی کے کوہ برا کا دیدبانی مقام تھا۔ نیچے کی سطح ہری بھری چراگاہ میں مویشی کے گلے چرتے پھرتے اور دور دور گاؤں نظر آتے تھے۔ خود پہاڑی کے آس پاس بھی گرمیوں کی چرائی کے لئے اونچے قطعات کا سلسلہ تھا جہاں کہیں کہیں قبائلی لوگ چری چھول داریوں میں جو تیز ہوا سے بچاتی تھیں، زمین پر بیٹھے ہوتے۔ اردگرد چند بھیڑیں اور کالی بکریاں ہوتی تھیں۔ پہاڑی لوگ نو عمر شہزادے کی بادام

اور موٹے تیتر کے گوشت سے تواضع کرتے تھے۔ بابر اندازہ بتاتا ہے کہ ایک تیتر کا شوربہ چار آدمیوں کے لئے کفایت کرسکتا تھا۔ اس قسم کے گشت میں خود اس کے ساتھ کوئی مسلح سپاہی یا سردار ضرور رہوتا تھا۔ ان کوہستانی قطعات میں اس نے قدرتی عجائبات دیکھے۔ مثلاً سنگ ساق کی ایک چوٹی کہ بالکل درگاہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک دھندلا سا استادہ پتھر اتنا چکنا کہ اس میں اپنا عکس نظر آتا تھا۔ اسے بابر نے ''سنگ آئینہ'' موسوم کیا۔ پھر پہاڑیوں میں وہ بھول بھلیاں تھیں کہ دیہات میں نہیں ہوا کرتیں۔ ان کی بٹیاں پتھر کی منڈیریوں سے پہچانی جاسکتی تھیں جن پر چل کر پناہ گزین شہری قوانین کی گرفت سے بچتا بچاتا دوسری وادی تک جا نکلے۔ ہمارے شیر نے جلد رشد وہدایت حاصل کی اور ان خفیہ راستوں کے بھید بھی سیکھ لیے، نوعمر رفیقوں کے ساتھ وہ ان ویرانوں میں سفید ہرن شکار کرتا پھرتا تھا۔

آمد بہار یا فصل کی تیاری پر عموماً بستیوں میں میلے لگتے ان تقریبات میں اکثر بڑی عمر کے لوگ بھی شراب ممنوعہ پیتے اور عمر شیخ مرزا کے ساتھ نردو قمار آ کر کھیلتے۔ وسط گرما میں گلاب اور لالہ کے پھول کھلتے۔ لڑکے شام کو بڑے بڑے کچھوؤں کی پشت پر موم بتیاں جما کر روشن کردیتے اور ان کے باغوں میں خراماں خراماں پھرنے کا تماشا دیکھتے۔ خربوزوں کی فصل تیار ہوتی تو ان دنوں گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں لوگوں کے مجمعے لگتے تھے۔ ہمارا شیر مزے کا رسیا تھا۔ انہی میلوں، کھیل تماشوں یا رسیلے پھلوں کی بنا پر ہر بستی کو یاد رکھتا تھا۔ پرانے خجند میں بڑے رس بھرے انار ہوتے تھے۔ کاروانی شاہراہ اسی کے قریب سیر دریا کو آتی تھی اور اس کی پہاڑیوں

میں اعلیٰ درجے کا فیروزہ مل سکتا تھا۔مگر وہاں سانپوں کی بھی کثرت تھی۔اور آگے مرغیناں کی خشک خوبانیاں جن میں بادام بھرے جاتے تھے۔اسے پسند تھیں۔اسی مقام کے ملہ باز پہلوان مشہور تھے۔لڑنا بھڑنا دھونس دھڑ کا انہیں خوب آتا تھا۔اسی سے یہ مثل بن گئی تھی کہ ''جو دھونسیا ہے وہ مرغیناں کا۔'' دریا کے پار کی بستی بابر کا اصل مسکن ہونا چاہیے تھی۔اس کا نام اخسی (۸) اور یہاں وادی فرغانہ کا سب سے قدیم و مستحکم قلعہ تھا۔شروع میں عمر شیخ نے یہاں اقامت کی مگر پھر اسے چھوڑ دیا۔البتہ یہاں ایک کبوتر خانہ بنا دیا تھا اسکی نگہداشت کرلیا کرتا تھا۔اس کی بستی کے مکان تو آڑ میں محفوظ تھے لیکن پہاڑی کی چوٹی پر بالا حصار ہوائے تند کی زد میں تھا (بابر لکھتا ہے) ''قلعہ بلند چٹانوں کی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔ڈھلوان ندی نالے اس کے پہلوؤں میں خندق کا کام دیتے ہیں۔قلعے کے سامنے دریا بہتا ہے۔ قلعے او ربستی کے درمیان صحرا ہیں جن میں سفید ہرن کی کچھ کمی نہیں ہے اور باز کا شکار بھی ہر طرف خوب ہوتا ہے۔صحرا کے اسی اتصال کے باعث یہاں والے کہا کرتے ہیں ''کہاں ہے صحرا] کہاں ہے شہر؟'' (۹) اخسی کے خربوزے کو عمر بھر نہیں بھولا۔واقعی وہ ایسے بامزہ ہوتے تھے کہ لوگ انہیں امیر تیمور کے خربوزے کہنے لگے تھے۔(۱۰)

مگر اس کا باپ اخسی چھوڑ کر اہل وعیال کے ساتھ وادی کے مشرقی سرے پر اندجان میں جا رہا۔وہاں بابر کو کوئی چیز دل کشی کی نظر نہ آتی تھی۔معلوم ہوتا ہے فصیل کے اندر کی بستی بہت گنجان تھی کیونکہ وہ لکھتا ہے اس کے کوچہ و بازار اس راستے کے سرے تک چڑھے چلے آئے تھے جو قلعہ کے گرد بنا ہوا تھا۔قلعہ کی خندق کا کام ایک

چھوٹی ندی انجام دیتی تھی اور اسی کی بدولت تھوڑے دن بابر کی جان سخت خطرے میں پڑ گئی تھی۔

اندجان کے میوہ باغ میں بابر استاد کے آگے دو زانو بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ جاڑوں میں ایوان کے اندر جسے بڑی انگیٹھیاں گرم کرتی تھیں۔ پڑھائی ہوتی۔ بے شبہ اس نے پڑھائی پر بہت محنت کی ہوگی کہ گیارہ سال کی عمر تک اتنا کچھ پڑھ لیا۔ کیونکہ اس کے بعد تو اسے تعلیم پانے کی فرصت ہی کہاں ملی۔ استاد اسے اور اس کے چھوٹے محلاتی بھائیوں کو حساب کے مسائل، ستاروں کے نقشے، اسلامی تعلیمات ذہن نشین کراتا اور خاندان کی کئی پشت کی تاریخ، تیمور و چغتائی تک پڑھاتا تھا۔ بابر کی فطرت میں تجسس بھرا تھا، بہت جلد اس نے حافظے میں معلومات کا ایک خزانہ جمع کر لیا۔ اس کی تیز نگاہ سے یہ بات بھی مخفی نہیں رہی کہ اخوند جو پڑھانے میں تشدد کرتا تھا، کردار میں اتنا کمزور تھا کہ قبول صورت لونڈیوں کو ساتھ سلانے پر پھسلاتا تھا۔ ایک اور استاد کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ بھی شہوت پرست فریبی، ریاکار آدمی تھا۔"

نوعمر بابر کے گرد تین زبانیں بولی جاتی تھیں۔ لہٰذا اسے دیہات کی پرانی ترکی، کوچہ و بازار کی فارسی بولی اور اہل علم کی فصیح فارسی اور عربی پر قدرت حاصل کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوئی۔ وہ ضلع جگت سن کو بہت خوش ہوتا تھا۔ اپنے آس پاس کے لوگوں کے حال سے کمال دلچسپی تھی۔ اب اپنی وادی کے باشندوں کو وہ بزرگان دین ، خواجگان کے اقوال اور شعر کے عمدہ اشعار سنانے لگا تھا۔ شاہ نامے کی مترنم ابیات میں اسے بہادر شاہ و شہریار کی فتح و شکست کے افسانے ایسے معلوم ہوتے گویا ان

وادیوں میں جو اس کی وادی سے کچھ بڑی تھیں، ابھی ابھی یہ واقعات گزرے ہیں۔ اس کا مزاج حقیقت پسند تھا۔ جو چیز عجیب اور پر اسرار معلوم ہوتی اس کی ٹوہ لگاتا تھا۔ اندجان کے قلعے میں چند کتابیں عجیب معلومات سے پر تھیں مگر بابر ابھی ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا۔ رومیؒ کا الہامی کلام ستارے بھرے آسمان کے پار کی خبریں سناتا تھا اور ان غیبی ہستیوں کی، جن کا کوئی نام نہیں۔۔۔۔۔ وہ جو کبھی کبھی کسی کو خواب میں نظر آجاتی ہیں۔ اس کا باپ نشے میں گرما کر مثنوی کو جھوم جھوم کر خوب پڑھ سکتا تھا لیکن جب اس کے معارف بیان کرنے چاہتا تو زار و قطار آنسو جاری ہو جاتے۔ وہ اپنے بیٹے کو اسی قدر بتا سکا کہ ایک قطب الاقطاب حضرت احرارؒ ایسے بزرگ ہیں (۱۱) جو اسرار حیات کی شرح کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بزرگ وہ روست شکستہ در اندجان میں کبھی نہیں آئے۔ عمر شیخ میرزا کے قلعے میں فقط آوارہ گرد نجومی البتہ آجایا کرتے تھے۔ انہیں خوب کھانے کھلائے جاتے اور وہ چند سکوں کے عوض آئندہ کی خبریں سنا دیا کرتے تھے۔

رات کو گھر والوں کی باتیں سن سن کر یہ بھی بابر کے ذہن نشین ہو گیا کہ اس کے چچا جو دور کے شہروں میں رہتے ہیں، ان کے گھروں کا حال بھی اندجان ہی جیسا ہے۔ فنون سپہ گری میں مہارت اور اعلیٰ درجے کے سامان عیش و طرب کے ذوق شوق کے باوجود ابوسعید میرزا کے چاروں بیٹے کچھ دولت و مال نہ رکھتے تھے۔ شعراء وان کی مدح میں قصیدے کہتے حضرت رومیؒ کے مرتبے کے نہ تھے کہ ان کی بات کا یقین کیا جائے۔ چاروں شہزادے مانگے کی ناموری پر بسر کرتے تھے۔ وہ شاہ خرچ،

ناعاقبت اندیش اور کچھ اسی قسم کے قسمت آزما من چلے تھے۔ جنہیں ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور لوٹ کھانے کا شوق ہوتا ہے۔

عمر شیخ میرزا نے صیغہ راز میں بیٹے کو سمرقند اور موروثی تخت، نیز میدانی علاقے کے تاشقند پر قبضہ کرنے کے منصوبے بھی سنائے۔ وہ خود اچھا تیز انداز یا شہ سوار نہ تھا مگر بیٹے کو دس برس کی عمر سے سپہ گری سکھانے پر مصر تھا۔ چنانچہ بابر کو دربار کے ماہرین جنگ کی شاگردی میں دے دیا گیا اگرچہ اس نے اپنی کتابی تعلیم ہاتھ سے نہیں دی۔ یہ جنگی تربیت آئے دن شکار کھیلنے یا کبھی کبھی ان جنگی تاختوں میں شریک رہنے سے ہوتی تھی جو اس کے باپ کے نقشے پر دریا پار کی جاتی تھیں۔ کیونکہ کوہستان کے شرفاء میں معرکہ آرائی فقط میدانوں میں یا صف بند لشکروں سے نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ کسی وقت بھی کسی مقام پر ہو سکتی تھی۔ بابر کے اتالیقوں نے بخوبی سمجھا دیا تھا کہ اسے ہمہ وقت خصوصاً جو وقت اس کے حق میں نہایت تکلیف دہ ہو۔ ایسی معرکہ آرائی متوقع سمجھنی چاہیے مثلاً سوتے میں یا سیب چننے میں۔ ایک بہادر مگر ذرا موٹی عقل کا جنگ آزما سلاخ کے عرف سے مشہور تھا۔ (۱۲) اس نے بابر کو سواری کی حالت میں ڈھیلی زرہ اور ہلکا خود پہن کر لڑنا سکھایا تھا۔ سواری کے بغیر تو آدمی کسی شمار قطار ہی نہیں رہتا۔ اس نے گھوڑے پر سے تلوار گھمانے اور دشمن کے وار سے بچنے میں ڈھال کو حرکت دینے کی مشق کرادی تھی۔ ایک چھوٹی ترکمانی کمان سے آگے یا پیچھے کے رخ بھاگتی چیز پر کس طرح نشانہ لگاتے ہیں۔ یہ ہنر بھی بابر سیکھ گیا تھا۔ استاد سلاخ عمر شیخ میرزا کی ملازمت میں آنے سے پہلے یونس خاں کا آفتابچی

رہا تھا۔ (۱۳)

بھورے بال والا سردار قاسم محل سرا کا داروغہ تھا۔ اسے دست بدست جنگ کی زیادہ فکر نہ تھی۔ اس کا قول تھا کہ گلہ بان داؤد شمشیر زن جالوت سے زیادہ عاقل تھے۔ بابر کو بھی دشمن کو تیز رفتار تیر سے پہلی ضرب لگا کر بیکار کرنے کی ترکیب سیکھنی چاہیے۔ بابر نے یہ نکتہ فراموش نہیں کیا لیکن وہ سردار قاسم بیگ کو اتنا بھروسے کے لائق نہیں سمجھتا تھا جتنا لاابالی مگر وفادار سلاخ کو۔ اصل میں اونچے رتبے کے امیر جو خود بھی طلب جاہ سے خالی نہ تھے۔ ان پر اتنا اعتماد کیا بھی نہ جا سکتا تھا۔ جتنا معمولی ملازمین پر۔ ایک اور امیر پسر یعقوب نے گھٹنے کے زور سے گھوڑا چلانے، دوڑانے کے گر سکھائے۔ اس نے کہا اگر تم پھرتی سے حرکت کرو گے تو دشمن کا آسانی سے ہدف نہیں بن سکتے۔ یہ حسن (۱۴) یعقوب بیگ اچھا دلیر، جھگڑالو آدمی تھا۔ لڑکوں کے ساتھ چوگان یا گھوڑی کا کھیل کھیلنے میں شریک ہو جاتا اور انہیں چھیڑنا، چڑاتا رہتا تھا۔ اس نے بابر کو یہ بات سنا دی تھی کہ اگر تمہارے سر پر عقاب کلاں اک سایہ نہ ہوا تو کالے کوے تمہاری ہڈیاں کھائیں گے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر نوعمر شہزادے کو محافظ او پشت پناہ نہ ملے تو سر رہ بھیک مانگنے والوں کی طرح مارا جائے گا۔ حسن یعقوب اسی طرح کے ذومعنین شعر بھی خود کہا کرتا تھا۔

قاسم بیگ کہ ناخواندہ آدمی تھا، متنبہ کرنے میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا تھا۔ 1494ء کی گرمیوں میں جب کہ فصلیں تیار، چرائی بھی اچھی تھی۔ قاسم کو خطرہ پیدا ہوا، جو اوروں کو نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے بتایا کہ بابر کے سب سے بڑے چچا سلطان

احمد اور یونس خاں کے فرزند اکبر محمود خاں میں قول وقرار ہو گئے ہیں اور یہ دونوں گھوڑے چرانے نکلے ہیں لیکن فرغانہ کے رخ بڑھ رہے ہیں اور درحقیقت یہ ان کی لشکرکشی ہے۔ادھر عمر شیخ میرزا والی فرغانہ جسے اپنے لشکر کو جمع اور ہتھیار بند کرنے کی ضرورت تھی ، فصلیں اور اپنے کبوتر دیکھنے اندجان سے چل دیا اور دارالملک ایک قاضی صاحب کے سپرد کر گیا جو نہایت مقدس مگر بالکل غیر عسکری قسم کے بزرگ تھے۔ان بزرگوار نے رنگین مزاج حسن یعقوب اور عیار طبع قاسم بیگ کی بات نہیں مانی ۔ قاضی کا خاندان سمرقند میں بھی اپنے تقویٰ طہارت کی بنا پر قابل احترام مانا جاتا تھا۔انہوں نے فرمایا اصل محافظ مشیت الٰہی ہے۔اور حکم خدا کے سوا اور کوئی قانون ماننے کے لائق نہیں ۔ اور یہ کہ آگے چل کر خود بابر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی ۔ بابر دل میں سوچنے لگا کہ خود اس کے باپ پر بھی یہ حقیقت کبھی کھل ہے یا نہیں؟ یعنی وہ اپنی ساری پاک طینتی اور دوستوں میں خوش طبعی کے باوصف ابھی تک افیون نوشی اور نرد و قمار کے ممنوعہ اشغال سے دل بہلاتا رہتا تھا۔

اب جو اپنا کبوتر دیکھنے وہ اخسی گیا ہوا تھا، گرمیوں کے صاف دن میں بابر باز شکرے اور چند یار دوستوں کے لے کر اندجان سے باہر ایک پہاڑی باغ کی طرف روانہ ہوا اپنے شکار کے ساتھ وہاں کی بارہ دری میں بیٹھ کر آرام بھی کر لیں گے (باپ کبوتروں کے قریب باز وغیرہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا تھا) یہ دوشنبہ (پیر) کا دن تھا اور باغ ہی میں ایک قاصد مارا مارا اس کے پاس پہنچا۔بابر لکھتا ہے کہ ''عجیب سانحہ پیش آیا۔ پہاڑ کی چوٹی سے اخسی کا کبوتر خانہ کبوتروں اور عمر شیخ

میرزا سمیت نیچے گرا اور اسی کے ساتھ میرزا کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔'' پھر صراحت کرتا ہے کہ ''اس مہینے بارہ برس کی عمر میں فرغانہ کا بادشاہ ہو گیا۔''

خزف ساحل کی طرح لڑھکتے پھرنا

خبر سن کر بابر نے پہلے ارادہ کیا کہ محل سرا کو جائے۔ وہ عمل فورا کرتا تھا، سوچتا بعد میں تھا۔ چنانچہ شکرا ایک نوکر کے حوالے کیا اور سوار ہو کر سرپٹ باغ سے چلا۔ ساتھی پیچھے پیچھے آتے رہے۔

شہر کے بازار میں داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے سے محل کا ایک مہتمم آیا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر خبردار کیا کہ قلعے میں نہ جاؤ ممکن ہے قید کر لئے جاؤ۔ عمر شیخ کے مرنے سے وادی فرغانہ چوپٹ پڑی رہ گئی تھی کہ کوئی بھی رئیس امیر جس کی جمعیت مضبوط ہو اور مرحوم والی کے خاندان کی وفاداری بالائے طاق رکھنا چاہیے۔ وہی اس کو اچک لے۔ اب بابر اور آنے والا سردار دونوں شہر کے پار عید گاہ (۱۵) کیطرف چل پڑے۔ جس کے باہر ٹیلوں سے جنوب کوہستان کو راستہ جاتا تھا۔ اس علاقے میں پہنچ کر بابر آزاد رہتا اور انتظار کر سکتا تھا کہ واقعات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن عید گاہ کے قریب ایک قدیم ملازم نے انہیں آلیا اور پیام دیا کہ قائم مقام قاضی نے کہا ہے کہ بابر سیدھا شاہی دیوان میں آئے۔ بابر بلا تاخیر وہاں گیا اور دیکھا کہ وہ بزرگ قاضی معدودے چند وفادار عمائد کے ساتھ یہ بحث اور ہر پہلو پر گفتگو کر رہا ہے کہ نوعمر لڑکے کے کیے کیا کیا جائے جو خود حکمرانی کے قابل نہیں ہوا ہے۔

ہندوستان کا ایک تاریخ ساز نویس لکھتا ہے کہ اس وقت بابر کی حالت ''ساحل کے خزف کی سی تھی جو ہوا سے ادھر ادھر لڑھکتا پھرتا ہو۔''

اسے ان فوجی سرداروں کی جنہیں عمر شیخ میرزا نے جاگیریں دے رکھی تھیں، مدد کا ایک سہارا نظر آتا تھا ورنہ حالات بہت ہی خراب تھے۔ لاابالی باپ نے اپنے طاقتور رشتہ داروں سے جھگڑے مول لئے تھے، اب وہ سب بابر کو متوارث ہوئے۔ ان عزیزوں میں سب سے اول تو بڑا چچا احمد تھا جو سمرقند سے بڑھا آتا تھا اور فرغانہ کے مغربی قصبات نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اب وہ اندجان پر پیش قدمی کر رہا تھا اور ادھر اس کا حلیف، یونس خاں کا بڑا بیٹا سیر دریا سے اوپر چل کے قلعہ اخسی کیطرف آ رہا تھا جہاں بابر کی ماں اور چھوٹا علاتی بھائی گھرے رہ گئے تھے۔ کچھ اور دشمن جاگیرداروں کو مشرقی پہاڑوں کے ایک درے میں چین کی کاروانی شاہراہ پر دیکھا گیا تھا۔

قاضی نے حملے روکنے کی پریشان گفتار تجویزوں کو رد کر دیا اور کہا کہ خورد سال بادشاہ کے لئے صرف ایک ہی چارہ کار ہے کہ اپنے چچا احمد، والئی سمرقند سے جس کی لڑکی بابر سے منسوب ہو چکی تھی اور حملہ آوروں میں وہی سب سے طاقتور ہونے کے ساتھ کریم النفس بھی تھا، مدد کی التجا کرے اور پھر معاملہ خدا کی مرضی پر چھوڑ دے۔ بابر نے یہ فوراً مان لی۔ کچھ عرصہ اپنے چہل سالہ چچا سلطان احمد کی چابک دستی سے یہ تصویر کھینچی ہے:

''وہ ذہن و ذکا سے خالی، سیدھا سادہ ترک تھا۔ احتیاط سے بل دے کے پگڑی

باندھتا۔ پابندی سے پنج وقتہ نماز ادا کرتا۔ حتیٰ کہ ناؤنوش کے جلسوں میں بھی جن کا سلسلہ ۲۰، ۳۰ دن تک چلتا وہ یہ فریضہ ترک نہ کرتا تھا۔ پھر وہ اتنے ہی دن تک شراب کو منہ نہ لگاتا اور اس کی جگہ تیز مسالے (۱۶) کے کھانے کھاتا تھا۔ شہر میں پلا، بڑھا مگر کوئی تعلیم نہیں پائی۔ انصاف پسند آدمی تھا اور ہر قانونی مسئلے میں اپنے پیرومرشد سے مشورہ کرتا۔ دادرسی کے وقت اخلاق اور آداب کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ زانو تک نہیں بدلتا تھا۔ البتہ ایک دفعہ جب فرش کے نیچے ہڈی نکلی، اس نے پہلو بدلا۔ بہت اچھا تیرانداز تھا کہ میدان کے پار گھوڑا دوڑاتے میں بانس پر رکھے ہوئے سبو (۱۷) پر بار بار ٹھیک نشانہ لگاتا تھا۔ آگے چل کر جب تن نوش زیادہ ہو گیا تو سلطان احمد میرزا نے گھوڑے پر شکار کھیلنا چھوڑ دیا۔ صرف شاہین اور جرے سے تیتر بٹیر شکار کراتا تھا۔ فطرتاً سادہ مزاج، کم سخن، بالکل اپنے خوانین کی رائے پر چلنے والا۔ خرچ کرنے میں جان چراتا تھا۔"

قاضی کی نصیحت کے مطابق بابر نے جلدی سے ایک سفیر سلطان احمد کی خدمت میں روانہ کیا اور فرزند اور خادم کی حیثیت سے اظہار اطاعت کے ساتھ صرف اپنے شہر پر بدستور حاکم رہنے کی درخواست کی۔ نیک دل احمد یہ پیش کش قبول کر لیتا لیکن اس کے سرداروں نے ایک لڑکے کی، جو قابو میں آ چکا تھا۔ شرطیں ماننا محض لایعنی خیال کیا۔ سفارت ناکام رہی۔ احمد کے رسالے سیدھے اندجان کی طرف چل پڑے۔

یہ شہر خوش فضا، گرد ہرے بھرے کھیت، تجارت کی گرم بازاری تھی لیکن قلعہ بند تھا۔ ندی کے کنارے اس کا بالا حصار بھی نیچا بنا ہوا تھا۔ گرد کی خندق پاٹ کر، اوپر

بازار سا بن گیا تھا۔ ادھر اکثر باشندے بھی ایک لڑکے کے لئے لڑنے مرنے کو تیار نہیں نظر آتے تھے۔ یہاں کے عام لوگ سوداگر ہوں،، اہل حرفہ یا کسان عموماً تاجیک قدیم سے اسی سرزمین پر بسے ہوئے تھے اور صدیوں سے پہاڑ پار کے جو مغل، ترک تتار حملہ آور ہوتے اور حکومت جماتے رہے ان کی باہمی جنگوں میں حصہ نہ لیتے تھے۔ امیر امرا مسلح عسکری جو بابر کی رفاقت میں جمع ہوئے (حسن یعقوب بھی ان میں تھا) وہ حصار کی فصیل کے رخنے بند کرنے اور شہر کی منڈی سے اجناس خوردنی فراہم کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اس عرصہ میں سلاخ نے عمائد کو ترغیب دی کہ اپنے چھوٹے سے بادشاہ کو لے کر چلیں اور کم سے کم دیکھیں تو سہی کہ دشمن کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مختصر جمعیت نکل کر چلی۔ قاضی صاحب نے دعا دی ''خدا اس کا انجام بخیر کرے۔''

شام تک یہ جماعت ایک دھنسی ہوئی ندی کے کنارے پہنچی اور دوسرے کنارے پر سلطان احمد کے رسالوں کا کالا کالا دل بادل معائنہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ گذرا اس نے بابر پر بہت گہرا اثر کیا۔

سمرقندی سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آرہے تھے، انہوں نے جو اندجان والوں کو دوسرے کنارے پر دیکھا تو ایک دم ندی کی طرف دوڑے۔ گدلے پانی کی اس دھار پر پتلا سا پل تھا اور دونوں کناروں پر دلدل تھی۔ اب جو ریلے پر ریلا پل پر آیا تو گھوڑے کیچڑ پانی میں گرے اور اونٹوں نے بھاگنا، بے حواسی میں دولتیاں جھاڑنی شروع کیں۔ رات کا اندھیرا ہونے تک کوئی سردار یا سالار اس طوفان بے

تمیزی کو قابو میں نہ لا سکا۔ رات آنے پر سمرقندی سپاہ نے اپنے مضروب ساتھیوں کو سنبھالا اور واپس چل دی۔ اور پھر دوسرے دن بھی نظر نہیں آئی۔ تجربہ کار سرداروں نے بابر کو بتایا کہ سمرقند کی ایک فوج پہلے بھی اس پل پر مصیبت اٹھا چکی ہے۔ وہمی لوگوں کو اب یہ خوف ہوا کہ یہاں جو لوگ پہلے مرے تھے انکی روحیں لڑنے آ گئی ہیں۔ مشیروں نے احمد کو رائے دی کہ وہ خود اور بہت سے سپاہی علیل ہو گئے ہیں واپس چلنا چاہیے اور نیک مزاج بادشاہ نے پھر ان کا مشورہ قبول کر لیا۔

مگر اثر پذیر حساس بابر نے یہی اعتقاد کیا کہ دشمن سے پہلے مقابلے میں خدائے تعالیٰ نے میری مدد کی۔

ادھر پل کی اس عجیب و غریب شکست نے اخسی کی قسمت پر بھی اثر کیا کہ یہاں جو اندجان کے خلاف سابقہ دارالحکومت ہونے کی وجہ سے بلند پہاڑی پر مستحکم قلعہ بنا ہوا تھا، اس میں عمر شیخ میرزا کے سرداروں نے ڈٹ کر یونس خاں کے بیٹے کا مقابلہ کیا۔ پھر جب اس نے سنا کہ سلطان احمد فرغانہ سے واپس چلا گیا تو خود بھی الٹا پھر گیا۔ اس طرح چند حوصلہ مند بہادروں کے جمے رہنے سے (جون میں) وادی کا مشرقی حصہ بھی بابر کے پاس رہا اور وہ اس موقع پر جرات دکھانے سے جو فائدہ ہوا تھا، اسے عمر بھر نہیں بھولا۔

اس واقعہ کے بعد ہی بابر بہت جلد اخسی باپ کی قبر پر گیا۔ یہ پہاڑ کی چوٹی پر بنی تھی۔ کبوتر خانہ ٹوٹ جانے سے پالتو کبوتر بے گھر رہ گئے اور ادھر ادھر دیواروں پر اڑ رہے تھے۔ عمر شیخ روزانہ انہیں دانہ ڈالتا تھا۔ بابر نے خیال کیا کہ مرحوم کا فیض عام تھا

اسی طرح اس کی روح کی برکت وسیع ہو گی۔ اس نے فاتحہ پڑھی، قبر کے گرد پھرتا رہا پھر فقیروں کو جو اسی امید میں کثرت سے جمع ہو گئے تھے حسب دستور خیرات تقسیم کی۔ چلنے سے پہلے ایک شکاری کو حکم دیا کہ کبوتروں کو روزانہ دانہ کھلایا کرے۔

بابر کے بہت سے سپاہی مشرقی دروں سے حملہ آوروں کو نکالنے گئے وہ خود اہل محل کو لے کر واپس اندجان آیا جہاں اس کی ماں عدت میں گوشہ نشین ہوئی۔ یوں بھی وہ خاموشی پسند عورت تھی اور اپنے بچوں کے بے قابو مزاج پر انہیں سمجھانے، فہمائش کرنے کی بجائے دل میں گھٹا کرتی تھیں۔ ہوش مند نانی کا یہ حال نہ تھا۔ بابر رائے زنی کرتا ہے کہ "عقل سلیم اور فراست میں بہت کم عورتیں شہزادی ایسان دولت کی مثل ہوں گی۔ وہ بہت دور کی بات دیکھ لیتی اور اسے جانچ لیتی تھی۔ وہ بالا حصار کے دروازے کے برج میں آ رہی کہ آنے جانے والوں کو دیکھتی رہے۔ بابر کے خاص خاص دوستوں سے اخلاص و محبت کرنے پر اعتراض کرتی اور ایک پرانی مثل سنایا کرتی تھی کہ بادشاہی کوئی رشتہ کنبہ نہیں جانتی۔ اسے چوگان کے کھلاڑی، ظریف الطبع حسن یعقوب کے وزیر بنائے جانے پر بھی اعتراض تھا۔ فرغانہ میں صرف حسن (۱۸) ایسا شخص تھا جس نے سمرقند کے اکابر سے صلح صفائی کا راستہ نکال لیا اور ادھر سے بھی گویا اظہار دوستی کے لیے اس ایک شادی کے جشن میں شرکت کی دعوت بھیجی گئی تھی۔ اپنے دیدبان سے ایسان یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے محترم قاضی صاحب کو اپنے پاس بلایا۔ پھر تند مزاج قاسم کو طلب کیا اور آخر بابر کو بلا کر برا بھلا کہا۔ اسے خود رائے قرار دیا اور یہ کہ لوگوں کے کہنے سننے میں آ جاتا ہے مگر جس بات

کو خود کرنا نہ چاہے اسے کسی کے مشورے سے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

بخلاف بابر کے، اس کا علاتی بھائی جہانگیر (اور یہ نام آل تیمور میں بہت مقبول تھا) جس کی دس برس کی عمر تھی۔ حسن یعقوب جیسے اقتدار طلب وزیر کے بلا وقت قابو میں رہ سکتا تھا۔ پھر بابر سے ایسان نے تقاضا کیا کہ نئے بادشاہ کا سب سے پہلا کام کرنے میں دیر نہ لگائے اور وہ یہ کہ اپنے چھوٹے بڑے جملہ متوسلین کو اراضی عطا کرے اور بادشاہ کے متعلق انکی خدمات وفرائض انہیں بتائے۔ یہ کام خاطر خواہ ہو گیا تو خوانین اس کے وفادار رہیں گے۔ بابر کو اس بارے میں تامل تھا اور ادھر حسن یعقوب نے اپنا احسان مند بنانا شروع کر دیا تھا۔

بابر نے نانی سے کہا کہ حسن یعقوب نے سمرقند والوں سے سردست صلح کرا کے ہمیں فائدہ پہنچایا اور خود ان کے بلاوے پر بھی سمرقند جانے سے انکار کر دیا۔ ایسے شخص کے ساتھ کیوں بدگمانی کی جائے؟ مگر ایسان کے نزدیک بابر کا اسے قابل اعتماد سمجھنا محض اس وجہ سے تھا کہ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ سارے اندجان میں تنہا حسن یعقوب سمرقند کے قاصدوں سے گفت وشنید کیا کرتا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ موقع ہاتھ آتے ہی امرائے سمرقند کی مدد سے وہ عمر شیخ کے فرزند اکبر کو الگ کر کے جہانگیر کو اس کی بجائے کٹ پتلی بادشاہ کے طور پر تخت نشین کر سکتا ہے۔

سلطان علی کا غائب ہونا

آئندہ ایام میں بابر نے دیکھا کہ یعقوب اپنا کام خوب انجام دے رہا ہے لیکن بعض پرانے سپاہیوں کے ساتھ نخوت سے پیش آیا اور انہوں نے قلعے میں آنا موقوف کردیا۔ ایسان کی نگاہ اور دور تک جاتی تھی ۔اس نے قاضی ،اور قاسم بیگ کے ساتھ شاہی سرداروں کو بلایا۔ پھر بادشاہ سے پوچھے بغیر یہ لوگ مسلح ساتھیوں کو لے کرحسن یعقوب کی تلاش میں گئے مگر بالا حصار کے ایوان میں وہ کہیں نہیں ملا۔

اصل میں بابر کا یہ ظریف وزیرشہر کے عید گاہ دروازے سے ندی کے پار سمرقند کی سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ قاسم بیگ نے ادھر ادھر سے کچھ سپاہی جمع کئے اور تعاقب کرنے چلا تو معلوم ہوا کہ حسن یعقوب ایک جمعیت فراہم کرکے اخسی کی طرف مڑ گیا ہے کہ اس قلعے کو اچانک جادبائے اور پھر اپنے متوقع سمرقندی حلیفوں سے صلہ حاصل کرے۔لیکن اب ایک اور تقدیری واقع یہ پیش آیا کہ حسن یعقوب نے ضابطہ پسند قاسم کو دھوکا دیا اور پھیر کھا کے اس کے پڑاو پر شبخون مارا مگر اندھیرے میں خود اپنے ایک ساتھی کا تیر کھا کے،کولے ایسے زخمی ہوئے کہ گھوڑے پر چڑھنے کے قابل نہ رہا اور پراسی رستاخیز میں گھوڑوں کی روند میں آ کر ہلاک ہوگیا۔بابر کی حتمی رائے ہوئی کہ ”اس طرح تقدیر الٰہی اس کی دغابازی کا انتقام لینے کی تاک میں تھی ۔“ پھر طفلانہ جوش میں بابر نے پختہ ارادہ کرلیا کہ کمال تقویٰ کی زندگی گزارے گا۔چنانچہ مشتبہ کھانوں (۱۹) سے پرہیز کیا۔ چمچے، دسترخوان تک پاک وطاہر رکھنے پر توجہ کی۔ پچھلے پہر کو اٹھ کرتہجد کی نماز پڑھنے لگا۔اس نے قاسم بیگ کو محل سرا کا آغازا پنے شہر

اندجان کا حاکم مقرر کیا۔ ایسان کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

خزاں میں اس مرتبہ برف نے وادی فرغانہ کے راستے بند کر دیئے تھے۔ نوعمر بادشاہ کو چند ماہ اطمینان رہا لیکن آئندہ سال (۱۴۹۵) باہر سے بری بری خبریں آنے لگیں۔

سمرقند میں شریف مزاج اور بے کار شہر یار سلطان احمد میرزا کا انتقال ہو گیا جو امیر تیمور کی بادشاہی کی آخری پرچھائیں تھا۔ کوہستانی ولایات میں عمر شیخ اور راس کے بھائیوں کے زمانے ہی میں حالات ابتر و پراگندہ ہو گئے تھے۔ اب بھائی بھتیجوں کے جھگڑوں نے جن میں سے ہر ایک فوجی جمعیت رکھتا اور تیموری وراثت کا دعوی دار تھا، انہیں اور بھی خراب و یاس انگیز بنا دیا۔ ادھر جیحوں پار کی خطرناک مغل ٹولیاں نمودار ہونے لگیں جنہیں زمین یا لوٹ کی تلاش تھی۔ خود سمرقند ایک فصیل بند اکھاڑا بن گیا جس میں سازش دغابازی کے ساتھ سرگرم کار تھی اور شہر والوں کو لوٹ مار سے بچنے کی پڑی تھی۔ لٹیرے سر بازر نئی نئی بدمعاشیاں دکھا رہے تھے۔ سپاہی لوگ جو شہر کے مالک بنے ہوئے تھے طرح طرح کے شرمناک سانگ بھنڈیوں سے کراتے اور سر عام امردوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیے اکڑتے پھرتے تھے۔ بابر کا بیان ہے کہ کوئی شخص بغیر امرد کے نہیں نظر آتا تھا۔ لوگ رات کے وقت اپنے رضاعی بھائیوں کے بچوں تک کو اٹھا لے جاتے تھے۔''

بابر نے سمرقند کی بدنظمی کا تاریک نقشہ کھینچا ہے۔ وہ جن کو پسند نہیں کرتا ان کی خبر لینی خوب جانتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اب ایک عزم اسے تحریک میں لا رہا تھا۔ عمر شیخ

میرزا کے تھوڑے ہی دن بعد سلطان احمد کی وفات ایک شگون معلوم ہونے لگی تھی۔ ریشہ دوانی کرنے میں اسے مہارت نہ تھی اور سازشوں سے جب تک اس کے مفید مطلب نہ ہوں، الگ رہتا تھا۔ اس میں لوگوں کی محبت حاصل کرنے کا ملکہ خداداد تھا اور نانی کو تنبیہ کے باوجود اس صفت پر بھروسہ کرتا تھا۔ ایسان اور بابر کی ماں دونوں کو گذشت اقبال مندی کا غم تھا جب کہ عمر شیخ کی فرغانہ کے پار دور دور تک حکمرانی تھی اور انہوں نے بڑے بڑے درباروں کے ناز و نعم دیکھے تھے جو اب قصہ پارینہ ہو چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ فرغانہ کا الگ تھلگ ہو جانا ایک طرح کی وقتی حفاظت کا باعث ہوا تھا۔ مگر یہ بیبیاں اس حفاظت کی پائیداری پر شک رکھتی تھیں۔

انہی اثرات کے تحت بابر نے اپنا ایک مقصد سب سے الگ بنایا۔ وہ یہ کہ سمرقند کو لینے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اندجان میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تخت شاہی حاصل کرنا ہے تو وہ تیمور کا تخت ہونا چاہیے۔

اس کے حالات پر نظر کیجئے تو اس ہوس کا پورا ہونا غیر ممکن بات تھی۔ مگر اس کوشش کے سلسلے میں لڑکے نے ایک عزم مصمم کی ضرور پرورش کر لی۔ دو سال ہاتھ پاؤں مارنے سے اس کے متبعین دو ایک سرحدی بستیاں لینے کے سوا اور کچھ کامیابی نہ پا سکے۔ تاہم بعض نکالے ہوئے امیر اور کچھ گشت لگانے والے ضرور اس کے پاس پہنچے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ انہوں نے اپنی آمد کی باقاعدہ خبر کرا دی تھی۔ نو عمر بابر نے بھی تازہ وارد بھرتی ہونے والوں کی خاصی طرح درباری پذیرائی کی: ''

میں ایک شہ نشین پر تکیے لگا کے بیٹھا جیسی کہ سلاطین تیموری کی رسم ہے اور جب یہ چھوٹے چھوٹے ملوک قریب آئے تو اٹھ کر تعظیم دی۔ بغل گیر ہوا اور مسند پر اپنی دائیں جانب انہیں جگہ دی۔"

مغل رنگروٹ کوئی حکم نہیں مانتے تھے۔ بابر نے قاسم سے کہا ان میں سے دو چار کو قتل کر دے کہ دوسروں کو سبق حاصل ہو۔ قاسم نے حکم کی تعمیل کی لیکن چند سال بعد انہی مغل سپاہیوں کے خون کا بدلہ خون کے خوف سے اسے بابر کی نوکری چھوڑنی پڑی۔

اس اثنا میں سمرقند کے مجادلات سے بابر کو ایک نفع یہ ہوا کہ وہاں کے شکست خوردہ سپاہی اسکی فوج میں آنے لگے جس میں بہرحال استقامت تھی۔ اس کے ایک عم زاد بھائی سلطان علی میرزا کو اندھا کرنے کے لئے تپتی سلاخ آنکھوں سے چھوائی گئی تھی۔ وہ بھی بچ کر بھاگا اور محتاط لفظوں میں بابر کی طرف داری کرنے کا عہد و پیمان کیا۔ پھر جس طرح اس کے ساتھ قرارداد ہوئی تھی۔ گھاس خشک ہونے کے وقت مئی ۱۴۹۷ء میں بابر نے سمرقند، خوانین کے مختصر گروہ، مسلح شہری اور جلو باشیوں کو لے کر پیش قدمی کی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی جہانگیر کو ایسان کے پاس چھوڑنے میں کچھ حرج نہیں سمجھا اور کوئی معتمد علیہ نگرانی کے لئے نہیں چھوڑا۔ آئندہ ثابت ہوا کہ یہ بڑی فرو گذاشت تھی۔

بابر نے خوشی خوشی سمرقند کی سرحد کی ندی پار کی۔ راستے میں کئی بستیاں لیں، جوان بھرتی کیے۔ خوش منظر پہاڑی گاؤں شیراز کے قریب کئی سو اچھے مسلح سپاہی جن میں ایک وبلا سردار (۲۰) بھی تھا، ملاقی ہوئے اور اس نے بطیب خاطر انہیں اپنی

ملامت میں شامل کیا۔ ایک مدت بعد معلوم ہوا کہ اصل میں یہ لوگ پہاڑی گاؤں پر اسے روکنے کے لئے سمرقند سے بھیجے گئے تھے۔ اس کا اقراری حلیف سلطان علی مشرق سے نہ آیا۔ بابر نے اس کے غائب ہونے کی زیادہ فکر نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ بابر پیدائشی قسمت آزما تھا مگر کسی سلطنت کی تعمیر کا اس میں مادہ نہ تھا۔ اس نے حکومت کرنا بھی زمانے کی ٹھوکریں کھا کھا کر ہی سیکھا۔

شوال کا چاند دیکھ کر عید الفطر کا دگانہ ادا کر کے بابری لشکر آگے بڑھا اور ران پہاڑی باغوں میں ڈیرے ڈالے جہاں سے امیر تیمور کے قلعے کے چمکتے گنبد اور خاکی فصیلیں دکھائی دیتی تھیں۔ اندر سے کچھ سلحشور لڑنے نکلے۔ ان سے بابر کے دلیر تر سپاہیوں نے شمشیر زنی کی۔ ان کا غلبہ دیکھ کر بابر مسرور رہا کیونکہ وہ ہر بات جو فال نیک کا پہلو رکھتی ہو اچھی طرح یاد رکھتا تھا۔ ایک دن سمرقند کے دو امیر جو شہر کے باہر چمنستانوں کے لئے لڑنے آئے تھے، زخمی ہوئے۔ ان میں سلطان تنبل کے برچھی لگی تھی مگر وہ گھوڑے سے نہیں گرا۔ البتہ دوسرا جو شہر کا بڑا قاضی تھا (۲۱) گلے پر زخم کھا کے اسی وقت مر گیا۔ بابر نے روزنامچے میں لکھا کہ وہ صاحب علم و فضل شخص تھا۔ ایک وقت میں میرے باپ نے اس کی بہت عزت حرمت کی اور اسے مہردار مقرر کیا تھا۔ وہ سب سے اچھا باز کا شکاری تھا اور کہہ رہا سے طرح طرح کے کرشمے دکھانے جانتا تھا۔''

نوعمر بابر کی اوہام پرستی بڑھ رہی تھی لیکن ایک عملی وجدان رکھتا تھا جس نے لٹے ہوئے سوداگروں کے معاملے میں اس کی صحیح رہنمائی کی۔ جب سے اس کا لشکر نواح

شہر پر قابض ہوا انہیں آس پاس کے سرسبز علاقے کا دانہ چارہ افراط سے مل جاتا تھا جس کی شہر کے اندر فوجیوں میں نامیسری تھی۔ شہری اور تاجر جنہیں خانہ جنگی سے تعلق نہ تھا۔ بابر کے لشکر میں آنے جانے اور پڑاؤ کے بازار میں اجناس کا مبادلہ کرنے لگے تھے۔ لیکن ایک دن بابر کے سپاہیوں پر طمع غائب ہوئی کہ انہوں نے ان تاجروں کا مال اسباب لوٹ لیا۔ اس پر قاسم بیگ اور خود بابر نے سپاہیوں سے مطالبہ کیا کہ سارا سامان جو لوٹا گیا ہے سمرقندیوں کو واپس کر دیا جائے اور ان کے ساتھ امن وصلح کی جو مفاہمت تھی، بدستور قائم رہے۔ چنانچہ ''دوسرے دن کی پہلی گھڑی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک ایک تاگا اور ٹوٹی سوئی تک ان کے مالکوں کو بجنسہ واپس کر دی گئی۔'' لوٹ میں مغل تیر اندازوں کا بھی ہاتھ تھا۔ اب جو سب سامان واپس پڑا تو اس بات کا بھی قاسم کی طرف سے کینہ ان کے دل میں مزید ہو گیا)

صرف ایک بار اندجان والوں نے مورچہ بند قلعے پر حملہ کیا، سو وہ بھی بار ور نہ ہوا۔ بعض شہر والے انہیں رات کے وقت، ''غار عشاق'' کے راستے بالا حصار تک لے چلے تھے لیکن جو لوگ ان رہبروں کے پیچھے پیچھے چلے وہ رات میں ایسی جگہ پہنچے جہاں قلعہ والے گھات میں بیٹھے تھے۔ بابر کے چند پرانے رفیق یہاں کھیت رہے۔

گرمیاں ختم ہوئیں، سورج برج میزان کی طرف بڑھتا نظر آیا تو بابر کے سرداروں کو سردیا گزارنے کی فکر ہوئی۔ طے پایا کہ کھلے پڑاؤ کو چھوڑ کر قریب کے ویران قلعوں میں قیام کیا جائے جہاں سپاہی چھتیں ڈال کر پناہ لے سکتے تھے۔ یہ منتقلی ہو رہی تھی کہ اسی رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جس سے ممکن تھا کہ محاصرہ اسی

وقت ختم ہو جائے۔ ہوا یہ کہ چارہ فراہم کرنے والے دوڑے ہوئے آئے اور خبر دی کہ مشرق کے راستے سے سواروں کا ایک لشکر آ رہا ہے۔ بابر کو امید ہوئی کہ شاید غائب ہونے والے حلیف ہوں لیکن ان کے پرچموں پر نئی طرح کی گھوڑوں کی دمیں لٹک رہیں تھیں۔ سب طے ہوئے تاریک مجمعے کی صورت میں، دہقانی لباس پہنے کسی سازو سامان یا بھیر کے آ رہے تھے۔ نہ انہوں نے کوئی قاصد بھیج کر آنے کی اطلاع دی تھی۔ بارے بابر کے مغل سپاہیوں نے بہت جلد پہچان لیا کہ یہ دریا پار کا ازبک لشکر ہے۔ ساتھ ہی افواہ اڑ گئی کہ یہ نوجوان سلطان باسنغر کے بلائے ہوئے آئے ہیں جو اس وقت بابر کے مقابلے میں سمرقند پر قابض تھا۔

جنگی فن فریب تو بابر کے حق میں سازگار نہیں ہوئے تھے لیکن ضرورت کے وقت فوری عمل کرنا اسے خوب آتا تھا۔ شاید اس کی بے خبری بھی اس وقت کارآمد ثابت ہوئی اور ممکن ہے اندجان کی ندی پر مٹھی بھر سپاہیوں سے مقابلہ کرنے جو کامیابی نصیب ہوئی تھی وہ اسے یاد آئی ہو کہ اس نے قریبی سواروں کو پکارا اور انہیں لے کر چپ چاپ آنے والے ازبکوں ک سامنے ایک بلندی پر جا کھڑا ہوا۔ اب یہ مقابلہ آپس کے بھائی بھائیوں کی آویزش نہیں تھی بلکہ پشتینی دشمنوں سے جنگ ٹھن رہی تھی۔ اندجان کے تمام سپاہی بہ عجلت اس کے جھنڈے کے نیچے ٹیلے پر جمع ہو گئے۔ ادھر ازبکوں کے سردار شیبانی خاں کو مشکوک صورت میں اندیشہ ہوا کہ کسی پھندے میں نہ پھنس جائے لہذا اپنی فوج کو بڑھنے سے روک دیا۔ دن کے باقی حصے میں فریقین اسی طرح آمنے سامنے کھڑے رہے۔ ایک طرف بابر کے شہری سپاہی

دوسری طرف خانہ بدوش لٹیرے جو دارلحکومت کے جھگڑوں میں پاؤں اڑانے آئے تھے۔ شیبانی خاں بابر سے عمر میں بڑا تھا۔ وہ یونس خاں کو اپنے باپ کے قتل کا ذمہ دار گردانتا تھا۔ رات ہونے از بک لشکر محفوظ پڑاؤ کے واسطے پیچھے ہٹ گیا او جب اگلی صبح بھی قلعے کے اندر سے کسی فوج نے نکل کر ان سے ملنے کے اقدام نہ کیا تو وہ شمال کی طرف چمپت ہو گئے۔ بابر کی اپنے دور اندیش اور آئندہ بارہ برس میں غالب آنے والے حریف سے یہ پہلی مڈ بھیڑ تھی۔

سمرقند میں ایک سو دن

مگر اس بلا جنگ مقابلے نے محصور شہر اسے جتا دیا۔ شہر پناہ کے اندر سامان خوراک کم ہو رہا تھا۔ سردیاں سر پر تھیں اور شہر والے بائسنغر کی حکومت کے تحت بہت مصائب جھیل چکے تھے۔ یہاں بابر کے سوداگروں کیساتھ فیاضانہ سلوک نے بھی ان کے خیالات پر اثر ڈالا۔ ازبکوں کے بائسنغر کی مدد پر آ جانے کا خوف بھی دور ہوا۔ اب اس کے امراء اپنی ریاستوں کو جانے کے لئے کھسکنا شروع ہوئے اور پھر خود بائسنغر چند صد رفیقوں کے ساتھ نکل کر راستے پر ہولیا کہ اپنے خاندان کے دور دراز رہنے والے حامیوں کا دامن تھامے۔ اس کے جاتے ہی شہری اور نوجوان سوار جوق در جوق بابر کے سرمائی قعلے کی طرف روانہ ہوئے۔ انہیں جلو میں لے کر ہمارا شیر بالا حصار میں گھوڑے پر سوار داخل ہوا اور محل کے باغ میں اتر پڑا۔ اب وہ تیمور کے شہر اور اس کی دادی کا بلا شرکت مالک تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا۔ خدا کی

عنایت سے ہوا۔

عمر شیخ کے فرزند نے پائے تخت کا جہاں دس برس قبل بچہ سا آیا تھا، اب تفصیل سے جائزہ لیا۔لکھتا ہے اتنے پسندیدہ محل وقوع کے شہر دنیا میں کم ہوں گے۔تب ہی تو اسی کی بنیاد سکندر نے رکھی اور یہ محفوظ شہر مشہور رہا۔میں نے حکم دیا کہ اس کی پکی فصیل قدموں سے ناپی جائے۔یہ پیائش دس ہزار چھ سو قدم نکلی۔''

بابر جب کسی مقام کی تفتیش کرتا تو اوپر کے طبقے سے شروع کرتا اور وہاں کی روایات ورسوم اور جو باتیں دل پسند ہوتیں، ان سب کو محفوظ کرتا تھا۔سمرقند، فاضل، حکما، فلاسفہ اور فقہا کے ماثر کا خزانہ تھا۔وہاں کے باشندے سنت والجماعت حنفی مذاہب کے سچے اور پکے مسلمان تھے۔اس کی ندی جو کوہک پہاڑی کے دامن میں بہتی ہوئی آتی تھی، اپنے رج بہوں سے پورے میدان کو سیراب کر دیتی تھی اور یہاں کی زرخیز مٹی میں نہایت رسیلے سیب اور گہرے رنگے کے انگور ہوتے تھے۔جو (بہ تصحیح مترجم) صاحبی موسوم تھے۔

''بالا حصار کے اندر امیر تیمور صاحب قرآن نے چار منزلہ محل تعمیر کیا تھا جو نیلے محل کے نام سے شہرہ آفاق ہوا۔آہنی دروازے کے اندر پتھر کی عظیم جامع مسجد بنائی جس کے دروازے پر آیت قرآن ''ربنا تقبل منا (۲۲) کنندہ ہے۔واقع میں یہ نہایت پر عظمت عمارت ہے۔''

شہر کے ایک دروازے کے قریب ایک مدرسے اور درویشوں کی خانقاہ کے آثار باقیہ تھے اور اسی احاطے کے اندر امیر تیمور اور اسکے خلاف کے ''جنہوں نے سمرقند

میں بادشاہی کی ''مقبرے تھے۔ عالم شادمانی میں بابر اپنے آپ کو بھی اسی درخشندہ زمرے میں تصور کر رہا تھا۔ اسی زمرے میں بزرگ فاتح کا وہ پوتا شامل تھا جس کا دنیائے علم و فضل میں نام روشن ہوا۔ یعنی الغ بیگ، بطلیموس جغرافیہ نگار کی کتاب المجسطی کا شارح۔ ''اسی نے دامن کوہک میں سہ منزلہ رصدگاہ تعمیر کی تھی اور اسی رصدگاہ کی بدولت ستاروں کی وہ ''زیچ'' مرتب ہوئی جو آج کے دن تک مسلم و مستند مانی جاتی ہے۔''

علم ریاضی بابر کی دسترس سے باہر تھا لیکن ریاضی کے کمالات کی وہ قدر جانتا تھا کہ اس کے ذریعے ستاروں کی مقامات و مستقبل کی جدولیں بنائی جا سکتی ہیں۔ الغ بیگ کے غیر معمولی حافظے کی یہ روایت بھی اسی نے سنی تھی کہ یہ شہزادہ جو کتب بینی کے ساتھ شکار کا بھی شوقین تھا۔ روزانہ اپنے شکاروں کی کیفیت روزنامچے میں درج کر لیتا تھا۔ ایک دفعہ سال بھر سے زیادہ کا روزنامچہ کھو گیا تو الغ بیگ نے حافظے سے اسے دوبارہ لکھوا دیا۔ پھر کچھ دن اتفاق سے گم شدہ روزنامچہ مل گیا تو نئے لکھے ہوئے سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف تین چار جانور جو وہ مار کر لایا تھا، دوبارہ لکھوانے میں چھوٹ گئے تھے۔

''کوہک کے دامن میں جانب مغرب ایک میدانی باغ کے اندر شاندار چہل ستون کی دو منزلہ عمارت بنی ہوئی ہے کونے کے برجوں سے چار مینار اوپر نکالے گئے ہیں۔ ستون سب پتھر کے نئی نئی طرز سے تراشے ہوئے ہیں۔ بعض نالی والے، بعض پیچ در پیچ اور بعض میں دوسری ندرتیں ہیں۔ وسط میں وسیع ایوان بھی ستونوں پر

قائم ہے۔اوپر کی منزل میں چاروں طرف کھلی ہوئی غلام گردش بنائی ہے۔''

اسی طرح نوعمر فاتح نے رعایا کی تفریحی بارہ دری کا نقشہ کھینچا ہے جو ایک وسیع احاطے کے اندر تھی اور ہر طرف درختوں کا سایہ تھا۔انہی کے نیچے لوگوں نے سنگ مرمر کی یہ عمارت بنائی تھی جس کے پتلے پتلے میناروں کے بیچ میں کاشانی چوکوں کا گنبد، سامنے ساکت پانی میں اپنا جھلملاتا ہوا عکس ڈالتا تھا۔۔۔یہ گویا تاج محل کا نقش اول تھا۔

عظیم تخت شاہی کا بابر نے غور سے معائنہ کیا۔یہ ایک کوشک کے نیچے رکھا تھا اور پتھر کی ایک ہی بڑی ڈال کو تراش کر بنایا گیا تھا، جس کی لمبائی تمیں فٹ اور بلندی پندرہ فیٹ تھی۔اس پر طرح طرح کے ابھرواں نقش ونگار تراشے تھے۔بابر لکھتا ہے کہ یہ دیو پیکر چٹان بڑی دور سے لائی گئی تھی۔لوگوں نے مجھے بتایا کہ اسے یہاں قائم کرنے کے بعد اس میں درز آ گئی ہے۔''

درز نے بابر کو تشویش میں ڈال دیا۔دوسری نشانیوں کے ساتھ یہ بھی آل تیمور کے زوال کی خبر دیتی تھی اس نے شمار کیا کہ صرف چار مختصر پشتوں ہی میں دس فرماں روا تخت سمرقند پر باضابطہ متمکن ہوئے اس کا غائب ہو جانے والا حلیف سلطان علی صرف ایک دو دن اور اس کا بھائی بائسنغر چند ماہ بادشاہ رہے۔بڑی کوشک کے گرد باغ میں ایک اور بارہ دری کی چھت پر چینی کے چوکے تھے۔اسے جنگلی ازبک حملہ آوروں نے بری طرح نقصان پہنچایا تھا۔گونجتی مسجد کی شکستہ دیواروں کی کبھی مرمت نہ ہوئی تھی۔بچپن میں بابر نے یہاں کے عجائبات دیکھے تو ان خرابیوں پر اس کی نظر

نہیں گئی تھی۔ مگر مسجد کے چھوٹے دالان کے فرش پر اس نے پاؤں مارا تو اس وقت بھی وہی عجیب صدا ''لق لق'' (۲۳) گونجی۔ ''یہ حیرت ناک بات ہے اور کوئی شخص اس کا بھید نہیں جانتا۔''

بہر حال شہر کے تجارتی وسائل کا حساب کر کے بابر نے دل کو تسلی دے لی۔ سمرقند میں ہر پیشہ والوں کا الگ بازار تھا۔ سب سے بہتر نان بائیوں کی دکانیں تھیں۔ دنیا کا نفیس ترین کاغذ سمرقند میں ملتا تھا اور وہ قرمزی ریشم جس کی یورپ کی منڈیوں میں بڑی مانگ تھی (اسی کے رنگ سے انگریزی لفظ ''کرمزن'' مروج ہوا ہے) پھر بابر نے باہر کے مرغ زار اور سرمائی و گرمائی مقامات کی سیر کی، جہاں سمرقند کے خوش حال لوگ جا کے رہا کرتے تھے۔ انہیں قوروغ کہتے تھے اور یہاں ملوک و امراء کے خاندان ہفتوں قیام کر سکتے تھے۔ پردے کی دیواریں اغیار سے ان کی نگہبانی کرتی تھیں۔ اصل میں شہری گلی کوچوں کی مسقّف عمارتوں کے اندر بند پڑے رہنا ابھی تک ترک و مغل امرا کی عادت نہیں بنا تھا۔

بابر کی ناقدانہ نگاہ سامان لطف و نشاط کی ذرا ذرا سی چیز تک جاتی تھی۔ اسے شکایت ہے کہ سمرقند کے نفیس، چار باغ میں سردنارون، سفیدار کے درخت موزوں قسم بندی کر کے نصیب کیے ہیں۔ لیکن آب ران کا کوئی انتظام نہیں۔ وہ اس خطے کے اعلیٰ خربوزوں کی خوبی تسلیم کرتا ہے مگر کہتا ہے کہ وہ میری وادی فرغانہ والوں کی مثل شاداب و شیریں نہیں ہوتے۔

ابتدائی چند روز کی شادمانیاں بہت جلد فکر و تشویش میں بدل گئیں۔ سمرقند کے

جن امیروں نے اطاعت قبول کی بابر کے خاص طورر پر ان کا خیر مقدم کیا۔ انہی میں سلطان احمد تبنل سے وہ خصوصی عنائیت سے پیش آیا جس کا برچھی کا زخم اچھا ہو گیا تھا۔ اگر چہ فراموش نہیں ہوا تھا۔ لیکن خود بابر کی معجون مرکب فوج اب باعث خلجان ہو گئی تھی۔ سپاہیوں نے بازاروں سے کافی مال غنیمت حاصل کیا لیکن لوٹا نہیں تھا کیونکہ اس کی بابر نے اجازت نہیں دی کہ محاصرے کی وجہ سے پہلے ہی اس نے بہت مصیبت جھیلی تھی۔ موسم سرما کی آمد تھی اور نواحی علاقہ اجناس خوردنی سے بہت کچھ خالی کرایا جا چکا تھا۔ بیج تک کے لئے اسے اپنے مختصر ذخیرے سے غلہ تقسیم کرنا پڑا۔ بھلا ایسے مفلوک شدہ دیہات سے اور کیا لیا جا سکتا تھا؟ ہمارے فوجی لوگ پریشان تھے اور انہیں کچھ نہ دے سکتا تھا۔'' جاڑے کے موسم نے صورت حال کو اور ابتر کر دیا۔ لوگ گھروں کو چل دینے کی سوچنے اور ایک ایک دو دو کر کے فرار ہونے لگے۔ جملہ مغول ساتھ چھوڑ گئے اور آخر میں سلطان احمد تبنل بھی چلتا ہوا۔''

سمرقند کے نیم ویران محلول میں انتظار کرتے کرتے، بابر نے اپنے بزرگ قاضی سے امداد طلب کی تو معلوم ہوا کہ خود اندجان کے گرد مخالف جمع ہو رہے ہیں۔ اس کے مفروضہ حلیف سلطان علی کے ہرکاروں نے تبنل کو تلاش کر لیا اور پھر دونوں نے مل کر نئی فوج تیار کرنی شروع کی۔ نا مطمئن افراد، مغول کی بگڑی ہوئی جمعیت کو ساتھ ملایا اور بہلا پھسلا کر بابر کے چھوٹے بھائی جہانگیر کو بھی اندجان سے باہر کھینچ لایا اس کے بعد یہ کہہ کر کہ ہم اسے جہانگیر کے لئے فتح کرنا چاہتے ہیں۔ سازشیوں نے شہر کو ہر طرف سے گھیر لیا۔

ایسان دولت بیگم اور قاضی کے خط آئے کہ بلا تاخیر واپس آؤ اور اپنے شہر کو بچاؤ۔لیکن مذکورہ سازش کی خبروں نے نوعمر بابر کو بالکل سراسیمہ کر دیا تھا۔ادھر سمر قند میں اس کے پاس ایک ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے۔

قاسم بیگ نے صحیح کہا کہ ہمارے پاس فوج کہاں ہے جسے اندجان بھیجیں۔پھر اسی نازک موقع پر بابر علیل ہو گیا۔فکر و تشویش نے بخار میں ایسی شدت پیدا کی کہ چار دن تک خط پڑھنا، احکام جاری کرنا ایک طرف وہ زبان سے بات نہ کر سکتا تھا۔ بحران مرض میں صرف روئی سے پانی اسے چویا جاتا تھا۔اسے سے افواہ پھیلی کہ وہ بخار سے جانبر نہ ہو گا۔سوائے اتفاق سے اسی زمانے میں باغی لشکر کا ایلچی آیا اور اصرار کیا کہ بابر کے سامنے مجھے لے چلو۔تیمادار عمال کی غلطی تھی کہ اسے بابر کی حالت دیکھنے کا موقع دیا۔چنانچہ وہ فوراً اڑا ہوا اندجان کے پڑاؤ پر پہنچا اور خبر دی کے بابر نزع کی حالت میں ہے۔اس خبر کو سن کر قلعہ دار نے باغیوں کے سامنے جن کے قبضے میں جہانگیر تھا، ہتھیار ڈال دیے۔تبنل نے کمال شقاوت سے بابر کے سب سے مستقل مزاج طرف دار، قاضی خواجہ کو سولی پر لٹکا دیا۔۔۔۔بابر تزک میں لکھتا ہے کہ ''میں بلا شک و شبہ یقین رکھتا ہوں کہ یہ بزرگوار قاضی اولیاءاللہ میں سے تھا۔اس حقیقت کا صرف یہ ایک ثبوت کیا کم ہے کہ جو لوگ اس کے خون ناحق میں شریک تھے۔چند ہی روز کے اندر ان میں سے ایک شخص بھی دنیا میں باقی نہ رہا۔ سب کے سب ہلاک و بےنشان کر دیئے گئے۔دوسرے خواجہ قاضی کی حیرت انگیز دلاوری بھی اس کے سچے باخدا ہونے کی کوئی معمولی شہادت نہیں ہے۔اکثر بہادر

سے بہادر اشخاص بھی دل میں خوف و خطر خالی نہیں ہوتے مگر اس بزرگ کے دل میں ان کا ذرا بھی گزر نہ تھا۔

سمرقند میں بابر کو افاقہ ہوا تو اس واقعے سے پہلے ہی وہ نانی کا التجا آمیز خط پڑھ چکا تھا۔ کہ ''اگر ہماری فریاد سن کر تم مدد کو نہ آئے تو سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ سواری کرنے کے قابل ہوتے ہی وہ اپنی سپاہ کو لے مضطربانہ اندجان کی طرف چل پڑا۔ وسط راہ میں اور خود اپنے وطن کی ندی کے کنارے ایک بستی میں خبر ملی کہ اندجان ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی روز دوسری طرف سے اطلاع آئی کہ اس کے رخصت ہونے کے بعد سلطان علی نے سمرقند پر قبضہ جما لیا۔ اس طرح اندجان کی خاطر میں نے سمرقند کو کھویا مگر معلوم ہوا کہ اسے کھو کر بھی دوسرے کو نہیں بچا سکا۔''

با ایں ہمہ بابر کو اذعان تھا اور ساری عمر رہا کہ بخار کی شدت میں اس نے پیر پیران حضرت احراریؒ کی طرف (جو کئی سال پہلے جب بابر سات سال کا تھا، فوت ہو چکے تھے) رجوع کیا اور انہی کی شفاعت سے اس کی جان بچی۔

بابر کی قزاقانہ جنگ

عمر شیخ کا فرزند بادشاہی کے دونوں سرے ہاتھ سے کھو چکا تھا۔ چالاک حریفوں کی سازش نے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اسے اپنی یاس انگیز حالت کا اندازہ ہوا۔ میں اپنے **ملک** اور رفیقوں سے کبھی اس طرح نہیں بچھڑا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر وہ غم زدہ ہوتا اور جب کوئی پاس نہ ہوتا، تو روتا

تھا۔ حقیقت میں خود اس کی عمر کہ اب وہ پندرہ سال کا ہونے والا تھا، خطرے کا باعث بن گئی تھی۔ چھوٹے بھائی کو تو مفید مطلب کٹھ پتلی کے طور پر حریفوں نے بچائے رکھا تھا جیسا کہ ایسان پیش گوئی کر چکی تھی لیکن بابر جس نے کچھ روز پہلے سمرقند فتح کیا اور فوجوں کی سپہ سالاری کر دکھائی، دشمنوں کی نظر میں خار تھا اور وہ اس کانٹے کو دور کرنے کے درپے تھے۔ شکاری ہمارے شیر کو ہر طرف سے گھیرتے چلے آتے تھے اور وہ دو سال تک علاقے بھر میں مارا مارا پھرا کہ محفوظ جگہ کہیں مل جائے۔ اپنی وادی چھوڑ کر نکل جانے کا اس نے خیال نہیں کیا۔ اپنے ماموں محمود خاں خلف یونس خاں کے پاس مدد دینے کے لئے قاسم بیگ کو بھیجا۔ اس وقت بابر کی ماں، محمود خان کی بہن باغیوں کی قید میں تھی۔ محمود خوشی سے فوج لے کر چلا لیکن سمجھ گیا کہ حالات بھانجے کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ اس کے سرداروں نے تنبل کے نائبین سے تحفے تحائف قبول کئے اور اپنے خان کو مشورہ دیا کہ وادی میں خطرہ مول نہ لے، واپس ہو جائے۔ بابر اپنی فوجوں کو اینچ پیچ سے لا رہا تھا کہ ماموں سے آ ملے، اسے بہت مایوسی ہوئی، پھر محمود کی واپسی نے خود اس کی فوج میں انتشار ڈال دیا۔ اس کی بے بسی دیکھ کر بہت سے سپاہی اور سردار دونوں سر دیا چمکتے ہی پڑاؤ چھوڑ کر چلنا شروع ہوئے اور ان کے اہل و عیال شہر اندجان کے اندر تھے اور اس مضبوط شہر کو چھین لینے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ لہذا وہ بابر کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ان کی تعداد جنہوں نے میرے ساتھ بے خانماں رہنے، مصیبت بھگتنے کو ترجیح دی، کل دو تین سو ہوگی۔ اسی میں اچھے برے سب شامل ہیں۔ یہ صورت میرے لئے سخت روح فرسا

ہوگئی اور میں دل بھر کے رویا۔"

ٹھیک اسی زمانے میں باغیوں نے اسکے اہل محل کو آزاد کر دیا۔ شیر دل ایسان کے آ جانے سے نواسے کو بہترین مشیر مل گیا۔ تامل کے بغیر خود بابر نے حاجلانہ تاشقند کا سفر کیا۔ محمود خاں سے مدد مانگنے کے لئے نہیں۔ بلکہ ظاہراً اپنی خالاؤں سے ملنے اور ماں کے واسطے کچھ مسلح دستے مستعار لانے کی غرض سے، چنانچہ شمالی جنگ آزماؤں کے چند معقول جوق اسے مل گئے اور وہ شوق ذوق سے انہیں لے کر چلا اپنی وادی کے ایک سرحدی قصبے پر حملہ کرے۔ لیکن نئے سرداروں نے بتایا ک اس پر قبضہ رکھنے کے لئے ہماری فوج ناکافی ہوگی۔ بابر کو زد پر چڑھا ہوا شکار بادل ناخواستہ چھوڑ دینا پڑا۔ البتہ وہاں کے تھوڑے مزہ دار خربوزے ہاتھ آئے۔ ان شیخی خربوزوں کا چھلکا کیمخت کی طرح کھردرا اور گودا چار چار انگل ہوتا ہے۔ نہایت لطیف اور لذیز ہوتے ہیں۔"

بابر کے قبضے میں ایک ہی بستی خجند رہ گئی تھی۔ واپس آیا تو معلوم ہوا یہاں بھی قدم نہیں ٹک سکتے۔ یہ سیر دریا کے قریب سمرقند سی کی کاروانی شاہ راہ پر ایک چھوٹا سا مقام اتصال تھا۔ لوگ دریا میں کشتیاں چلا کے یا بادام چن کر بسر اوقات کرتے تھے۔ اس بستی میں چند صد مسلح سپاہیوں کی سربراہی کرنے کی استطاعت نہ تھی۔ بابر نے حسب معمول پسند نہ کیا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہے بلکہ جس طرح ایک مستعار فوج سے لشکر کا پیکر تیار کیا تھا، اب اونچی پہاڑیوں میں جہاں غلے کے کھیت اور مواشی کے گلے تھے، مستعار لشکر گاہ حاصل کرنے کی تدبیر کی۔ ادھر روانہ ہوتے

وقت سلطان علی، جس کی خاطر ع بابر نے سمرقند پر چڑھائی کی تھی، ہرکارا پہنچا اور تنبیہی پیام لایا۔ دشمن کا نرغہ بے گھرے شہریار کے گرد تنگ ہوتا جاتا تھا۔ پناہ کے لیے کوئی فصیل بند مقام نہ تھا۔ بابر نے انہی پہاڑیوں کا راستہ تلاش کیا۔ جہاں سابق میں وہ گھوما کرتا تھا اور جہاں اس کے آدمیوں کو خشک میوہ اور شکار ملنے کی امید تھی۔

اس پہاڑی گھونسلے میں، آتے جاتے لوگوں نے یہ بھی صلاح دی کہ پہاڑی بلندیوں کے پار ادھر ادھر ایسی بستیاں ہیں جہاں وہ قیام کرسکتا ہے ان میں ایک رقیب چاق خسرو شاہ کی عمل داری تھی جو کسی وقت سمرقند میں وزیر رہا اور علت میں گرفتار تھا۔ مگر بابر نے یہ بات گوارا نہ کی۔ لکھتا ہے۔ خسرو شاہ دروغ کرنے والا غدار۔۔۔'' یہ الفاظ بابر نے اس وقت لکھے جب سنا کہ خسرو شاہ نے اپنے سابق آقا کے ایک بیٹے کو مروا دیا اور ایک کو اندھا کرا دیا۔ خدا کی ہزار لعنتیں ایسا کرنے والے پر۔ اور جو اس کا یہ فعل سنیں ان کی لعنتیں تا قیامت اس پر ہوں!''

بابر کو معدودے چند ہی لوگوں سے عناد ہوا لیکن وہ سب سے بڑھ کر اسی خسرو سے اظہار نفرت کرتا تھا۔ اوروں کی نگاہ میں خسرو کتنا ہی نرم خو ہو، بابر کی نظر میں اس نے اپنے ولی نعمت کی اولاد کی قبروں پر چڑھ کر اقتدار حاصل کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس روز افزوں لشکر و مال ہونے کے باوجود بابر کو یقین تھا کہ ذاتی طور پر وہ طویلے میں ایک مرغ کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا۔ غرض مصلحت کی خاطر بھی اس نے خسرو کا رخ نہیں کیا۔ اگرچہ وہی ایسا طاقتور حاکم تھا جس سے مدد مل سکتی تھی۔ ادھر سے منہ پھیر کے بابر اپنے ساتھیوں کو اسی کوہ سفید کی چوٹیوں پر لے

چلا۔ جہاں مہماں نواز قبائل کی جھونپڑیوں میں پناہ مل سکتی تھی۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن جب تنہا گشت لگانے میں اپنے حال پر غور کیا تو اسے عجب طرح کی مایوسی نظر آئی۔ اب شارع عام پر خجند واپس جانا مخدوش تھا اور ادھر یہ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان جنگلی قبائل کے درمیان اپنے گھر والوں اور سپاہیوں کو کب تک رکھنا ممکن ہوگا؟

ایک دن انہی افکار میں غلطاں تھا کہ اسے ایک نشانی نظر آئی، یا اس نے اسے نشانی سمجھا۔ یعنی ایک درویش سے جو ساہی کی طرح بے گھر اتھا، ملاقات ہوئی۔ وہ شہید قاضی کا مرید تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے تعزیت کی اور مل کر دعائے مغفرت، پھر ایک دوسرے کے حال پر افسوس کرتے رہے۔ درویش نے کہا کہ صرف قادر مطلق خدا ہی معاملات کو روبراہ کر سکتا ہے۔ سہ پہر کو ایک سوار بابر کے پڑاؤ پر اوپر آیا اور بابر کے سابق قلعہ دار علی دوست کا۔ جس نے اندجان کا قلعہ باغیوں کے حوالے کر دیا تھا تحریری پیام لا کر دیا۔ علی دوست کو تنبل نے قبول اطاعت کے صلے میں فرغانہ کا تیسرا بڑا قصبہ مرغیناں حکومت میں دے دیا تھا۔ اب علی دوست نے محاصرین کی اطاعت قبول کرنے کی خطا کا اعتراف کیا اور اپنے اصلی آقا بابر سے درخواست کی کہ وہ خود مرغیناں آئے۔ علی دوست شہر اس کے حوالے کر کے اپنے سابقہ جرم کی تلافی کر دے گا۔ مضطرب جلاوطن کو یہ پیغام درویش کی دعا کا اثر معلوم ہوا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ باغیوں نے خواجہ قاضی کو سولی دی تو علی دوست کو انعام کیوں دیا؟

''مایوسی کے بعد، ایسی خوش خبری! ہم اسی گھڑی کہ سورج غروب ہو چکا تھا، بلا

تامل سیدھے مرغینیاں کی طرف چل پڑے۔ ایسی سرعت سے گویا چھاپہ مارنے جارہے ہیں۔ وہ جگہ سڑک سے کوئی پچیس فرسخ ہوگی۔ ہم ساری رات اور دوسرے دن دوپہر تک مارا مارا چلتے رہے۔ یہاں تک کہ نجد کے ایک گاؤں کی پتلی ندی پر پہنچ کر دم لیا۔ خود ستائے۔ گھوڑوں کو دانہ چارہ کھلایا۔ شام کی نوبت بجتے ہی پھر سوار ہوئے۔ صبح تک چلے اور اسی طرح اگلے دن شبانہ روز چلے یہاں تک کہ اگلی فجر ہونے سے کچھ پہلے مرغیناں سے چند میل پر پہنچ گئے۔ یہاں ''دبلا آغا'' (۲۴) اور دو چار آدمیوں کو ساتھ لایا اور مجھ سے حجت کی کہ ''حقیقت میں علی دوست بد آدمی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس سے نہیں ملا۔ اور آپ کے اور اس کے مابین گفتگو یا شرائط طے نہیں ہوئیں۔ پھر کس بھروسے پر ہم جارہے ہیں؟'' ان کا اعتراض بجا تھا لہذا میں نے ٹھہرنے کا حکم دیا اور کنگاش کی۔ آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ ہمارے خدشات صحیح ہیں لیکن اب بعد از وقت ہیں۔ دن رات منزلیں مار کر یہاں آئے ہیں اور اب کسی آدمی یا گھوڑے میں طاقت باقی نہیں رہی۔ جائیں بھی تو کہاں جائیں؟ اتنی دور آجانے کے بعد آگے ہی چلنا ہوگا۔ آئندہ جو کچھ ہوگا، حکم خدا سے ہوگا۔''

''فجر کی نماز کے قریب ہم مرغینیاں پہنچ گئے۔ علی دوست اس وقت تک بند دروازے کے باہر نہیں آیا جب تک کہ ہم سے شرائط طے نہیں ہوگئیں۔ طے ہونے کے بعد اس نے پھاٹک کے پٹ کھولے اور میرے سامنے آکے آداب تعظیم بجا لایا۔ پھر ہم اندر چلے اور شہر پناہ کے اندر ایک مناسب مکان میں گھوڑوں سے

اترے میرے ساتھ چھوٹے بڑے کل دوسو چالیس نفوس تھے۔''

تھوڑے دن بعد وفادار قاسم بیگ اپنے پہاڑی مامن سے ایک سواور سوار لے کر آیا۔ پشیمان علی دوست کے سپاہیوں نے بابر کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اور اس طرح ہمارے شیر کے پاس میدان کا ایک مورچہ بند شہر اور خاصا چھوٹا موٹا لشکر پھر فراہم ہو گیا۔ اس نے تقدیر پر بھروسہ کیا اور سمجھا کہ تقدیر نے یاوری کی۔ لہذا سازگار نصیبے سے فائدہ اٹھانے کی مزید کوشش کرنے لگا۔ قاسم اور معتمد علیہ نائبوں کو اور فوج بھرتی کرنے ادھر ادھر بھیجا۔ ساری وادی میں دیہ بہ دیہ خبر پہنچی کہ بابر کو پھر قوت حاصل ہو گئی۔ قبائل جو انتظار میں تھے گھوڑوں پر سوار ہو ہو کر اپنے بادشاہ کے فرزند اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گھاس پکنے کے ساتھ شمالی دروں سے ماموں کے سپاہی جوق در جوق غارت کا مال ملنے کی طمع میں آنے لگے۔ اخسی اور اندجان میں عوام نے ہتھیار سنبھالے۔ خوش مزاج بابر گلی کوچوں میں بہت ہر دل عزیز رہا تھا، ادھر تنبل اور باغی سردار سختی سے حکومت کرتے تھے۔ غرض عوامی جذبات کا مرغ بادنما عمر شیخ کے بیٹے کی جانب پھر گیا۔ بلند چٹانوں پر اخسی کے قلعے کو یکا یک ہلہ کر کے اور لڑ کر چھین لیا گیا۔ یہ معرکہ اس طرح ختم ہوا کہ تنبل کی فوجیں ندی کے راستے کشتیوں میں آئی تھیں۔ بابر کے مغول نے ان کا حملہ پسپا کیا اور ننگی پیٹھ کے گھوڑوں پر سوار انہیں بھگاتے ہوئے ندی کے اندر تک گھس گئے۔

طوفانی تاختیں چھاپے پلٹ کر حملے، چھین جھپٹ کے ہنگامے میں جن کا بابر مرد میدان تھا، گرم تھے کہ اندجان والوں نے بھی بابر کی اطاعت کا اعلان کیا۔ اجیر

مغلوں کا سردار وادی سے فرار ہوا۔ اسکے سواروں نے بابر کے اس وعدے پر کہ سابقہ بدعنوانیوں کی ان سے باز پرس نہ ہوگی۔ اس کی ملازمت قبول کر لی۔ دو سال تک ادھر ادھر چھپتے پھرنے کے بعد بالآخر جو ۱۴۹۹ء میں بابر دوبارہ فرغانہ کا مالک ہوگیا۔ کم سے کم خود وہ یہی سمجھا۔

حکومت ہاتھ میں لینے پر اس کا پہلا اقدام نہایت نقصان دہ نکلا۔ اصل میں اندجان کے قدیم رفیقوں پر اجیر مغلوں نے بڑی زیادتیاں کی تھیں۔ اب اس کے عمائد فریاد کر رہے ہیں کہ انہی مغل دستوں نے ہم کو اور خواجہ قاضی کے متوسلین کو لوٹا تھا۔ انہوں نے اپنے رئیسوں کے ساتھ وفا نہیں کی تو کیا یہ ہمارا ساتھ دیتے رہیں گے؟ اس میں کیا خرابی ہے اگر انہیں پکڑ کر لوٹ کا مال ہمیں واپس دلوایا جائے۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے وہ انہی گھوڑوں پر سوار وہی پوشاکیں پہنے پھر رہے ہیں۔ جو ہم سے لوٹ لے گئے تھے۔ ہم سے چھینی ہوئی بکریاں کاٹ کاٹ کے کھا رہے ہیں۔ کیا آپ ہمیں، ہمارا مال ان سے واپس لینے کی اجازت بھی نہیں دیں گے؟

جب بابر کی آوارہ گردی کے رفیقوں نے بھی انہی عمال کی تائید میں رائے دی تو بابر کو ان کی درخواست ماننی پڑی۔ اس نے مغلوں کو جو خاموش تھے حکم دیا کہ میری رعایا کا جو سامان وہ شناخت کر لیں، واپس کر دیا جائے۔ بابر لکھتا ہے کہ ''ہر چند یہ حکم بجائے خود معقول اور منصفانہ تھا مگر بے موقع عجلت سے دیا گیا، پھر متاسفانہ رائے قائم کرتا ہے کہ ''جنگ اور امور ملک وادی میں بہت سی باتیں بادی النظر میں عقل و انصاف کے مطابق ہوتی ہیں، لیکن بیسیوں مختلف پہلوؤں پر احتیاط سے غور کیے بغیر

ایسا کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔‘‘

شیر سبق سیکھ رہا تھا مگر ابھی تک سیکھے پر عمل نہیں کرتا تھا۔ چار ہزار مغل جو اس کی سپاہ کا قوی ترین حصہ اور اس کی ماں کے متوسل تھے۔ انہوں نے حکم ماننے سے انکار کیا لوٹ کا سامان لے کر کوچ کر گئے۔ ایک کن کٹے سردار کو جو ذاتی طور پر بابر کا احسان مند تھا، بھیج کر مطلع کیا کہ وہ اس کی نوکری چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تنبل کے لشکر میں جا ملیں گے، بابر انہیں روکنے کی کوئی تدبیر نہ کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت سے مغلوں کے اطوار سے جو خود اس کے اجداد کے طور طریق تھے۔ اسے سخت نفرت ہو گئی اور ان کے نام تک سے جسے ’’مغول‘‘ تحریر کرتا ہے، بیزار ہو گیا۔

اپنے ہاتھوں، جنگ کرتے دشمن تنبل کو صحرائی جنگ آزماؤں کی ایسی زبردست کمک بھیج دی۔ تو اب نوعمر بادشاہ کو سوار فوج کے حملے سے اپنی چھاؤنی بچانے کی فکر ہوئی۔ ہر طرح کے ہتھیار، آدمی، جانور جمع کئے۔ پیادہ فوج کی حفاظت کے لئے چمڑے کی ڈھالیں اور چلتے تک تیار کرائے۔ درخت کے گدوں کی باڑیں گاڑ کر مورچہ بندی کی کہ بلا سے سوار فوج کم ہے تو ان کا حملہ ہی روکا جا سکے۔ بایں ہمہ جب تنبل اور اس کے مغل اندجان کو گھیرنے آئے تو بابر نے اپنے دفاعی مورچوں اور چرم پوش پیادوں کو یاد نہ کیا۔ نئی آموختہ مال اندیشی بھی طاق پر رکھی اور اپنی معجون مرکب فوج کو لے کر میدان میں نکل آیا۔ وادی کے دیہات میں جلدی جلدی اپنے دستے پھیلا دیئے۔ ایک دن علی الصباح فریقین کے رسالوں میں ٹکر ہوئی۔ بابر کے آزمودہ کار سردار ڈٹ کر لڑے۔ دشمن کا منہ پھیر دیا۔ بلکہ چند آراستہ خیمے

چھین لئے لیکن آگے تعاقب کرنے سے ابا کیا۔ کیونکہ انہوں نے کہا بھاگتے مغلوں کا پیچھا کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ معرکہ تو معمولی سا تھا مگر بابر نے رفیقوں کی تحسین اور انعام اکرام سے اس کی اہمیت خوب بڑھائی ۔لکھتا ہے کہ میری زندگی کا یہ پہلا میدانی مقابلہ تھا۔ خدائے قدیر نے اپنی عنایت سے مجھے فتح دی۔ میں نے اسے فال نیک سمجھا'' (مگر اس موقع پر بھی اسے یہ خیال نہ آیا کہ علی دوست نے دشمن کا تعاقب کیوں رکوایا دیا؟)

سردیاں آ رہی تھیں۔ بادشاہ اور بادشاہی کے امیدوار دونوں ہی اپنے خدم وحشم کے لئے چھت کی فکر میں تھے۔ بابر نے وسط وادی کی جھونپڑیوں میں ٹھیرنا پسند کیا جہاں شکار مار کر کچھ پکھ شکم سیری کی بھی صورت تھی۔ وہ شکار کا عاشق تھا۔ ندی کے قریب پہاڑی بکرے اور ہرن کثرت سے تھے۔ جنگلی سور کا شکار بھی تھا۔ جنگل کی بکھری ہوئی جھاڑیوں میں جنگلی مرغی اور خرگوش کی کمی نہ تھی۔ یہاں کی لومڑیاں دوسری جگہ سے زیادہ تیز پا ہوتی ہیں۔ بکری اور ہرن کے لئے ہم جنگل چھانتے تھے۔ جھاڑیوں کے بن میں مرغی پر شکرے چھوڑتے، دوشاخہ تیر سے بھی شکار کرتے تھے۔ اس قشلاق میں دوسرے تیسرے دن میں شکار کھیلنے جاتا تھا۔ یہاں جنگلی مرغی خوب موٹی ہوتی ہے اس کے گوشت کی ہمارے ہاں افراط رہی۔''

ساتھی سردار اس جاڑ بھر شکار معرکہ آرائی سے زیادہ خوش نہ تھے۔ چالاک بو نے سلاخ کو تو گھوڑے پر چڑھ کر اپنے برادری والون سمیت اندجان سے زبردستی روکنا پڑا۔ (۲۵)

سب سے بڑھ کر علی دوست، جس نے بابر کو پہاڑیوں میں سرگرداں پھر نے سے نجات دلائی، حجتیں اور بار بار تقاضے کرتا تھا۔ کہ شدید سردی سے بچنے کے لئے دشمن سے عارضی صلح اور اندجان میں واپس چلنا چاہیے۔ بابر اسے وجدانی طور پر غلط سمجھتا تھا۔ مگر علی دوست سے جبراً اپنی بات منوانے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ آخر اسی کی رائے ماننی پڑی۔ ۱۴۹۹ء کا خاتمہ مخدوش آثار میں ہوا۔ سمرقند ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ فرغانہ پر دعوے کے لئے علاقی بھائی جہانگیر طاقتور دشمنوں کا آلہ کار بنا ہوا تھا ادھر وقتی صلح کی بجائے علی دوست نے باقاعدہ صلح نامہ کی شرطیں طے کرلیں۔ بابر کی طرف سے تنبل کو دوستانہ پیام سلام پہنچائے۔ قیدیوں کا تبادلہ کرایا اور شرط مان لی کی بابر صرف اندجان اور سیر دریا کے بائیں کنارے پر حکومت کرے، اخسی اور دائیں رخ کا علاقہ تنبل، جہانگیر، سلطان علی جتھے کے حوالے کردیا جائے۔ طرہ یہ کہ بابر کی اتنی سی عمل داری بھی علی دوست کے رحم وکرم پر مبنی تھی اور جب تک دشمن سیر کی دوسری طرف سامنے خیمہ زن تھا، بابر کو علی دوست کی خاطر رضا جوئی کے بغیر چارہ کار نہ تھا۔

آگے چل کے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ میدان سیاست کے نئے شاطر کو اپنے اصلی ورثے یعنی وادی فرغانہ سے دست بردار ہونے پر تیار کرلیا گیا۔ بشرطیکہ سمرقند اسکے ہاتھ آجائے۔ انہی ایام میں امرائے سمرقند کے قاصد اس کے پاس آرہے تھے اور مصر تھے کہ وہ ان کی مدد سے اس دارلسلطنت میں واپس آئے۔ امیدیں باندھنے والے لڑکے کو یہ خفیہ بلاوے عین خدا ساز نظر آئے۔ سمرقند پر حکمرانی کی آرزو کے ساتھ اپنے طالع ساز گار کا بھروسہ بھی ضرور شامل تھا اور یہ اذعان کہ العزم منا

والاتمام من اللہ۔ غرض علی دوست نے تمبل سے مل کر وطنی شہر اندجان حوالہ کر دینے کی قرارداد کر لی اور اس مرتبہ یہ تحویل خود خوش عقیدہ بادشاہ کی رضامندی سے عمل میں آئی۔ بابر کے ذہن میں نہ آیا کہ تیمور کے تخت پر بیٹھ کر حکمرانی کرنے کا اب کوئی امکان نہیں رہا۔

پندرہویں صدی کے اواخر میں یورپ والوں میں، جنہیں بابر نے کبھی نہیں دیکھا، بعض تبدیلیاں ہوتی معلوم ہو رہی تھے یہ سچ ہے کہ پیٹر زیبا جیسے اطالیہ میں لب دریا فورنو دو کی گمنام سی جنگ میں غیر معمولی جاں بازیاں دکھانے پر بہادر (نائٹ) کا خطاب ملا، اسکا طریق عمل ابھی تک گزرنے والے قرون وسطیٰ ہی کے مطابق تھا۔ خدا پر بھروسہ کر کے اپنے بادشاہ کی بے چون و چرا اور بلا خوف ملامت اطاعت کرنا ہی اس کا شعار تھا لیکن اسی زمانے میں ایک غیر معروف سا نوجوان سفیر نکولو کمیاولی بھی ریاست فلورنس کی طرف سے دوبار فرانس میں بھیجا گیا تھا جس نے دوران سفر میں شاہ وشہریار کی جنگوں کے بے سود ہونے کا مشاہدہ کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ اطالیہ کی ریاستیں ایک موہوم کلیسا اور سلطنت کی حدود کے اندر رہ کر بھی ذرا ذرا سی بات کے لیے لڑ کر برباد ہو رہی ہیں۔ کمیاولی کی باریک بین نگاہ میں اس وقت بظاہر نہ کوئی ہمہ گیر کلیسا باقی تھا نہ سلطنت جو کچھ ہوتا تھا وہ قدرتی یا محض تقدیری اسباب ہی کا نتیجہ تھا۔ تاریخ کا باقاعدہ مطالعہ کرنے سے اسے یقین کامل ہوا کہ بادشاہ بے دردی سے اپنی شخصی مرضی پر چلیں تو قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا موروثی ظل اللہ بادشاہوں کا دور ختم ہوا۔ خود اوپر آنے والے مطلق العنانوں کا زمانہ سر

پر تھا۔

کمیاو لی کے دائرہ فکر سے باہر، دیگر مقامات یعنی پرتگال کی بندرگاہوں میں نئی نئی سرگرمیوں کا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ واسکوڈ گاما بعید ترین مشرق سے زندہ سلامت واپس آیا اور ساحل مالابار، ہندوستان کی بارگاہ کالی کٹ سے جہاز لدے پھندے لایا۔ یہ علاقہ اسی نصف دنیا میں تھا جسے چند سال پہلے پاپائے رومہ کے فتوے نے دریافت حال اور حکمرانی کے لئے بادشاہ پرتگال کے نام لکھ دیا تھا۔ پھر گریگوری تقویم کے سال ۱۵۰۰ء میں ڈگاما کے ہم وطن پیڈرو کیرال نے کوئی درجن بھر بادبانی جہاز اور بہترین ملاحوں کے ساتھ بحرنوردی کی تیاری کی تاکہ اپنے بادشاہ کے لیے نئی تجارتی بندرگاہیں اور ہندوستان میں مزید علاقہ حاصل کرے۔

یہ اس شخص کے جسے عہد جدید کی تاریخ میں پہلا، مغل اعظم کہا گیا شمالی ہند کو فتح کرنے سے ۲۶ برس قبل کی بات ہے۔

باب دوم:: سمرقند سے اخراج

عورتوں کا مقام

جس وقت بابر خلاف مرضی اندجان کے قلعے میں لایا گیا تو وہ تینوں خواتین جو برابر اس کے ہمراہ پڑاؤ سے پڑاؤ میں ساتھ رہی تھیں۔ اپنے پرانے دالانوں میں اتریں اور اس جاڑے میں کچھ روز آرام کا ے۔ مرد رشتہ داروں کے برخلاف خاندان کی سب مستورات بابر کی وفادار رہیں، سوائے ایک کے۔ اسکی دلا ورنانی بھی اپنے برج میں متمکن ہوگئی تھے۔ اب اس پر بڑھاپا آرہا تھا۔ علی دوست کی نسبت بدظنی کی باتوں سے کہ یہ بھی یعقوب کے متوفی بیٹے کیطرح تمہیں سونے کی زنجیریں ڈال کر محض برائے نام بادشاہ بنائے ہوئے ہیں، وہ بابر کو فکرمند کرتی رہتی تھیں۔ بہن خانزادہ بیگم کی جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، سمرقند واپس جانے کے منصوبوں میں اس کی شریک تھی۔ ماں یاد دلاتی رہتی تھی کہ اب وہ انیس سال کا ہوگیا ہے اور شادی کرنے کے تقاضے کرتی تھی۔

اس اثنا میں معلوم ہوتا ہے بابر اپنی تعلیم کی کمی پوری کرنے سے غافل نہیں رہا۔ پچھلی دفعہ پہاڑیوں پر جانے میں بھی دل پسند کتابیں ساتھ لے گیا تھا۔ پھر شہر میں خواجہ احرار کے مرید، بعض مذہبی لوگ بھی اس بات سے ملنے آئے جنہیں بابر سے بہت کچھ امیدیں تھیں۔ نوجوان بادشاہ اپنے سادہ سپاہیانہ افکار کو کبھی کبھی اشعار کی

شکل میں لانے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ جب موج آتی ترکی زبان میں جو عوام کی بولی تھیں اور کبھی فارسی میں جو اہل علم کی زبان ہوگئی تھی۔ اسکا کوئی ندیم عشق و محبت یا عورتوں کے باب میں گفتگو نہ کرتا تھا۔

آخر اس ماں نے اس کی دلہن کو لانے کا انتظام کرایا۔ شہزادی عائشہ اپنی دایہ، نوکروں اور جہیز کے ساتھ سمرقند سے چل کر آئی۔ اب وہ پوری جوان اور جب تک بابر نے شوہر کی حیثیت سے اس کی نقاب چہرے سے ہٹائی، گویا ایک غیر خاتون تھی۔ یہ رسم بڑی شاہراہ پر خجند میں ادا ہوئی۔ اسے حاصل کرنے کے ابتدائی شوق کے بعد ان کے درمیان سرد مہری سی پیدا ہوگئی۔ بابر کی طرف سے شرمیلاپن اور بیوی کی طرف سے کچھ ناگواری رہی۔ ممکن ہے بہن کی ہمہ وقت رفاقت بھی اسے دلہن سے بے تکلف ہو جانے میں مانع آئی ہو۔ بقول خود "میں اس کے پاس دسویں بیسویں دن جاتا تھا، بلکہ یہ رکاوٹ ایسی بڑھتی گئی کہ پھر والدہ ہی مجھے کسی قصوروار کی طرح دھکیل دھکیل کر مہینہ، چالیس دن میں بھیجا کرتی تھیں۔ بیوی سے تغافل کی ایک اور وجہ بھی وہ بیان کرتا ہے کہ انہی ایام میں اسے چھاؤنی بازار کے ایک نوعمر لڑکے سے بڑی انسیت پیدا ہوئی اس کا نام بھی بابری تھی۔ یہ جذبہ قریب قریب دیوانگی کے درجے تک پہنچا کہ وہ اس کی یاد میں محو رہتا اور شعر کہتا تھا۔ لکھتا ہے کہ قبل ازیں مجھے کسی کے ساتھ ایسی شیفتگی نہیں ہوئی۔ حالات روزگار نے عشق عاشقی کی باتیں سننے کبھی مہلت نہیں دی تھی۔ ان دنوں جو شعر میں نے لکھے ان میں ایک بیت بتاتی ہے کہ میں کس درجہ ذلیل وخوار عاشق ہوں۔ بابری میرے پاس کمرے میں آتا تھا تو

شرم کی وجہ سے میں اس سے آنکھیں چار نہ کرسکتا تھا۔

میں معشوق کو دیکھ کر شرما جاتا ہوں

لوگ مجھے دیکھتے ہیں میں دوسری طرف دیکھتا ہوں (۲۶)

میں برمحل باتیں کیا کرسکتا تھا کہ اس کا دل پہلے جب کہ خود اپنا دل قابو میں نہ ہوتا تھا۔اس کے آنے کا شکریہ اور ٹھہرے رہنے پر اصرار تو اور بھی دشوار بات تھی ۔معمولی تواضع کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنے کی بھی مجھ میں طاقت نہ رہتی تھی ۔اسی شیفتگی سے محسور ہونے کے زمانے میں ایک دن چند رفیقوں کے ساتھ گلی سے گزر رہا تھا کہ یکا یک اس کا سامنا ہو گیا۔میں آنکھیں چار نہ کرسکا،کوئی بات میرے منہ سے نہ نکلی ۔شرمندگی اور کرب کی حالت میں برابر سے نکلا چلا گیا۔

جوانی کی دیوانگی اور جذبات کی اس طغیانی میں، میں کوچہ و بازار، باغوں، تاکستانوں میں برہنہ سر، برہنہ پا پڑا پھرتا تھا۔کبھی مجنونانہ باغوں اور مضافات شہر سے نکل کر پہاڑیوں میں چلا جاتا ۔یہ آوارہ گردی میرے اختیار کی چیز نہ تھی اور نہ چلنے یا ٹھہر جانے پر مجھے کوئی قابو تھا۔دوستوں، ملاقاتیوں کی تعظیم و تکریم یا اپنی خودداری کی ذرا پروا نہ رہی تھی۔

''شوق نے مجھے از خود رفتہ کر دیا نہ جانتا تھا

کہ یہ ایک پری چہرہ کے عشق کا کرشمہ ہے''

اسی شعر سے بابر نے لڑکے کے ساتھ اپنی شیفتگی دور کی اور پھر بظاہر ایسے جذبے نے کبھی اسے پریشان نہیں کیا۔تاہم اسی نے عائشہ بیگم سے اسے محروم کیا جو ایک

لڑکی کی ولادت کے بعد اسے چھوڑ کر چلی گئی ۔لڑکی چند مہینے میں فوت ہوگئی ۔پھر عورتوں کے باب میں متوکلانہ بے پروائی سی بابر کے مزاج میں جگہ پا گئی حالانکہ وہ اس کے ساتھ گہری موانست رکھتی تھی ۔عرصے تک معلوم ہوتا ہے اس طرز عمل نے بچوں پر بھی جو دوسری بیویوں سے ہوئے اثر ڈالا۔

عائشہ کے زمانہ حمل میں اس بے لطفی اور بابری سے شیفتگی ہی کے دوران میں نوجوان بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اس کا سب سے بڑا طرفدار ہی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔اب ایسان بیگم کی بار بار تنبیہ بھی خبردار کرنے کے لئے ضروری نہ تھی کیونکہ اتنے دن وہ علی دوت کی سیرت بخوبی سمجھ گیا تھا۔"میر علی دوست شاہی خاندان سے اور میری نانی شہزادی ایسان دولت کے رشتے سے میرا رشتہ دار ہوتا تھا۔اس کی فطرت میں مطلق العنانی تھی۔اپنے باپ کے زمانے سے میں اس کی بہت پاس داری کرتا رہا۔لوگ کہتے تھے کہ وہ بڑا کارگزار آدمی ہے۔لیکن سالہا سال جب وہ میرے ساتھ رہا میں نے اپنے لئے اس کی کوئی کارگزاری نہیں دیکھی اسے مقناطیسپ پتھر سے سحر کرنے کا بھی ادعا تھا لیکن باز اڑانے کے سوا کوئی ہنر نہ جانتا تھا ۔زرستانی، فتنہ انگیزی ،ریاکاری درشت روئی البتہ اس کی صفات تھیں۔"

ایک شخص بابر کا سچا وفادار تھا۔وہ اور ایسان اندجان کے چھوٹے سے دربار میں علی دوست کی ریشہ دوانیاں بھانپ رہے تھے۔ بابر لکھتا ہے : "اندجان میں پلٹ آنے کے بعد سے اس طرز عمل بدلا۔میری پر مشقت چپاولی جنگ کے

رفیقوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگا۔ ایک کوتو نکال باہر کیا اور دبلے (لاغری) کو قید میں ڈال کر مال اسباب چھین لیا۔ قاسم بیگ سے بھی اس نے پیچھا چھڑایا۔ ایک دفعہ اعلان کیا کہ خواجہ قاضی کا عزیز دوست خلیفہ شہید قاضی کے بدلے میں اسے (علی دوست کو) قتل کرنا چاہتا ہے۔ ادھر اس کے بیٹے نے وہ طور اختیار کئے گویا آئندہ بادشاہ ہونے والا وہی ہے۔ امرا کو باریاب کرتا۔ سب کو کھانے کھلاتا اور اپنے لئے شاہی درباروں کے سے آداب ملحوظ رکھواتا تھا۔ باپ اور بیٹے کو یہ جرات اس لئے تھی کہ تنبل کی پشت پناہی پر بھروسہ رکھتے تھے۔

واقع تنبل کی فوجیں دریا پار پڑی تھیں کہ یہ صلح نامے کی شرطوں کے مطابق تھا۔ اس حالت میں بابر اپنے باقی وفاداروں کی مدد سے علی دوست کے درباری گروہ پر ضرب نہ لگا سکتا تھا اور نہ اندجان کو ایسی حالت میں چھوڑنے کا خیال کر سکتا تھا۔ میرے لیے یہ عجیب طرح کا نازک موقع تھا۔ علانیہ کوئی زبان پر نہ آتی تھی مگر وہ مجبور تھا کہ باپ بیٹے کی اہانت آمیز حرکتیں برداشت کروں۔''

بابر یہ سب زیادہ مدت تک برداشت کر سکتا تھا اور غالباً سازش کرنے والے بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے۔ انہیں بجا طور پر یقین تھا کہ علی دوست کے بیٹے کو تخت اندجان لینے کی تیاریاں کرتے وہ دو چار ہفتے اور دیکھے گا اور پھر مزاحمت کئے بغیر نہ رہے گا اور یا ان سے الگ ہو جائے گا۔ مگر بابر نے ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کی بلکہ اسے اندجان سے ہٹانے کے لئے جو طعمہ دیا گیا تھا، اسے قبول کر لیا۔ ممکن ہے اس چال میں ایسان کی عیاری کا دخل ہو۔ چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ (''صلح

کرتے وقت جو صورت میرے لئے پیش کی گئی تھی'') میں سمرقند فتح کرنے کی کوشش کروں گا اور لشکر کشی کے لئے اپنے آدمیوں کو طلب کیا۔

ادھر سمرقند میں بھی کچھ اسی قسم کے واقعات پیش آئے جیسے بابر کے جانے کے بعد اندجان میں گزرے تھے۔ سلطان علی کی ٹولی جس کا شہر پر قبضہ ہوا۔ وہاں کے اشراف سے طرح طرح سے مالیہ کھینچ رہی تھی۔ پھر وہاں کے ممتاز خاندانوں کے پاس نواح کے باغ اور مزرعے تھے۔ وہ امیر تیمور کے زمانے سے ترخان کے لقب سے ملقب تھے۔ انہیں خاص مراعات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ یہ لوگ روپیہ اور زمین کے نقصان کیساتھ بے عزتی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ بعض جوان رئیس زادوں نے اپنی جاگیروں میں ہتھیار سنبھالے۔ ادھر سے مغل دستے نے جنگ میں حصہ لیا۔ سلطان علی کے سرداروں نے باغی ترخانوں کو شکست دی۔ (بابر لکھتا ہے کہ اپنے آخری زمانے میں شہزادہ سلطان علی نے صرف اسی چھوٹے سے معرکے کو اچھی طرح سرانجام کیا'') باغی ترخانوں کو بابر کی سمرقند پر صدر روزہ بادشاہی کی فیاضیاں یاد آئیں اور اب انہوں نے عاجلانہ قاصد دوڑائے کہ بابر آئے اور انکی مدد سے تخت پر دوبارہ قبضہ کرے۔

فریب اور سازشوں کی گرم بازاری میں قاصد یا ایلچی بھی ایسا درکار تھا جس کی بات کا یقین کیا جا سکے۔ سمرقند سے آخر میں جو ایلچی آیا وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ یعنی ایک خاندانی مغل سردار جو اندجان میں خواجہ قاضی کی حمایت میں لڑ چکا تھا۔ بابر نے بھائی جہانگیر میرزا کے پاس بھی اسی مغل سردار کو عاجلانہ اسی روانہ کیا کہ اس کٹ پتلی

بادشاہ کو مطلع کر دے کہ قرارداد کے مطابق میں فرغانہ اسے دے کر سمرقند جا رہا ہوں۔ چنانچہ میں اپنے مسلح سپاہیوں کو لے کر روانہ ہوگیا۔" یہ جون کا مہینہ تھا۔ یہاں تک تو ہمارے شیر نے نانی کی نصیحت پر عمل کیا لیکن فوج پاس ہو تو اس سے دشمن پر حملہ کئے بغیر نہ رہا جاتا تھا اور ایسا صبر کرنا آئندہ بھی کبھی نہ آیا۔

یورپ میں نوجوان تلوریا بیبیار بھی اسی قسم کی جرات دکھانے کا مادہ رکھتا تھا لیکن مغربی آئین شجاعت کے تحت میں اس کی تلوار حق کی راہ میں صرف بادشاہ کے حکم سے اٹھتی تھی۔ ایشیا کے مردان جنگ اور بھی بڑی ذمہ داریوں کے تحت میں تھے۔ بابر کے فرائض کا تقاضا تھا کہ لشکر کے سپاہی اور وادی کے تاجیک باشندے، غرض اپنے سبھی متوسلین کی حفاظت کا یکساں خیال رکھے۔ ایک طرف مغول کی قدیم روایت اسے اپنے جد اعلیٰ چنگیز کے قانون لیسا کو ابھی تک یاد دلاتی تھی اور دوسری طرف "یاسا" سے بڑھ کر اسلامی قانون کی گرفت تھی۔ بے باک وسفاک امیر تیمور نے ان روایات کے باہمی اختلاف کا فیصلہ اس طرح کیا کہ رسمی طور پر دونوں کو تسلیم کیا لیکن اپنے عظیم مقاصد کو خود ہی پورا کر لیا اور وسط ایشیا میں ایک نیا مرکز تہذیب اپنے دارالسلطنت سمرقند کو بنالیا۔ وہ متاخر سلطنت روما کی طرح، اسے ایشیا میں وحشی اقوام کو روکنے کے لئے مستحکم حصار بنانا چاہتا تھا اور چینی اژدہے کے اقدام سے بچانے کی بھی فکر تھی جسے وہ آخری ایام میں مغلوب کرنے چلا تھا کیونکہ چینی اثرات اس وقت کاشغر اور تبت تک نفوذ کر چکے تھے جو بابر کی وادی فرغانہ سے چند روز کی مسافت پر تھے۔

غرض بابر ایک طرف تو اعتقاد صحیح سے خدا کی مرضی کے سہارے عمل کرنا چاہتا تھا ۔دوسری طرف اپنے ملک اور ''اپنے لوگوں'' کی ذمہ داری کندھوں پر تھی (اگرچہ یہ لوگ کسی معنی میں ایک قوم نہ تھے)اور تیموری کھوئی ہوئی سلطنت یا ملک یا تہذیب کو جس کا مرکز سمرقند تھا، بحال کرنے کی بھی دل میں لگن تھی۔اسی لیے یہ شہر اس کے لئے پناہ گاہ سے کچھ زیادہ ہو گیا تھا اور اب اپنی اندرونی آویزشوں سے دعوت دے رہا تھا کہ تیموری آرزؤں کو بر لانے میں دوسرے اہل خاندان کی ناکامی کی تلافی وہ کرے۔بابر نے مطلق نہ سوچا کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ بلکہ بے تامل اس طرف چل پڑا۔اسی ماہ جون میں سب سے خطرناک صحرائی یعنی ازبک بھی مغرب کی طرف سے سمرقند پر پیش قدمی کر رہے تھے۔(اس زمانے میں وسط ایشیا کے القاب و خطابات حالیہ عہدہ و منصب کی بجائے زیادہ تر سابقہ تاریخ بتاتے تھے۔''سلطان'' کالفظ عربی سے آیا ہے۔''شاہ'' اور ''میرزا'' فارسی سے۔اور ''خان'' ترکی مغلی سے ۔عام طور پر یہ محض اعزازی ہوتے یا خاندانی امارت کی نشانی اور یا انہیں کوئی از خود اختیار کر لیتا جیسے ایک مجہول الاحوال لقب چاق ترک نے جو قندز کا مالک بن بیٹھا تھا اپنا لقب خسرو شاہ بہ معنی بادشاہ فرماں روا، رکھ لیا۔تاہم کسی مغل نام کے ساتھ ''خان'' کے معنی شاہی خاندان والے کے ہیں جیسے تیموریوں میں ''میرزا'' کے آگے ''بیگ'' یا ''بک'' کا مترادف ہم نے امیر یا سردار لکھا ہے۔بابر ناموں کے ساتھ عموماً پورا خطاب دیتا ہے۔ہم نے اسے مخفف کر دیا ہے۔عورتوں کے باب میں ''خانم'' اور بیگم'' شاہی خاندان ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔جن کا انگریزی میں پرنس

(شہزادی) ترجمہ کیا گیا ہے۔لفظ منگول کو بابر موگل، مغل، مغول تحریر کرتا ہے۔ہم بھی آئندہ اوراق میں اسی کی پیروی کریں گے۔)

شیبانی خاں کا رحم

ہمارے شیر نے عقل مندی کی کہ اہل وعیال کو چھوڑ کر چپ چاپ اندجان سے نکل آیا۔علی دوست کو جو اس کی نگرانی کر رہا تھا۔خبر تک نہ ہوئی۔صرف بھروسے کے ملازمین ساتھ لئے جن میں خواجہ، اس کا کتاب دار اور فوج رکاب کے جوان تھے۔ اس قسم کے نمک حلال رفقا میں اس کا زرہ بکتر اتار کر سونا ممکن تھا۔کسی کی وفاداری جانچنے کے بارے میں اب وہ غلطی نہ کرسکتا تھا۔اب سب احتیاطوں پر بھی اس کا ایک عسکری کھسک گیا کہ سمرقند میں سلطان علی کو اسکے آنے کی خبر کردے۔

کاروانی شاہراہ پر اس کی لشکر گاہ چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ ہر ندی نالے کے پل یا گھاٹی سے گزرتے ہوئے تاڑنے والے اس کی جمعیت کا تخمینہ لگا سکتے تھے۔اور یہ خبر بھی مشتہر ہو چکی تھی کہ عمر شیخ میرزا کا بیٹا اپنے شمشیر زنوں کو بلوا رہا ہے۔ہر رات پڑاؤ پر لوگ بھرتی ہونے آتے یا قاصدان رئیسوں کی طرف سے جو ابھی دور ہی رہنا مصلحت سمجھتے تھے، دوستی کے پیام سلام لاتے تھے۔قاسم بیگ اپنی جمعیت لیکر آملا اور جنگ چپاولی کے پرانے رفیق جنہیں علی دوست نے تنگ کر کے نکالا تھا۔ ناخواندہ ہی آن آن کر شریک لشکر ہو گئے۔پھر یکا یک خود علی دوست اپنے بیٹے اور عملے کو لے کر ایک دن حاضر ہوا اور اسے محض حسن اتفاق پر محمول کیا۔بابر جانتا تھا کہ یہ

کہنا صحیح نہیں مگر خوش طبعی سے تائیدا کہا ''ہاں کیا اتفاق ہے۔تم اس طرح آئے گویا ملنے کی قرار داد ہوگئی تھی۔'' اصل میں اب اس کے اور علی دوست ک درمیان قوت کا توازن برابر ہو گیا تھا۔

قنبر علی سلاخ کے ننگے سر ننگے پیر آنے پر بابر نے بہت مزا لیا۔ یہ شیخی خورہ مشیخت سے تنبل کے پاس تنہا جسی گیا تھا۔اس نے پکڑوالیا اور اسکی جاگیروں پر جا چڑھا۔ بابر نے ایک ترکی مثل نقل کی ہے جس کے معنی ہیں ''دوست پر اتنا بھروسہ نہ کر کہ تیری کھال میں بھس بھر دے۔''(۲۷)

سمرقند کے قریب ایک سردی میں منزل ہوئی تو وہاں پانسہ علی دوست کے خلاف پلٹ گیا۔شہر کے ترخان اور امرا کا اپنے حالی موالی سمیت یہیں پڑاو تھا۔انہوں نے بتایا کہ ایک بزرگ خواجہ کو شہر میں چھوڑ آئے ہیں جو عام باشندوں کی طرف دار بنانے میں ساعی ہے۔اتنی بات سب جانتے تھے کہ تیمور کے شہر کی فصیلوں پر حملہ کامیاب نہ ہوسکتا۔اندر والوں کے مل جانے ہی سے راستہ مل سکتا تھا۔لشکر گاہ میں بابر دربار لگا کر اجلاس کرتا تھا۔علی دوست میں بہر حال قوت تمیزی تھی۔ وہ اندیشہ مند اور شاید شرمندہ ہو کر بابر کی خدمت میں آیا اور ملازمت سے علیحدہ ہونے کی اجازت مانگی ۔بابر نے بے تامل منظوری دی باپ بیٹے رخصت ہو کر تنبل کے پاس گئے اور اس کی ملازمت کر لی ۔وہاں باپ کے ہاتھ میں کچھ روز بعد سرطان کا پھوڑا نکلا اور وہ اسی سے مرا۔ بیٹا وہاں سے بھی نکل گیا تھا اور آخر ازبکوں نے پہاڑوں میں پیچھا کر کے اسے پکڑا اور اندھا کر دیا۔بابر کہتا ہے ''نمک فلاں کس چشم

ہائے اور گرافت'' (یعنی کسی کے نمک نے اس کی آنکھیں پھوڑیں) بایں ہمہ اس موقع پر سمرقند اس کے ہاتھ نہ آیا کہ حالات سیر بین کے نظاروں کی طرح ذرا ذرا سی دیر میں رنگ بدلتے اور کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے۔

مغرب کی طرف سے ازبک بڑھے آ رہے تھے۔ خطرے کی پرچھائیں اس طرح پڑ رہی ہے جیسے میدان میں شاہین کا سایہ چڑیوں کو نظر آیا ہے۔ اس آوازے کے ساتھ کہ شیبانی خان نزدیک ہے اہل سمرقند کے باہمی جھگڑے، نیز دوستی کے عہد و پیان ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ سلطان علی میرزا کی ماں خود ہی آن بان والے ازبک رئیس کی زوجیت میں آنے کی درخواست کرتی اور سمرقند میں اسے بلاتی ہے۔ سلطان ہچکچاتا ہے۔ پھر ایک کم زور بچے کی طرح ضد کر کے میدان کے باغ میں ازبک سے ملاقات کرنے چلا جاتا ہے۔ شیبانی کوئی خاص مہربانی نہیں کرتا۔ اپنی مسند کے پائیں میں بٹھاتا ہے اس کی سازشی ماں کو اپنے خیمے میں لے جاتا ہے۔ سلطان علی کو جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور وہ شیبانی سے بچ کر نکلنا چاہتا ہے لیکن چند آدمی اس کے ہمراہ کیے جاتے ہیں جو مرغ زاروں میں اس کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح ترخانوں کا حامی خواجہ یحیٰی ایک سڑک پر دور باہر لے جا کر ہلاک کیا جاتا ہے اگرچہ شیبانی کے ملازم سردار اس کے قتل سے انکار کرتے ہیں۔ بہر حال یہ بزرگ خواجہ اور تیموری شہزادہ سلطان علی معدوم ہو گئے۔ تو اب فرمان دہی کے لئے صرف شیبانی خاں کی آواز رہ جاتی ہے۔

بابر، جنوب میں شہر سے دور راستے پر ہے، مگر یہ خبریں گاؤں گاؤں گشت کرتی اس

تک پہنچتی ہیں۔ انہیں سن کر سر بر آوردہ تر خان اسکا ساتھ چھوڑ کر خسرو شاہ کا آسرا تلاش کرتے ہیں جو پہاڑوں کے دوسری جانب قندز اور حصار کا مالک اور تنہا وہی محافظت کرنے کے قابل رہ گیا ہے۔ بابر اس کے پاس جانے سے انکار کرتا ہے اور اپنی وادی کی طرف پلٹتا ہے جس پر تنبل قابض ہو گیا ہے۔ وہ اپنی چپاولی جنگ کے رفیقوں کے ہمراہ راستہ کاٹ کر کوہ سیاہ (۲۸) کی پہاڑیوں میں ایک تنگ گھاٹی سے گھسا، جس میں خوفناک غار اور کراڑے تھے کہ آدمی یا جانور گرے تو وہیں ہلاک ہو جائے۔ آخر ایک خوش فضا جھیل کے کنارے ان قبائل میں پہنچ جاتا ہے جنہوں نے پہلے بھی اسے پناہ دی تھی۔ یہاں اسے ایک قلعہ ملتا ہے جو غیر آباد پڑا تھا۔ ساتھ والوں کی جن میں سلاخ بھی ہے۔ گنتی کی جاتی ہے تو دو سو چالیس آدمی نکلتے ہیں۔ اب وہ پھر بے گھر اور اس خطے میں تیمور کا اکیلا وارث شہزادہ رہ گیا ہے۔ پہاڑوں کے نیچے ازبک شوارع عام سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی تعداد تین سے چار ہزار تک ہے۔ کچھ مدت میں شیبانی سمرقند کی فصیلوں میں اور مستحکم ہو جائے گا۔ لیکن۔۔۔۔۔ میدان کے باغ سے خبر ملتی ہے کہ۔ ابھی یہ ازبک سردار احتیاطاً شہر کے باہر پڑاؤ میں ہے۔ ہنوز سمرقند والے اس کی خاطر جنگ نہیں کریں گے البتہ چند روز میں وہ ضرور شہر پر متصرف ہو جائے گا۔ لہذا اگر بابر کسی طرح اس وقفے کے اندر سمرقند کے اندر پہنچ جائے تو ممکن ہے وہاں کے عوام پھر اس کے لئے سینہ سپر ہو جائیں۔ اس کے سردار پہاڑی قلعے میں یہ بحث مباحثے کرتے ہیں۔ بابر ان کی رائیں سنتا اور آخر جواب دیتا ہے کہ ایک دفعہ شہر پر قبضہ ہو جائے تو پھر اللہ مالک ہے

جو چاہے کرے۔''

بابر نے بے خبر شہر کو جالینے کے شوق میں جو حملہ کیا، اس میں خفت اٹھانی پڑی۔ بڑی فصیلوں کی حفاظت پر سپاہی تعینات اور پورے چوکس تھے۔ قسمت آزمائی کرنے والوں کو جس تیزی سے آئے تھے، اسی طرح الٹا جانا پڑا۔ اپنے پہاڑی مامن میں پہنچ کر بابر نے پھر حقیقت شناسی کے ساتھ اپنے حال پر نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ اپنے حریف شیبانی خاں جیسے ہنرمند و آزمودہ کار حریف کے مقابلے میں وہ ناتجربہ کار نوجوان ہے۔ ازبک کا خوف شہر والوں کو اس کی مدد کرنے میں مانع ہے قلعے کے پاسبان چوکنے ہو گئے ہیں۔ اور دوسرا چھاپہ مارا گیا تو تیار ملیں گے۔

یہ سب تو تھا لیکن اب اس لشکر میں خوراک کم ہوتی جاتی تھی۔ ایک دن اسی کے پاس چند سردار بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کام نہ تھا نہ کوئی تجویز پیش نظر تھی۔ سمرقند کے حملے کے بارے میں غیبتیں کرنے کو رہ گئی تھی۔ اتنے میں بابر نے بات کاٹ کر سوال کیا کہ اچھا یہ تو کہو ہم خدا کی عنایت سے سمرقند کب تل لے سکیں گے؟'' کسی نے کہا اگلی گرمیوں میں، یہ خزاں کے آخری ایام تھے۔ پھر بعض نے چالیس، کسی نے تیس کسی نے بیس دن کہے۔ سردار کوکلتاس (۲۹) نے کہا۔ ہم چودہ دن میں اسے لے لیں گے۔ خدا نے اس کی بات سچ کر دکھائی۔ واقعی ٹھیک چودہ دن میں ہم نے سمرقند جیت لیا۔''

''اس گفتگو کے بعد ہی میں نے ایک عجیب خواب دیکھا کہ سید اولیا حضرت (خواجہ عبید اللہ) احراری میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے استقبال کیا اور وہ

اندر آ کر بیٹھے۔ ان کے لئے دستر خوان بچھایا گیا مگر اس میں کوئی بات حضرت خواجہ کے مزاج کے خلاف ہوئی۔ میں نے اشارہ کیا یہ قصور میرا نہیں ہے۔ حضرت سمجھ گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ ہم ایک مکان کے دالان میں ہیں۔ وہاں حضرت نے میرا ایک بازو پکڑ کر مجھے اتنا اٹھایا کہ ایک پاؤں زمین سے اوپر اٹھ گیا۔ پھر ترکی میں کہا ''ایک ولی نے سمرقند کو دیا۔ (۳۰)

''اس کے بعد اگر چہ ہمارا منصوبہ چھپا ہوا نہ تھا ہم نے خدا پر بھروسہ کیا اور دوبارہ سمرقند پر چلے۔ خواجہ ابوالمکارم (۳۱) میرے ساتھ تھے (شاید خواب میں جو اشارہ تھا، اس کی تعمیل کے لیے (ہم آدھی رات کو خیابات کی گہری خندق کے پل پر پہنچے اور وہاں سے ستر اسی آدمیوں کو سیڑھیاں دیکر بھیجا کہ غار عشاق کے مقابل فصیل پر چڑھ کر اندر سے فیروزہ دروازے کے پاسبانوں پر حملہ کریں اور قابو پا کر مجھے خبر بھیجیں۔ چنانچہ یہ جوان چڑھ گئے اور پاسبانوں کو خبر ہوئے بغیر اندر پہنچ کر پہرہ داروں کو مار ڈالا اور تبر سے قفل توڑ کر پھاٹک کھول دیا۔ لمحہ بھر میں میں پہنچا اور شہر میں داخل ہو گیا خانقاہ پر جا کر ٹھیرا تو احمد تر خان بھی کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں آ گیا۔ اکثر شہر والے پڑے سوتے تھے۔ مگر بعض دکانداروں نے دکانوں سے جھانک کر دیکھا اور مجھے دعائیں دیں۔ شہر بھر میں خبر پھیلی تو لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور میرے ساتھیوں کا خیر مقدم کیا۔ پھر انہوں نے گلی گلی، کھائی کھائی ازبکوں کو ڈنڈے اور پتھر مار مار کے اس طرح مارا جیسے باولے کتے کو مارتے ہیں۔ ازبک حاکم شہر خواجہ یحییٰ کے مکان میں رہتا تھا۔ وہ فرار ہو کر شیبانی خان کے پاس

پہنچ گیا۔

میں خانقاہ کے دروازے میں استادہ تھا۔ صبح ہونے تک ہر طرف شوروغوغا مچتا رہا۔ بعض تاجر و عمائد شہر خوشی خوشی میرے پاس آئے اور جو کچھ کھانا تیار تھا۔ لا کر پیش کیا۔ دن نکلے معلوم ہوا کہ آہنی دروازے کے چھتوں میں ازبکوں نے پناہ لے رکھی ہے۔ اور وہاں لڑائی ہو رہی ہے۔ کوئی پندرہ آدمیوں کو لے کر میں گھوڑے پر سوار ادھر چلا۔ لیکن میرے پہنچنے سے پہلے شہر کے بلوائی جو لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ انہیں دروازے سے باہر نکال چکے تھے۔ سورج چڑھتے شیبانی خاں رات کو ماجرا سن کر گھوڑے پر سوار ادھر آیا۔ کوئی سو ڈیڑھ سو آدمی اس کے ہمراہ تھے۔ موقع تو بہت اچھا تھا۔ مگر میرے پاس معدودے چند جوان تھے۔ شیبانی یہ دیکھ کر کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ آہنی دروازے سے میں قلعہ (ارک) میں اور محل کے باغ میں آیا۔ وہیں شہر کے معززین اور عمائد ملاقات اور مبارک دینے آئے۔

سمرقند قریب ایک سو چالیس برس ہمارے خاندان کے پائے تخت رہا۔ ایک اجنبی، ازبک (کیسی نسل کا؟) دشمن اس میں گھس کر قابض ہو گیا تھا۔ بارے ہمارا یہ لٹا کھٹا شہر پھر ہمیں واپس مل گیا ـــــ (میں نے دوسروں سے اسی قسم کے معاملات کا مقابلہ کیا، اس کا منشا) اوروں کی تنقیص اور اپنی خودستائی کرنا نہیں، صرف واقعات بیان کئے ہیں۔ شعرا نے اس فتح پر نظمیں لکھیں۔ ان میں یہ شعر مجھے یاد رہا

باز   گفتا   خرد   کہ   تاریخش
فتح   بابر   بہادر،   است   بداں

(مترجم)

داصل، بابر حسب عادت پھر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور یقین کر رہا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ اوج پر ہے۔تمام ولایت سمرقند میں باشندے ازبک فوجوں کو جو قلعوں میں متعین تھیں نکال رہے تھے بابر ان فتوحات کو ایک ایک کر کے گنا تا ہے۔ادھر محتاط شیبانی فسادہ زدہ علاقے سے جانب مغرب ہٹ گیا۔اب بابر کے اہل محل بھی سمرقند میں اس کے پاس آ گئے۔اسکی دلہن عائشہ کے ہاں یہیں لڑکی پیدا ہوئی۔اسے کہ چند ہی مہینے زندہ رہی فخر النساء کا نام دیا گیا تھا۔بہن خانزادہ بیگم محل سرا میں اس کے ساتھ ساتھ گشت لگایا کرتی تھی گویا منحرف بھائی (جہانگیر) کی جگہ پر کرنا چاہتی ہے۔اسی زمانے میں خبر آئی کہ شمال سے ایک قافلہ ازبکوں کے بعید پڑاؤ میں آیا اور شیبانی اور اس کے سرداروں کے اہل وعیال کو لے آیا ہے جس کے معنی یہ تھے کہ ازبک ان علاقوں میں ڈٹے رہیں گے۔بابر اور اس کے رفیقوں کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ مستقل خطرہ ہے۔چنانچہ موسم سرما میں انہوں نے عمر شیخ میرزا کے دور دور کے رشتہ داروں اور عزیزوں کو تاکیدی پیام بھیجے کہ دشمن ازبک کے مقابلے میں بابر کے گرد پوری جمعیت کے ساتھ متحد ہو جائیں۔واقعی یہ ان کے لئے اتحاد کرنے کا وقت تھا۔

شیبانی خاں، جیسا بابر کہتا ہے، پردیسی یا اجنبی ضرور تھا لیکن اس کا نسب کچھ غیر معروف تو نہ تھا۔وہ چنگیز کے سب سے بڑے بیٹے جوجی کے ایک فرزند کا ہم نام تھا۔اس کا جد امجد ذی شان باتو ''التون اردو'' (لشکر زرین) یعنی مغول کی صدر

عسکری تنظیم کا مالک رہا تھا جس کی عمل داری روس کے شہروں سے وسط ایشیا کی کوہستانی فصیل تک وسیع تھی اگر چہ زیر نظر عہد میں اسکے اجزا ئے پراگندہ صرف کنار والگ سے بحر اسود کے سواحل تک باہمی جنگ میں مبتلا رہ گئے تھے (مذکورہ بالا اقطاع میں منگول تاتاری جاگیرداروں کا تو ہمارے زمانے سے کچھ پہلے تک دور دورہ رہا) یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بابر کے زمانے میں انتشار پذیر التون اردو کا جزو کبیر انہی ازبکوں کے دم سے قائم تھا۔ شیبانی کے دادا کے ماتحت ان کی ایک بدوی قسم کی سلطنت حدود چین سے ماسکو تک جو آئندہ ملک روس کا مرکز سلطنت بنا، صحرائی اقطاع میں قائم ہوگئی تھی۔ پھر ان سے قزق (بہ معنی آوارہ گرد) قبائل ٹوٹ کر مشرق کی طرف کٹ گئے۔ ایک جنگ میں یونس خاں نے وحشی ازبکوں کو شکست دی اور شیبانی کے باپ کو قتل کیا۔ خود شیبانی جوانی میں بابر ہی کیطرح قسمت آزمائی کرتا پھرتا تھا۔ ازبکوں کے صدر گروہ پر ان سے بھی زیادہ جنگلی، قزاق اور جاہلی (کنار) کی غیز دباؤ ڈال رہے تھے۔ انہی کے دباؤ سے بچا کر شیبانی اپنے جنگ جو قبائلی جتھے کو بحیرہ ارال کی شمالی چراگاہوں سے عمداً جنوب کی طرف لے آیا تھا۔ دیکھ بھال کی ابتدائی تاختوں میں جو تیموری شاہزادوں کی سرسبز ولایات پر کی گئیں۔ شیبانی ان کی کمزوری سے آگاہ ہوگیا اور اب اپنی پوری قوم کو ان جنوبی اقطاع پر چڑھا لایا جو تیموری سلطنت کا قلب تھا۔ مشہور مزاروں کے شہر بخارا پر اسکا قبضہ جم چکا تھا۔ ازبک جنگ آزماؤں کے بیوی بچوں کی آمد بابر کے لئے پیشگی اطلاع تھی کہ اب وہ سمرقند کو بھی فتح کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم یہ کچھ خبر نہ تھی کہ شیبانی حملہ کس طرح کرے گا۔

پل کا معرکہ

بابر کے ایک نوجوان عزیز میرزا حیدر نے ازبک شیبانی کی نسبت یہ عجیب سی بات کہی کہ وہ بڑا آدمی ہے مگر درباری یا کاروباری آدمی نہیں ہے۔ شیبانی خاں دربار میں کسی کو برائے بادشاہ بنائے رکھنے کی اور دوسروں کو بازار میں داد وستد کرنے کی اجازت دیتا اور خود کشور کشائی سے شغف رکھتا تھا۔ سنت والجماعت مولویوں نے اسے تعلیم دی اور وہ تین زبانیں جانتا تھا۔ بظاہر شہری عورتیں اسے پسند کرتی تھیں اور بابر کا اسے وحشی کہنا درست نہ تھا۔ وہ فورا فیصلہ کرتا، اپنے اصلی مقصد کی چالاکی سے چھپاتا اور سفاک آدمی تھا۔ اس کے خطرناک ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ وہ وحشیوں کا تعلیم یافتہ سردار تھا مگر اس بات کی اسے پروانہ تھی کہ اس کے جنگلی قبائل شہروں کو تاراج کرکے اپنی صحرائی مملکت تیار کریں گے۔ وہ چنگیز خاں کے سچے وارث ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور فی الواقع بعض تاریخ نویسوں نے اسکی سلطنت کو خانہ بدوشوں کی آخری حکومت قرار دیا ہے۔

موسم بہار کے آغاز (اپریل ۱۵۰۱ء) میں بابر اپنے مختصر لشکر کو لے کر چلا کہ ازبکوں کے حملہ کرے یہ بات اس لیے بھی ناگزیر تھی کہ سمرقند کی بڑی فصیلوں کے اندر کوئی فوج ایسی حالت میں گزارہ نہ کرسکتی تھی۔ جب کہ نواح میں جہاں اجناس خوردنی کے کھیت تھے۔ دشمن چھایا ہوا ہو۔ بابر کو لوگوں نے ہوشیار کردیا تھا مگر اس نے دانستہ اغماض کیا۔ رشتہ داروں سے اسے محض اظہار خیر سگالی کے طور پر تھوڑی سی کمک بھیجی گئی تھی۔ یعنی ماموں، محمود خاں نے چار پانسو سوار، دو سردار بھیجے۔

جہانگیر میرزا اب بر روئے معاہدہ حلیف اور حاکم فرغانہ تھا۔اس کی طرف سے تمثل کی دعائے فتح کے ساتھ سو جوان آئے بعید مغرب کے تیموری شہزادوں نے ہرات جیسے بڑے شہر سے ہمت افزائی کا پیام تک نہیں بھیجا۔ نہ خسرو شاہ نے جو ترخانوں کا بڑا حامی بنتا تھا۔کوئی کمک بھیجی کیونکہ وہ ڈرتا تھا۔کہ بابر اس سے باسنغر کے قتل کا انتقام لے گا۔تاہم کئی ترخان اپنی جمعیتوں کے ہمراہ بابر سے آ ملے۔خاصی بڑی فوج ہوگئی۔پھر اسے اپنے طالع پر بھی اعتماد تھا۔غلطی یہ کہ کہ مزید کمک پہنچنے کا انتظار نہیں کیا۔بابر نے اس غلطی کا اقرار کیا ہے اگرچہ بعد از وقت،غرض نواح سمرقند سے دیکھ بھال کرتے آگے چلے اور اس ندی تک پہنچے جو سمرقند سے بہ کر بخارا کے قریب سے گزرتی ہے۔معلوم ہوا کہ ازبک ندی کے کنارے پڑے ہیں۔ان کے مقابل لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔حفاظت کے لئے خندق کھودی اور شاخوں کی باڑ لگادی۔

ہمارے شیر نے اب دوسری غلطی کھائی،قنبر علی سلاخ باڑ کے پیچھے پڑے رہے اور جنگ میں دیر کرنے کا شاکی تھا۔ادھر نجومیوں نے بتایا کہ دب اکبر کے آٹھ ستارے آج کل فریقین کے وسط میں آسمان پر قائم ہیں۔لیکن چند روز بعد ازبکوں کی طرف چلے جائیں گے۔بابر بعد میں اقرار کرتا ہے کہ یہ سب واہیات باتیں تھیں مگر اس وقت تو فوج کو باہر نکال کر دریا کے پل کی طرف لے چلا جہاں ازبک انتظار میں تھے۔

لڑائی شروع ہوئی تو بابر کی میدان کے ہر حصے پر نظر تھی لیکن پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عالم خواب میں ہے اور بالارادہ کوئی حصہ نہیں لیتا بلکہ ہر طرف جو ہزیمت

ہو رہی ہے انہیں اپنے آپ کو بالکل بے بس سمجھ رہا ہے۔ سب سے اگلی صف جنگ میں قاسم بیگ اور سمرقند کے چیدہ جوان بڑھے تھے کہ ازبکوں کے قلب میں گھس جائیں۔ بابر اور باقی سپاہ اس پرجوش قراول کے عقب میں تھی جو دشمن کی صفیں توڑ دینے کا داعیہ رکھتا تھا۔ اول اول ایسا ہی ہوتا نظر آیا کہ تصادم ہوتے ہی سمرقندی مارتے کاٹتے ہوئے آگے چلے لیکن ان کا جھکاؤ دائیں طرف زیادہ تھا۔ اسی رخ دشمن پسپا ہوتا معلوم ہوا مگر پھر لڑائی پھیل کر سمرقندی صفوں کے یسار پر ہونے لگی اور ادھر سے دشمن پسپا ہوتا معلوم ہوا۔ مگر پھر لڑائی پھیل کر سمرقندی صفوں کے یسار پر ہونے لگی اور ادھر سے دشمن گھیرا دے کر ان کے پیچھے نکل آیا۔ بابر کو اپنے قریبی سواروں کو پیچھے مڑنے کا حکم دینا پڑا۔ لیکن اس طرح پلٹنے سے اس کی فوج اپنے قراول سے جوشجاعانہ آگے چلا جا رہا تھا۔ جدا ہو گئی اور اوجھل میں آ گئی۔ اب وہ سمجھا کہ یہ ازبکوں (مغول) کی مشہور جنگی چال (تو لغمہ) تھی جس میں دائیں بازو کا بعید چیدہ رسالہ یکبارگی سرپٹ گھوڑے دوڑا کر تیر مارتا ہوا دشمن کے عقب میں پہنچتا اور اسے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ شیبانی خان نے اس موقع پر اپنے ایک بازو کو اسی لئے پیچھے ہٹایا تھا کہ بابر کے دوسرے پہلو پر جا پڑے اور اسے گھیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ قبل اس کے کہ قاسم بیگ اور اس کے ساتھ بڑھ جانے والے جنگ آزما، اصل حقیقت کو سمجھیں۔ برق رفتار سواروں نے جنگ ختم کر دی تھی اور سمرقندی لشکر چھوٹی چھوٹی ٹکریوں میں لڑ بھڑ کر اس مقتل سے نکلنے اور ندی کے کنارے پہنچنے کی جدوجہد کر رہا تھا:

''میرے پاس اب دس پندرہ آدمی رہ گئے تھے۔ کوہک ندی قریب تھی جس طرح ہوا ہم اس تک پہنچے اور اگرچہ پوری طرح مسلح زرہ پوش تھے لیکن گھوڑوں سمیت ندی میں در آئے۔ آدھی دور تک گھوڑوں کے قدم ٹکے رہے پھر تیر کر پار کرنا پڑا۔ سازو یراق سے لدے پھندے تھے۔ ندی سے نکل کے گھوڑوں کے بھاری سازکو کاٹ کر پھینک دیا اور شمالی کنارے پر دشمن سے دور ہو گئے۔ مغل جو میرے مدد کرنے آئے تھے۔ اب لڑائی چھوڑ کر میرے جوانوں کو گھوڑے سے اتار کر کپڑے اتروانے لگے۔ یہ پہلا موقع نہ تھا کہ انہوں نے ایسا کیا۔ ج ان کم بخت مغول کا طریقہ یہی ہے۔ اگر دشمن پر غالب آئے تو سب سے پہلے وہی اسے لوٹنا شروع کرتے ہیں اور اگر شکست ہوئی تو خود اپنے حلیفوں کو لوٹ کر چل دیتے ہیں۔ اس موقع پر ابراہیم تر خان اور بہت سے اچھے اچھے جوانوں کو انہوں نے گھوڑوں سے اتارا اور قتل کر ڈالا۔

بعد میں بابر یا اور کسی نے تزک کے اس صفحے پر یہ شعر بھی لکھ دیا تھا کہ:

''مغول اگر فرشتے کی نسلل سے ہوں تو وہ نسل بری ہے،

مغول کا نام آب زر سے لکھا جائے تو وہ بھی برا ہی رہے گا''

اپنے بزرگوں کی نسل کو اس طرح قلم زد کرنے کے بعد، بابر نے پل کی لڑائی ہارنے پر یہ حاشیہ چڑھایا ہے کہ وہ جو شباب کاری آتا ہے آخر میں اسے انگشت تاسف چبانی پڑتی ہے۔ اس کا رنج وملال حقیقت میں گہرا اور نا قابل تسلی تھا۔ چند ہی روز پہلے وہ ایک عظیم حصار بند شہر میں تخت نشین ہوا۔ اہل شہر نے جوش وخروش سے

اس کا خیر مقدم کیا۔ امدادی فوجیں ہر طرف سے آ رہی تھیں۔ اگر چندے اور خندق سے محفوظ پڑاؤ ہی میں رہتا کہ اس کی فوجی جمعیت بڑھتی اور ازبک مجبور ہوتے کہ حملے کا خطرہ مول لیں!

آئندہ پھر کبھی بابر نے اجیر سپاہیوں پر اعتماد نہیں کیا اور نہ نجومیوں کو اجازت دی کہ اس سے کوئی فیصلہ وہ کرائیں۔ علی ہذا وہ صحرائی سواروں کے اس خوفناک جھپٹے (تو لغمہ) کو بھی نہ بھولا جس نے اس کے لشکر کو پیچھے سے آ گھیرا تھا۔ کیونکہ اس جنگلی چال کے سامنے اچھے سے اچھے گھوڑے اور اسلحہ یا ذاتی شجاعت کام نہ دے سکتی تھی۔ اسی حملے کی وجہ سے اس کے بہت سے جاں نثار ساتھی اور بہترین سپاہی دریا کے کنارے مارے گئے۔ پھر سمرقند کی طرف مارا مار پسپائی میں اس نے باقی ماندہ فوج کا انتشار معائنہ کیا۔ مغل لکی تو ظاہر ہے اپنی لوٹ کے ساتھ چل دئے تھے۔ لیکن بعض طاقتور سردار بھی آئندہ مصائب کے آثار دیکھ کر ایسے گئے کہ پھر سمرقند کی صورت نہ دیکھی۔ قنبر علی آیا بھی تو صرف اس غرض سے کہ اپنے بال بچوں اور مال اسباب کو لیکر نکل جائے اور خسرو کا دامن تھامے۔ ۔ (یہاں بابر کے جلسہ مشاورۃ میں شریک ہو لیکن اپنے اہل وعیال کو دوسری جگہ بھیج کر آیا تھا۔ اور اس کا مطلب بابر سے مخفی نہ رہا۔

وہ اس بات پر بھی حیران نہیں ہوا کہ اس نے اپنے حاکم رشتہ داروں سے مدد کی تھی جو التجا کی تھی وہ اس نازک وقت میں بے اثر رہی۔ کیونکہ کامرانی کے زمانے ہی میں اسے بہت کم مدد ملی تھی تو اب شکست کھانے کے بعد وہ اس کی کیا امید کر سکتا تھا۔ پھر بھی

یہ سن کر وہ پیچ وتاب کھائے بغیر نہ رہا کہ بعید ہرات کے سلطان (۳۲) نے دوستانہ سفارت روانہ کی تو وہ اس کے پاس نہیں، بلکہ شیبانی خاں کے لئے بھیجی گئی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود بابر نے ٹھان لی کہ جب تک جان ہے سمرقند کی مدافعت کی جائے۔ قاسم بیگ اور خواجہ ابوالمکارم جان نثاری سے مشورے میں شریک تھے اور اپنی بچی کھچی جمعیت کے قابل اعتماد جوانوں کی کمک ہر جگہ لے جانے پر آمادہ ہوئے۔ تجویز یہ ہوئی کہ فصیل کی نگرانی اہل شہر کریں اور جہاں خطرہ ہو وہاں یہ جوان دوڑ کر مدد کو پہنچ جائیں۔ شہر پناہ اتنی مستحکم تھی کہ تھوڑی دیر تک اس پر حملہ آوروں کو روکا جا سکتا تھا۔

اس اثنا میں بابر کی نومولود لڑکی فوت ہو گئی اور عائشہ بیگم چلی گئی تھی۔ خانزادہ جنگ وجدال میں بے بس تھی۔ اپنے دالان میں پڑی کڑھتی رہتی تھی۔

پناہ گزینو کا شغل فراری رہ گیا

ہزیمت اٹھانے کے بعد شیر نے بہادری سے کام لیا۔ اس کا عزیز میرزا حیدر لکھتا ہے کہ بابر دلیری میں اپنی ساری قوم میں بڑھا چڑھا تھا اور اسکی قوم والوں کل میں کسی نے ایسے عجیب نشیب وفراز نہ دیکھے تھے۔

ازبک نواح شہر پر قابض اور ہاتھ پاؤں بچا کے فصیلیں دیکھتے پھرتے تھے۔ بابر کو معلوم ہوا کہ محاصرے میں ایک بڑا مسئلہ شہر والوں کو قابو میں رکھنا تھا۔ انہیں کوئی چشم زخم نہیں پہنچا تھا اور جہالت کی دلیری دکھا رہے تھے لکھتا ہے:

''میں نے اپنا خیمہ مدرسہ الغ بیگ کی بڑی محراب کے نیچے لگوایا۔ بازاری عوام گلی کوچوں سے نکل کر محراب تک آتے اور درود صلوۃ کے نعرے لگاتے تھے۔ جب یہ بھیڑ کی بھیڑ باہر تک جانے لگی تو شیبانی خاں نے احتیاطا ان پر حملہ نہیں کیا لیکن چند روز میں بڑھ کر دروازہ آہنی کے قریب تر آ گیا۔ بازاری لوگ زیادہ دلیر ہو گئے تھے ۔ دور تک آگے چلے۔ میں نے بازگشت کی حافظت کے لئے سواروں کی ایک ٹکڑی نویان کوکل تاش کی قیادت میں روانہ کی۔ اس میں چند اور کوکہ اور میرے ملازمان خاص شامل تھے۔ ازبکوں نے گھوڑوں سے اتر کر یورش کی اور عوام کو دروازے کے اندر دھکیل دیا۔ پناہ گزینوں کو سوائے فراری کے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ البتہ میرے آدمیوں نے تلواریں سونت کر ازبکوں پر حملہ کیا تو عوام رک کر داد دینے لگے۔ میں دروازے کی چھت سے کمان چلا رہا تھا۔ ایک دن اس کمان سے میں نے شرط باندھ کر ایسا تیر مارا کہ ایک ہی زخم سے ایک ازبک سردار کے گھوڑے کو ہلاک کر دیا۔

ازبک حملہ کرتے کرتے دروازے کے قریب آ گئے اور فصیل کے نیچے قدم جما لئے۔ میں اس قدر جنگ کرنے میں مشغول تھا کہ شہر پناہ کے دوسرے حصے کی حفاظت کا خیال نہ رکھا۔ شیبانی خاں نے ظاہر میں تو میری جانب حملہ کیا لیکن آٹھ سو آدمی اور پچیس چوڑی سیڑھیاں چھپا کر دوسری طرف سے حملہ کرا دیا۔ بایں ہمہ قوچ بیگ اور تین دوسرے بہادروں نے دوڑ کر انہیں روکا اور چڑھ آنے والوں کو مار مار کر پیچھے ہٹا دیا۔ سب سے بڑھ کر قوچ بیگ نے بہادری دکھائی اور کارنمایاں انجام دیا۔۔ ایک اور موقع پر قاسم بیگ دروازہ سوزن گراں سے جمعیت لے کر نکلا اور

کئی ازبکوں کو گھوڑوں سے گرا یا۔چند سر کاٹ کر لا یا۔''

ذاتی بہادری فصیلوں کا دفاع کر سکتی تھی لیکن محصور شہر کے مصائب دور نہ کر سکتی تھی۔تجر بہ کار ازبکوں نے ایسی آویزشوں کو چھوڑ کر محاصرے کا دائرہ تنگ کیا اور راتوں کو ڈھول دمامے بجا بجا کر مدافعین کو تنگ کرنا شروع یا جو تھکے ماندے بستر چھوڑ چھوڑ فصلیں بچانے کو بھاگ کر آتے تھے۔مزید برآں اب انہیں بھوک ستانے لگی تھی۔فصلیں تیار ہوگئی تھیں۔مگر شہر میں کوئی نیا غلہ نہ لاتا تھا۔لوگ بہت تنگ ہورہے تھے۔ادنی درجے کے لوگ کتوں اور گدھوں کا گوشت کھانے لگے تھے۔گھوڑوں کا دانہ چارہ نہیں رہا تھا۔درخت کے پتے کھلائے جارہے تھے۔ان میں شہتوت اور درکت قرایفاچ کے پتے بہتر کام دیتے تھے۔بعضوں نے درختوں کی چھال پانی میں بھگو کر کھلائی۔باہر سے کوئی کمک نہیں آئی کہ ہم کو محاصرے سے نکالتی۔

پرانے لوگوں کا قول تھا کہ قلعے کی حفاظت کے لئے ایک سر دو ہاتھ دو پاؤں درکار ہوتے ہیں۔مطلب ہے کہ سر یعنی سردار،فوج اور کمک دو ہاتھ اور قلعے کے اندر خوراک اور پانی یہ دو پاؤں ہیں۔ہم مدد کے لئے اردگرد نظر ڈالتے تھے تو جو مدد دے سکتے تھے ان کی توجہ دوسری طرف تھی۔سپاہی اور شہری دونوں کی آس ٹوٹ گئی اور وہ دو دو چار چار کر کے ساتھ چھوڑنے لگے۔۔۔میرے ذاتی ملازمین،معتبر اشخاص تک فصیل سے خود کو گرا کر فرار ہونے لگے۔اب محاصرے سے نجات ملنے کی بالکل امید نہیں رہی۔سامان خوراک کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگیا۔

شیبانی خاں کو ہمارے مصائب کا علم تھا۔ اب وہ آگے بڑھا اور غار عشاق میں اپنا پراؤ ڈالا۔ ادھر سے میں نے بھی اس کے سامنے کوے پایاں میں رہنا اختیار کیا۔ انہی دنوں اوزون حسن (مغلوں کا ایک سابق سردار) دس پندرہ آدمیوں کے ہمراہ شہر میں داخل ہوا۔ وہ جہانگیر میرزا کی بغاوت کا، جس کی وجہ سے مجھے پہلے سمر قند سے نکلنا پڑا، سرغنہ تھا۔ اس بار پھر اس کا آنا بڑی جرات کی بات تھی، شیبانیخاں نے (اس کی وساطت سے) صلح کی گفتگو کی۔ اگر کہیں مدد یا خوراک ملنے کی کوئی امید ہوتی تو اس کیطرف بالکل اعتنا نہ کرتا۔ مگر مجبورا کرنی پڑی اور بری بھلی صلح کی شرطیں طے ہوگئیں۔ آدھی رات کو میں شہر کے شیخ زادہ دروازے سے سمرقند سے نکل آیا۔ میری ماں خانم بھی میرے ساتھ تھی لیکن گڑ بڑ میں بڑی بہن خانزادہ بیگم رہ گئی اور شیبانی کے ہاتھ آ گئی۔ (مگر بابر کے اس قول کے خلاف حیدر میرزا کا بیان ہے کہ خانزادہ بیگم ازبک کے حوالے کردی گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بلدن ارادہ شہزادی خود شیبانی کے ہاں چلی گئی۔ اگرچہ جہاں تک ممکن تھا برابر اپنے بھائی کے لئے کام کرتی رہی۔ چاہنے والی نانی نے بھی سمرقند میں رہ جانا پسند کیا اور ان دو خاتونوں نے اس حال میں بھی موہوم امیدوں کو نہ چھوڑا)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ بابر کو شیبانی کے وعدے پر کہ انہیں بخیر و سلامت جانے دیا جائے گا۔ بھروسہ نہ تھا اور اس کی مختصر جماعت رات کے وقت کھلے میدان کی بجائے دریا کی طرف سے رج بہوں کے کنارے کنارے روانہ ہوئی۔ ان نہروں میں ہمل راستہ بھول گئے۔ نماز فجر کے قریب صرف فاربوغ کے ٹیکرے تک پہنچے۔

راستے میں قنبر علی اور قاسم بیگ سے میں نے گھڑ دوڑ کی اور دونوں سے آگے نکل گیا۔ انہیں دیکھنے کے لئے زین پر سے مڑا تھا کہ خود زین اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور تنگ ڈھیلا ہونے کے باعث میں سر کے بل زمین پر گرا۔ ہر چند اسی وقت اچھل کے پھر سوار ہو گیا لیکن شام تک دماغ صاف نہیں ہوا اور س عرصے میں جو کچھ گزرا، وہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خواب کے واقعات ہیں۔ شام کو ہم ایلان اوتی میں گھوڑوں سے اترے۔ ایک گھوڑا ذبح کیا۔ گوشت بھونا، پھر سوار ہو کر چل پڑے۔۔ دزخ میں ہمیں فربہ گوشت، میدے کے عمدہ نان، کثرت سے خربوزے اور اعلیٰ درجے کے انگور ملے۔ ایسی نامیسری کے بعد یہ افراط کیسی کچھ سختی کے بعد یہ امن راحت نصیب ہوا۔ شعر:

موت کا خوف دل سے ہو گیا دور
بھوک کی آگ ہو گئی کافور

ایسا آرام و سکون ساری عمر میں نے نہ دیکھا۔ شادمانی وہی بہت خوب ہوتی ہے جو رنج و تکلیف کے بعد میسر ہو۔ آئندہ زندگی میں چار پانچ دفعہ ہی مصیبت کے بعد ایسی راحت مجھے ملی مگر یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک موزی دشمن سے مجھے نجات ملی تھی دو تین روز تک ہم نے آرام کیا اور لطف اٹھایا۔''

ہمارا شیر پھر پہاڑیوں میں گلہ بانوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ سردیاں چمکنے سے قبل اس نے اپنی دوسری جلا وطنی کے معاملات کا انتظام کیا اور بیمار ماں کو لے کر تاشقند میں اپنے ماموں محمود خاں سے رہنے کے لئے کوئی مستعار مانگی۔ اس نے جو

مقام دیا وہ محض ایک گاؤں وہ کت (۳۳) تھا۔ایک اونچے پہاڑ کے بازو میں یہ چرواہوں کے ٹیکرے تھے۔نجدی شاہراہ یہاں سے نظر آتی تھی۔وہ کت میں کئی سرداروں نے جن میں چلبلا قنبر علی شامل ہے۔اور جو اس طرح بھیڑ بکریوں میں کہ کہیں ہاتھ مارنے کا موقع نہ تھا۔رہنا پسند نہ کرتے تھے۔بابر سے اندجان کی نواح میں اپنے اہل و عیال کے پاس جاڑے گزارنے کی اجازت مانگی بابر نے انہیں جانے دیا۔

برے بھلے ہر حال میں وقت کو اچھی طرح گزارنے کا اس میں مادہ خداداد تھا۔ سمرقند میں ملک و مال سب کچھ ہاتھ سے دے کے راتوں رات ماں کے ساتھ کھائیوں اور نالوں کے راستے بچتا بچاتا نکلا تو صبح کو راستہ نظر آتے ہی گھڑ دوڑ کی سوجھی تھی۔اب غربت میں ان ٹیکروں میں گشت ہی لگانا شروع کیا اور اپنی دلچسپی کے سامان ڈھونڈ لئے۔لکھتا ہے:

''یہاں کے باشندے اگرچہ (فارسی بولنے والے) سرت)۳۴ ہیں لیکن ترکوں کی طرح بھیڑوں، گھوڑیوں کے بڑے بڑے گلے پالتے ہیں۔اسی گاؤں کی بھیڑوں کی تعداد ۴۰ ہزار ہوگئی۔ہم یہاں کسانوں کے گھروں میں مقیم ہوئے۔میں چودھری کے مکان میں اترا جو بہت سن رسیدہ کوئی اسی سال کی عمر کا ہوگا۔مگر اس کی ماں زندہ اور اس کی عمر ایک سو گیارہ سال کی تھی۔کتنی طویل زندگی اسے ملی۔کہتی تھی اسکا کوئی رشتہ دار ہندوستان پر فوج کشی میں امیر تیمور کی سپاہ میں تھا۔اسے یہ بات خوب یاد تھی اور مجھے سنایا کرتی تھی۔'' بابر نے حسب عادت حساب لگایا کہ گلہ بانوں

کی یہ بزرگ خاتون تیمور کی فتح کی تصویریں دیواروں پر بنی ہوئی دیکھی تھیں ۔ یہ عروج رفتہ کا موہوم سا اشارہ تھا۔ شیر نے ان خیالات میں کھو جانا تضیع اوقات سمجھا ۔ مگر بالفعل یہ بات بھی زہن میں نہ تھی کہ وہ آئندہ کیا کرے گا۔ لہذا اور کچھ نہیں تو اس نے صد سالہ بڑھیا کی اولاد کا حساب لگانا شروع کیا: ''اسی گاؤں کے علاقے میں اس کی اولاد یعنی بیٹے، پوتے، روتے سروتے ۹۶ موجود ہیں ۔ مرنے والوں کا شمار کیا جائے تو اسکی اولاد کی کل تعداد دو سو نکلتی ہے۔ اس کے پوتے کا ایک پوتا ۲۵، ۲۶ برس کا گبھرو جوان تھا۔ بھری ڈاڑھی سیاہ تھی''

حسب معمول بابر نے پہاڑی بیٹوں میں گھومنا شروع کیا۔ اکثر کسی خواجہ (مذہبی آدمی) کے ساتھ اور اس سے باتوں میں وہ منہمک رہتا تھا:

عام طور پر میں ننگے پیر چلا کرتا تھا۔ اس عمل سے پاؤں کے تلوے ایسے سخت ہو گئے تھے کہ روڑی پتھر کی تکلیف نہ ہوتی تھی ۔ اسی طرح کے گشت لگانے میں ایک دن عصر و مغرب کے درمیان ہمیں ایک آدمی ملا کہ پگڈنڈی پر گائے لئے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کھلا راستہ کدھر ہے؟ کہنے لگا اس گائے کے پیچھے چلے آؤ۔ اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دو یہاں تک وہ بڑے راستے پر پہنچ جائے ۔ میرے ساتھ خواجہ (اسد) تھا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ بھلا گائے راستہ بھول گئی تو ہم عاقل انسانوں کا کیا بنے گا؟''

''ان سردیوں میں قاسم بیگ بار بار کہتا تھا کہ آپ کے آدمی اندجان جا رہے ہیں ۔ شہزادہ جہانگیر میرزا کو آپ کوئی تحفہ ضرور بھیجیں ۔ میں نے اپنی قاقم کی ٹوپی ہدیتہً بھیجی ۔ قاسم بیگ نے کہا تنبل کو بھی کچھ بھیج دیجئے تو کیا مضائقہ ہے ۔ میرا جی

نہ چاہتا تھا مگر اس کے اصرار پر (بہ تصحیح مترجم) نویان (نوئیں) کوکل تاش نے سمرقند میں جو بھاری تلوار بنوائی اور میں نے لے لی تھی ۔تمبل کو بھیج دی ۔ اگلے سال یہی تلوار خود میرے سر پر چلائی گئی جیسا کہ آگے بیان کروں گا۔

''چند روز بعد میری نانی ایسان دولت بیگم جو میرے سمرقند چھوڑنے کے وقت وہاں رہ گئی تھی ۔ اپنے بھاری اسباب ، چند متعلقین اور کچھ ننگے بھوکے آدمیوں سمیت میرے پاس آ گئی ۔'' سن رسیدہ نانی کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ سمرقند کی خبریں آئیں۔

''شیبانی خاں نے دریا (سیر) کو خجند پر منجمد جگہ سے عبور کیا اور مضافات کو لوٹ رہا تھا۔ ہم نے یہ سنا تو جماعت قلیل ہونے کے باوجود اس کے تعاقب میں گھوڑے دوڑا دیئے ۔ہم خجند کے نیچے تک آئے بلا کی سردی پڑ رہی تھی اور ہر وقت ہوا ایسی تند و تیز تھی جیسی ہادرویش میں چلتی ہے (یہ کاروانی شاہراہ کے صحرائی ٹکڑے کا وہ مقام ہے جہاں مشہور تھا کہ آندھی میں چند بے نوا فقیر ہا درویش ہا درویش پکارتے پکارتے ہلاک ہوئے ۔ وہاں کی تیز ہوا ضرب المثل ہوگئی تھی) شدت سرما کی وجہ سے ہمارے دو تین ساتھی ضائع ہوگئے ۔ مجھے غسل کی حاجت ہوئی ۔ایک نہر میں جس کے کنارے کا پانی یخ بستہ مگر بہاؤ کے باعث بیچ (۳۵) میں برف نہ تھی ، میں نے غسل کیا۔ سولہ غوطے لگائے ۔ سارے جسم کیا اندر سردی سرایت کر گئی ۔ دوسری صبح ہم بھی خجند کے قریب برف سے دریا پار ہوئے لیکن شیبانی خان گاؤں لوٹ کر جا چکا تھا۔''

واپسی کے سفر میں بابر کو ایک صدمہ یہ اٹھانا پڑا کہ اس کا عزیز ترین رفیق نویان کو کلتاش جو ایک مقامی ضیافت میں پیچھے رہ گیا تھا۔ پہاڑی سے جہاں ضیافت ہوئی۔ نا ؤ نوش کے وقت عجیب طور پر کھڈ میں گرا اور مر گیا۔ بابر کو سخت رنج اور شبہ ہوا کہ ایک ہرجائی نوجوان (۳۲) جو اس سے دلی کینہ رکھتا تھا اس حادثے کا باعث ہوا لیکن مرنے والا مر چکا۔ سوائے اس کے کہ شدنی کہہ کر صبر کرے وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔

آمد بہار نے پہاڑوں پر برف کی مہر توڑ دی۔ ایک روز ہمارا شیر کنار آب ایک دلکش پتھر پر چند حکیمانہ اشعار کندہ کروا کے خوش ہو رہا تھا کہ خبر ملی ازبک خود اس گاؤں کی طرف شارع عام پر دیکھے گئے۔ کو کلتاش کا صدمہ ابھی تازہ تھا۔ پریشانیوں میں خیال آیا کہ اس طرح بے در بے گھر بلا ملک و وطن پہاڑوں میں پڑے پھرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ میں نے دل میں کہا بہتر ہے کہ ہم خان کے پاس تاشقند چلیں۔ قاسم بیگ اس رائے کے سراسر خلاف تھا۔ اس سزا ء تین چار مغل قتل کرائے تھے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ اب وہ ان کے ہم وطنوں میں جانے سے اندیشہ مند ہوا اور میرے کہنے سننے سے بھی رضامند نہ ہوا اور اپنے بھائی بند، رفیقوں سمیت رخصت ہو کر حصار (خسرو شاہ کا سرحدی مقام چلا گیا۔ ۔ میں خان کے پاس تاشقند کو روانہ ہوا۔

عید رمضان ہونے تک ٹھہر کر بابر چلا تو ملازم خاص کے سوا صرف تین چار آدمی ساتھ چلنے کا ساز و سامان کر سکے۔ ماموں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کوئی مناسب تحفہ نہ تھا لہذا ایک رباعی لکھی اور تراش خراش کر کے ماموں کو سنائی۔ پہلا

مصرعہ تھا کہ آفت زدہ کی دوسرا کوئی خبر نہیں لیا کرتا۔ البتہ خود آفت زدہ نے سوچا تھا کہ خان اس کے واسطے کیا کر سکتا ہے۔

چنگیزی جھنڈوں کے ساتھ

محمود خاں نے بھانجے کا محبت سے خیر مقدم کیا۔ صحرائی قبائل کی مخلصانہ مہمان نوازی کی۔ اگر چہ وہ خود تھوڑی بہت شاعری کیا کرتا تھا مگر مغلوں کے رسمی رئیس اعلیٰ نے از راہ احتیاط التجا آمیز رباعی کو سن کر کچھ نہیں کہا۔ بابر افسردہ ہو کر لکھتا ہے، بظاہر خان بھی کلام کے حسن و قبح سے زیادہ واقفیت نہ رکھتا تھا۔''

اسی احتیاط کے ساتھ اس نے بابر کی تازہ تجویز کہ وہ دونوں مغلوں کا لشکر لیکر چلیں اور باغی تنبل کو سزا دے کر ملک چھین لیں، قبول کی۔ طاقتور ازبک کی نسبت تنبل بہر حال کمزور حریف تھا اور محمود خاں کے تجویز قبول کرنے میں اور مصلحتیں بھی تھیں جن کا اس نے اظہار نہیں کیا۔ لشکر کا کوچ خاص دھوم دھام کی رسموں سے ہوا اور بابر کو معلوم ہوا کہ جنگی جھنڈوں کو برکت دینے کی قدیم رسم میں اسے بھی حصہ لینا ہوگا:

ساری فوج باقاعدہ ایک بڑا دائرہ بنا کر کھڑی ہوئی۔ قدیم قاعدے کے مطابق تر ہیاں نفیریں بجیں۔ خان گھوڑے سے اترا۔ اسکے سامنے نو جھنڈے لائے گئے جن سے گھوڑوں کی دمیں لٹک رہی تھیں۔ ایک مغل نے لمبی سفید چادر کے سرے سے بیل کی ران کی ہڈی کو باندھا۔ وہ اسے تھامے رہا۔ دوسرے نے تین ایسی ہی چادریں جھنڈوں کی بلیوں پر دموں کے نیچے باندھیں اور پھر چادروں کا نچلا رخ

پھیلایا کہ خان اس کا بیٹا اور میں ان کے اوپر کھڑے ہو جائیں۔ اب جس مغل نے چادریں باندھی تھیں۔ اس نے بیل کی ہڈی اپنے ہاتھ میں لی اور جھنڈوں کی طرف دیکھ دیکھ کر، کچھ اشارے کر کے بعض الفاظ کہے۔ خان اور اس کے گرد کھڑے ہوئے والوں نے (پیالوں میں) گھوڑی کا دودھ لے کر تھوڑا تھوڑا جھنڈوں پر چھڑکا۔ پھر سب نقارے اور بوق (تر ہیا) یکبارگی بجائے گئے اور پوری فوج نے جھنڈوں کی طرف منہ کر کے تین دفعہ جنگی نعرے لگائے۔ اچھل اچھل کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور تین دفعہ جھنڈوں کے گرد سرپٹ دوڑایا اور نعرے مارتے رہے۔

چنگیز خاں نے جیسے قاعدے بنا دیئے تھے ٹھیک اسی کے مطابق یہ مغل آج تک عمل کرتے ہیں۔ ہر شخص کی صفوں میں دائیں بائیں وہی جگہ مقرر ہے جہاں ایک کے باپ دادا کھڑے ہوا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ بھروسے کے لوگ یمین و یسار کے سروں پر دور کھڑے ہوتے ہیں۔۔ دوسری صبح پھر فوج نے بڑا دائرہ بنایا لیکن یہ شکار کھیلنے کی غرض سے تھا۔''

صحرائی جنگ آزماؤں کی ان قدیم رسوم سے بابر کو زیادہ دلچسپی نہ ہو سکی۔ وہ مہمان کے طور پر شریک ہوا اور چونکہ یونس خاں کا نواسہ تھا۔ اس کی ان تقریبات میں عزت و توقیر مرعی رکھی گئی۔ پھر اگلے دن گیارہ زار میں شکار کھیلا گیا تو پہلی مرتبہ اس نے شکار میں شرکت سے اجتناب کیا اور اس میں شریک ہونے کی بجائے ایک غزل تیار کرنے میں مشغول رہا، جس کا مطلع تھا:

جان کے سوا کوئی دوست مجھے نہ ملا

بجز اپنے دل کے کسی کو میں نے محرم نہ پایا۔''

لشکر میں اس کی پیٹی کا طلائی حلقہ چوری ہوگیا تو اسے حد سے زیادہ ناگواری ہوئی۔

اگلے دن دو تین مغل لشکر سے فرار ہوئے تو اس نے دل میں انہی سے چوری منسوب کی مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔اس پر یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ یہ مہم محض اس کی خاطر مشق کے طور پر چلائی گئی تھی۔لکھتا ہے کہ خان نے کوئی قلعہ نہیں لیا۔کسی دشمن کی گوشمالی نہیں کی۔بس باہر گیا اور واپس آ گیا۔''

تاشقند واپس آ کر بابر کو کوئی آرام واطمینان میسر نہ ہوا۔میدانی علاقے کے اس بزرگ شہر میں جو دریائی شاخوں کے درمیان آباد اور فصیل بند کیا گیا تھا جامع مسجد میں دور دور کے لوگ نئی نئی شکلیں جمع ہوا کرتی تھیں۔بابر کو ان سے کوئی سروکار نہ ہوسکتا تھا۔سمرقند کے کاروان گھنٹیاں بجاتے دور شاہراہ سے گزرتے تو وہ آوازیں اس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھیں۔یہیں سے بھاری مال کے قافلے مشرقی پہاڑوں کی نیلگوں بلندیوں کی طرف مڑ کر چین کی بڑی شمالی شاہراہ پر پڑ لیتے تھے۔تاشقند میں کوئی تاخت تاراج نہیں ہوئی لیکن اہل علم سے جو شہر کی جان ہوتے ہیں۔خالی تھا۔باہر چراگاہوں میں گھوڑوں اور مواشی کی کمی نہ تھی۔لوگ پیٹ بھر کے اچھا گوشت، خشک میوے، تازہ گرم نان کھاتے تھے۔گلی کوچوں میں زندگی کے لطائف وعجائبات پر زبان کھولنے والا کوئی شاعر نہ تھا۔البتہ فقیر روتے جھینکتے بھرتے تھے تو انہیں دینے دلانے کے لئے بابر کے پاس ٹکا نہ تھا۔خان کے دربار میں وہ جاتا تو دو

تین آدمی سے زیادہ جلو میں نہ ہوتے جن سے توقیر ظاہر ہو۔ اسے اس طرح بسر کرنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اپنی افتادِ مزاج کے مطابق اسے آرزو تھی کہ گھوڑا لے اور اس مصیبت سے نکل جائے۔ زیادہ دن کس طرح تھیر سکتا تھا کہ لوگ اس کی بے سروسامانی پر انگلیاں اٹھائیں۔ سوچتا تھا کہ کسی ایسے ملک میں نکل جائے جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ چین کے راستے جانے والے قافلوں کو سامان لاتا دیکھ کر دل میں گدگدی ہوئی کہ وہ بھی اسی طرف نکل جائے۔ حسب معمول اس نے دل ہی دل میں اس منصوبے پر بحث کی کہ کوئی حتمی فیصلہ کر سکے۔ کیا وہ ہمیشہ سے سیر و سفر کا شائق نہ تھا جس سے فرغانہ میں بادشاہ ہو جانے کی ذمہ داریوں نے اسے باز رکھا؟ اب وہ بادشاہی تو قصہ ماضی ہوئی اس کی ماں، اپنی ماں اور چھوٹے بھائی (محمود خاں) کے پاس حفاظت سے رہتی ہے۔ علی ہذا اس کی چھوٹی بہنیں محفوظ ہیں۔ بڑی بہن، اس کے حق میں اچھا ہو یا برا، بہر حال شیبانی خاں کی تحویل میں ہے۔

شیبانی کا دھیان آتے ہی بابر کو ماموں کا گھر چھوڑنے کی ایک تدبیر سوجھی اگرچہ عملاً خان کے گھرانے کا فرد بن جانے کے بعد الگ ہونا سہل نہ تھا۔ تاہم وہ فوراً اپنے مخلص اور دین دار مشیر (بہ تصحیح مترجم) خواجہ ابوالمکارم کے پاس گیا اور دونوں نے مل کر خاصی معقول وجہ سوچ لی جسے خان کے سامنے پیش کیا جائے۔ وہ تھی شیبانی۔ یہ ازبک بابر کے ترکوں اور محمود کے مغول، دونوں کا مشترک دشمن تھا۔ ضروری تھا کہ اس کی قوت اور زیادہ مستحکم ہونے سے پہلے، آج اس کا تدارک کیا جائے۔ آگ کی آنچ نکلنے کے ساتھ ہی اسے بجھا دیتے ہیں ورنہ بھڑک اٹھنے

کے بعد وہ قابو میں نہیں رہتی۔بابر نے برمحل ایک قطعہ تیار کیا جو اس کا ماموں بھی سمجھ سکتا تھا۔اس کا آخری شعر یہ تھا:

مگزار که زه کند کماں را
دشمن که به تیر می تواں دوخت

تجویز تو مرتب ہوگئی۔اب سوال تھا کہ وہ کس طرف جائے؟ خیال آیا کہ کیوں نہ مشرق میں اپنے چھوٹے ماموں کے دربار کا رخ کیا جائے۔بابر اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔اب مشہور رہوا کہ اسے ازبک کے مقابلے میں شریک کرنے کے لیے تاشقند لانے کی غرض سے جارہا ہے۔یہ چھوٹا ماموں چین کی شاہراہ پر تھا بابر نے اپنے بلاد چین کو چلے جانے کی بات کسی کو غالبا ابوالمکارم کو بھی نہیں بتائی تھی۔اس کی ماں ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی اور باقی ساتی رفیق بھی ساتھ چھوڑ کر چل دیتے۔ مگر شیر کے ماموں کے ہاں سے نکل جانے کی یہ اینچ پینچ کی چالیں، چل نہ سکیں۔ خواجہ ابوالمکارم نے اس کے حسب ایما چھوٹے ماموں کے پاس جانے کا، نانی سے ذکر کر دیا اور جیسی توقع تھی فورا خان تک خبر پہنچ گئی اس نے خواجہ کو طلب کیا اور پوچھا کہ بابر سے ایسا نا روا برتاؤ کیا گیا ہے کہ وہ اس طرح جانا چاہتا تھا؟ صریحا خان کو برا معلوم ہوا۔اس نے بھانجے کو جانے کی اجازت نہیں دی۔اس طرح چین کی طرف نکل جانے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔پھر ایک بات ایسی پیش آئی کہ وہ بالکل ختم ہوگیا۔بابر صفائی سے تزک میں اقرار کرتا ہے کہ میرا منصوبہ یونہی رہ گیا۔اصل میں ایک قاصد خبر لایا تھا کہ شمالی بڑی شاہراہ سے اس کا چھوٹا ماموں الچہ خاں (۴۷)

خود تاشقند آرہا ہے۔ (الچھ خان یعنی قتال)۔ اس رسمی اطلاع کے بعد دوسرا ہرکارہ آیا اور بتایا کہ خان تاشقند کے قریب پہنچ گیا ہے۔

یہ محض حسن اتفاق نہ ہوگا۔ قرینہ غالب یہ ہے کہ بڑے خان کو بابر اور ازبکوں کے مسئلے پر غور کرنے سے وہی تجویز مناسب معلوم ہوئی جو بابر نے اپنے چین جانے کا حیلہ کرنے کے لیے بنائی تھی۔ یعنی کہ دونوں خان بھائی ملاقات کریں اور اپنی فوج اور دماغی طاقت جوڑ کر ایسی تدبیریں نکالیں جس میں بابر کے لیے کچھ کیا جائے اور اسی کے ساتھ خود ان خان بھائیوں کا بھی فائدہ ہو۔ دوسری طرف یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بابر نے اس واقعے کی ایسی کوئی توجیہہ نہیں کی وہ اس عمر میں واقعات کی علت پر توجہ نہیں کرتا تھا۔ بظاہر اس نے الچھ خاں کے آنے کو اتفاقی ہی سمجھا مگر کام کرنے پر فوراً تیار ہو گیا۔

شہر میں اس کی آمد کا غلغلہ سا مچ گیا تھا۔ پچیس سال سے تاشقند والوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ حقیقت میں وہ پہاڑوں کے اس عظیم جھرمٹ کے پیچھے، جو ہندوکش، سطح مرتفع تبت اور جانب مشرق کوہستان تھیان شان کے ملنے سے بنا ہے، چھپ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ آخری نام تک جس کے معنی آسمانی پہاڑ ہیں، غیر ترکستانی، یعنی چینی ہے۔ اس کی چراگاہیں ارض مغول کہلاتی تھی۔ قتال کا عرف اس بنا پر پڑا کہ بدوضع قزق گروہوں کو جو ازبک جتھے کو چھوڑ آئے تھے۔ اس نے کئی میدانی معرکوں میں شکستیں دیں۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے اصلی جم بھوم، طلوع آفتاب کی سرزمین مشرق سے آ رہا تھا۔ چغتے کا سچا وارث وہی تھا اگر چہ عمر

میں چند سال بڑے ہونے کی وجہ سے یہ منصب برائے نام محمود خاں کو مل گیا۔ دونوں خانوں کی ماں دوڑی دوڑی پھر رہی تھی۔ ایلچی کے ہمراہ کتنے آدمی ہیں۔ اب کتنی دور رہ گیا ہے؟ انتظامات کے احکام دینے میں مصروف تھی کہ کیا کیا کھانے کھلائے جائیں گے۔ کہاں اتارا جائیگا۔ پھر فرودگاہ کی درستی، شاگرد پیشوں کو جمع کرا رہی تھی۔ فرصت ملتے ہی بہنوں بیٹیوں کو ہمراہ لے کر وہ خود بھی بیٹے لولا نے اسی راستے پر روانہ ہوگئی۔ مغلوں کا دستور تھا کہ مہمان کی عزت وتوقیر کا اندازہ اس فاصلے سے لگاتے تھے جتنی دور میزبان اس کے استقبال کو آئیں۔۔۔۔۔ اور خان کو چک نے آنے کی اطلاع بھی تو بہت دیر میں کرائی تھی۔

شہزادیاں آگے تک گئیں مگر بابر ان سے بھی آگے گیا۔ دل کہتا تھا کہ اسے اپنے انجانے ماموں سے اوروں سے پیشتر ملنا اور گفتگو کرنی بہتر ہے۔ لکھتا ہے کہ بیگمات کو ایک گاؤں میں چھوڑ کر میں بعض مقابر دیکھنے کے لیے آگے علاقے میں نکل گیا۔ یکا یک چھوٹے ماموں سے راستے میں آمنا سامنا ہوا۔ میں رکا، اس نے بھی باگ روکی۔ وہ کچھ سٹ پٹایا کیونکہ غالبا گھوڑے سے اتر کر قاعدے قرینے سے ملاقات کرنی چاہتا تھا۔ ان رسمیات کا وقت نہ تھا۔ خود گھوڑے سے کودا۔ گھٹنوں پر جھکا اور بغل گیر ہونے سے پہلے سیدھے ہو کر رو در رو کھڑا ہوا۔ انہوں نے فورا مضطریانہ اپنے لڑکوں کو جو تیرہ چودہ برس کے تھے آواز دی کہ مجھے آداب بجالاویں اور گلے لگیں۔ پھر میں سوار ہو کر انہیں شاہ بیگم (والدہ) کے پالایا وہ سب آپس میں ملے۔ بہنوں کو خان نے اتنے دن میں دیکھا، پہچانا پھر سب بیٹھ کر آدھی رات تک اپنی رام

کہانیاں سناتے رہے۔

خان کوچک الجثہ بہادر آدمی تھے۔ان کا دل پسند ہتھیار تلوار تھی۔کہا کرتے تھے کہ گرز و تبر لگے بھی تو ایک جگہ لگتے ہیں۔(بہ تصحیح مترجم) تلوار سر سے پاؤں تک کاٹ جاتی ہے۔چنانچہ تلوار ہمیشہ ہاتھ میں یا کمر سے بندھی رکھتے اور کبھی جدا نہ کرتے تھے۔چونکہ دور دست دیہات میں پرورش پائی تھ۔گفتار و اطوار میں کس قدر درشتی تھی۔''

لیکن یہ رسم پرست مغل بھانجے سے پہلی ملاقات کا بے ڈھنگا پن نہیں بھولا۔ دوسرے دن باقاعدہ مغل دستور کے مطابق اس نے بھانجے کو تحفہ تحائف دیئے (حالانکہ بے چارے بابر کے پاس کوئی چیز نہ تھی کہ نذر کرتا)

''اس نے مجھے خود اپنے ہتھیار، ایک گھوڑا مع زین اور پورا خلعت دیا جسمیں اونی مخملی ٹوپی، چینی اطلس کارچوبی کام کی قبا اور چینی زرہ بکتر شامل تھے۔رسم قدیم کے مطابق بائیں طرف خریطہ لٹکایا گیا جس میں پتھر (چق متی) کی تختی اور ایک بٹوا تھا اور دائیں جانب تھیلی میں عورتوں کی انگوٹھیاں چھوٹی عطر دانی کی وضع کی تھیں۔''

اس عرصے میں بڑے خان چار فرسخ تک بڑھ کر آئے اور بھائیوں میں ملاقات پوری رسوم و آداب کے ساتھ کہ دور افتادہ دیہات کے مغول کو بھی شکایت کی گنجائش نہیں رہی، انجام پائی۔سڑک کے کنارے شامیانہ ڈال کر محمود خاں مسند پر متمکن ہوا خان کوچک گھوڑے پر سیدھا وہاں تک آیا دائیں سے بائیں کو گرد چکر کاٹا پھر سامنے گھوڑے سے اترا اور آداب گاہ تک بڑھ کر نو دفعہ جھکا۔پھر آگے

بھائی کو گلے سے لگائے رکھا، الگ ہوکر دوبارہ کان کوچک نے آداب گاہ پر نو بار تنظیمی رکوع کیا اور اسی طرح تحائف گزارنتے وقت ۔ پھر وہ آکر بھائی کے پاس بیٹھا۔۔۔ جب میں اس مغلی خلعت وغیرہ کو پہنے ہوئے چھوٹے ماموں کے ہمراہ تاشقند میں آیا تو خواجہ ابوالمکارم تک نے مجھے نہیں پہچانا۔ پوچھنے لگے یہ کون سا سلطان ہے؟ جب میں نے بات کی تب اس نے پہچانا۔

حقیقت یہ ہے کہ ماموؤں کی ان جدت ریت رسموں میں بابر کوئی موزوں حصہ دار نہ ہوسکا اور ان کے مشوروں سے بھی الگ ہی رکھا جاتا تھا۔ تاہم جب انہوں نے اپنی مسلح فوجوں کو صف بندی کرا کے باہمی ملاپ کی رسم مغلی طرز پر ادا کی تو وہ خوش ہوا۔ اس جائزے میں اس نے دیکھا کہ خان کوچک صرف دو ہزار شمشیر زن لایا تھا۔ پوری سپاہ کا تخمینہ تیس ہزار سوار مسلح ہوتا تھا۔ اس طرح فوجی جمعیت اور اقتدار کے لحاظ سے بھی بالا دستی بڑے خان کو حاصل تھی ۔ وہ مل کر تنبل کی مزاحمت کا بہ آسانی خاتمہ کر سکتے تھے اور انہوں نے کہا بھی یہی کہ اس باغی کو فرغانہ سے نکال باہر کریں گے۔ جس وقت بابر کو ایک فوج کا سپہ سالار بنا کر آگے بھیجا گیا تو وہ بہت مسرور ہوا اور عالم سرور میں اتنا بھی نہ سوچا کہ جو فوج اسکے ماتحت چلی وہ اس کیساتھ کوئی وابستی نہ رکھتی تھی ۔ بلکہ محض دونوں خانوں کے حکم سے، جو ساتھ میں نہ آئے تھے، لڑنے نکلی تھی ۔

اندھیرے میں تیر چلانا

بابر نے تو فوراکوچ شروع کیااور حد سے سوا احتاط ماموؤں کودریا کے ایک طرف چھوڑ کر دوسرے کنارے پہنچ گیا ۔ ماموں بہت دیکھ بھال کرتے ہوئے شمالی کنارے پر تنبل کی فوج کی طرف بڑھ رہے تھےاوروہ اسی حزم واحتیاط کے ساتھ خندقیں کھود کرمضبوط مورچے لگائے ان کی آمد کا منتظر تھا۔خان جو دعوے کرتے تھے کہ تنبل کو جاتے ہی روند ڈالیں گے ،صرف گھیرا ڈالنے پر قانع رہے۔مگر بابر ایسا تساہل کہاں کرسکتا تھا۔تلوریوں کا سبک پا لشکر زیر قیادت اوراپنی مرضی کا مالک ہوتے ہی اس نے جنوبی کنارے پر یلغار کی۔صبح ہوتے ایک قصبے کی محافظ فوج پر چھاپہ مارا،بستی پر قبضہ کرلیا۔بستی والے خوش ہوگئے۔وادی کے لوگ اس کے جانے سے رنجیدہ ہوئے تھے۔اب جو واپسی کی خبر قافلوں کے ذریعے ہر مسجداور سرائے میں قریہ بہ قریہ پھیلی تو قلعہ والوں نے دروازے کھول دیئے۔خانہ بدوش قبائل گھوڑوں پر چڑھ چڑھ کراس کے لشکر میں آملے۔پرانے رفیقوں کو بھی ہمت ہوئی کہ اپنی اپنی جمعیتوں کو لے کر پھر حاضر ہوجائیں۔وادی کے سرے پر اندجان والے بھی اس کے مشتاق تھے۔تنبل ان سے بہت دور تھالا محالہ بابر کو اپنے اصلی شہر میں جا پہنچنے کا خیال آیا۔اس نے ٹھیر کر یہ بھی نہ سوچا کہ اب اس کے اردو میں فرغانہ کے جنگ آزما اور بیرونی مغل دونوں بھرے ہوئے ہیں۔لکھتا ہے میرے ذہن میں آیا کہ راتوں رات اندجان کے قریب پہنچ کر وہاں کے شیوخ اور عمائد کے پاس کسی آدمی کو بھیجا جائے کہ شہر والے مجھے قلعہ مین پہنچانے کی کوئی تدبر بتائیں۔چنانچہ

ایک شام کو میں اوش سے چل کر آدھی رات کے قریب اندجان کے دروازوں سے کوئی دو میل فاصلے پر بہ مقام ''چل ختران'' آیا اور قنبر علی اور چند سرداروں کو آگے بھیجا کہ چپکے سے ہمارے قاصد کو شہر میں پہنچا کے وہاں کے عمائد کو اطلاع دے دیں۔ خود ہم اسی جگہ ان کے انتظار میں گھوڑوں پر ہی بیٹھے رہے۔ رات کی تیسری گھڑی تک بعض کو اونگھ آئی۔ ہرنوں پر جھک گئے۔ بعض سو گئے۔ یکایک جنگی نعروں اور طبل جنگ کی آواز آئی۔ میرے آدمیوں کو جو غافل اور غنودہ تھے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ دشمن کی تعداد کتنی اور ہم کتنے فاصلے پر ہے۔ صف بندی کرنے کی بجائے گھبرا کر بھاگ پڑے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر ہی کا راستہ لیا۔ مجھے ان کے درمیان جانے کی فرصت نہ تھی۔ سیدھا دشمن پر جھپٹا حالانکہ صرف تین سوار میرے پیچھے رہ گئے تھے۔ تھوڑی دور بڑھا تھا کہ دشمن تیر چلاتے، نعرے لگاتے ہم پر آ پڑے۔ ایک سوار جس کے گھوڑے کی پیشانی سفید تھی میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے گھوڑے کے تیر مارا کہ وہ گر کر مر گیا۔ دوسروں نے باگ روک لی۔ میرے ساتھیوں نے کہا، بڑا اندھیرا ہے، خبر نہیں ہمارا مقابلہ کتنوں سے ہے۔ بہتر ہے کہ پلٹ کر پہلے اپنے سپاہیوں کو جمع کریں۔ ہم الٹے پھرے۔ اپنے آدمیوں کو جا لیا۔ بعض کے چابک بھی مارے مگر انہیں ٹھیرانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لہذا پھر ہم چار تعاقب کرنیوالوں کی طرف پلٹے اور تیر برسائے۔ وہ ذرا رکے لیکن دوسری تیر باری کے بعد سمجھ گئے کہ ہم صرف چار آدمی ہیں تو پھر بھاگنے والوں پر ڈپٹے اور انہیں گھوڑوں سے گرانے لگے۔ ہم نے تین چار دفعہ حملہ آوروں سے اپنے لوگوں کو

بچانے کی کوشش کی۔کوئی چھ میل تک اسی طرح پیچھا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ قرابوق کی پہاڑی پر پہنچے۔وہاں مبشر ہم سے آملا۔ میں نے کہا دشمن کی تعداد زیادہ نہیں۔ آؤان پر ایک اور دھاوا کریں۔ ہمارے اس حملے نے ان کو بڑھنے سے روک دیا (وہ لڑائی روکنے کے لیے پکارے) اس پر ہمارے مفرور سپاہی بھی ادھر ادھر سے آ کر جمع ہو گئے۔پھر بھی بہت سے آزمودہ کار جنگ آزما، تک کہیں نہ ٹھیرے، بھاگتے ہی رہے۔

''یہ افسوس ناک واقعہ اس طرح پیش آیا کہ خود ہمارے لشکر سے ایوب بیگ چک کے (دستے) کچھ مغل اوش سے کھسک آئے اندجان کی نواح میں لوٹ مار کر رہے تھے۔میرے لشکر کی آمد سے جوشور کی آوازیں سنیں تو دبے پاؤں قریب آئے اور پھر پلول بولنے میں غلطی ہوگئی۔اس رات ساری فوج کے پلول کے دو لفظ تاشقند اوراس کا جواب سیرام یا پہلے سیرام کہیں تو اس کا جواب تاشقند مقرر تھا۔ان مغلوں کی ہمارے ہراول سے مٹھ بھیڑ ہوئی جن کا سردار محمد علی (غالباً بابر کا کتاب دار) تھا۔مغلوں نے تاشقند کا لفظ پکارا۔محمد علی تاجیک تھا۔اس کے منہ سے گھبراہٹ میں تاشقند،تاشقند نکلتا رہا۔مغل سمجھے یہ کوئی دشمن کا لشکر ہے۔نعرہ جنگ اور گھوڑوں کے طبل بجا کر تیر مارنے شروع کیے اس طرح سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔میرا منصوبہ پورا نہ ہوا۔ہم سب اوش واپس آ گئے۔

اپنا پائے تخت جسے کئی سال سے نہ دیکھا تھا۔واپس لینے کا پہلا اقدام تو جھوٹا خوف پیدا ہو جانے سے ناکام رہا لیکن دوسری دفعہ کی قسمت آزمائی میں وہ پھر

خلاف احتیاط کام کرنے کی وجہ سے واقعی خطرے میں مبتلا ہوا۔ مغلوں کے سب پا لشکر کے اندجان کے قریب پہنچ جانے سے تنبل کو خواہی نخواہی عاجلانہ دریا پار کر کے شہر کی حفاظت کو ادھر آنا پڑا۔ راستے میں اس کی فوج کے کچھ سپاہی بھی ٹوٹ ٹوٹ کر ہردل عزیز بابر کے مغل لشکر میں آ ملے۔ تنبل کے کمزور ہو جانے کی خبر سن کر بابر ہی نے یلغار کی اور ایک بار گھوڑا دوڑاتا ہوا (بہ تصحیح مترجم) اہل قلعہ کی ایک فوج پر جا پڑا اور انہیں بھگاتا ہوا شہر کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ جہاں اسی کے آزمودہ کار سرداروں نے اسے روکا جنہیں پسند نہ تھا کہ رات کے وقت قلعہ بند شہر کے اندر داخل ہو جائیں۔ بابر کی یہ رائے نہ تھی مگر سن رسیدہ مشیروں کی بات حسب معمول قبول کر لی اگرچہ تزک میں یہ لکھے بغیر نہیں رہا کہ ایسا کرنا غلط تھا جس کی وجہ سے تمام مغل سواروں کو نواح شہر سے سمیٹ کر شب گزاری کے لیے کوئی پڑاؤ ڈھونڈنا پڑا۔

''عشا کے قریب ہم ایک ندی اتر کر موضع رباط زورق کے نزدیک خیمہ زن ہوئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ تنبل اس وقت بڑے راستے سے اندجان جا رہا ہے لیکن میری جوانی کی ناتجربہ کاری سے ایک چوک یہ ہوئی کہ ہم گاؤں کے قریب ہموار میدان میں اتر پڑے بجائے اس کے کہ ندی کے کنارے اترتے جو ہماری حفاظت کرتی۔ مزید برآں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر قراول یا طلایہ کے پہرہ تک مقرر نہیں کیے اور سب سو گئے۔ ہم خواب راحت کے مزے ہی لیے رہے تھے کہ طلوع آفتاب سے ذرا پہلے قنبر علی گھوڑا دوڑاتا اور پکارتا ہوا آیا اٹھو دشمن آ گیا۔ آواز یدے کروہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں اپنی کفتان (زرہ) پہنے ہوئے تھا اور زمانہ امن میں بھی میرا معمول یہی تھا۔ فوراً اٹھا تلوار باندھی ترکش سنبھالا اور گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ میر انشان بردار بھی سوار ہوا اور چونکہ جھنڈے کو اسکی بیٹھک میں جمانے کی فرصت نہ تھی، ہاتھ میں اٹھائے ہوئے چلا۔ ہم دشمن کی طرف بڑھے تو دس پندرہ سپاہی میرے جلو میں تھے۔ دشمن کے قراول سے ایک تیر کے پرتاب پر شاید صرف دس آدمی میرے ہمراہ رہ گئے۔ ہم نے جھپٹ کر حریف کے سپاہیوں پر تیر باری کی اور دباتے ہوئے چلے۔ وہ ہٹ گئے تو ایک بار اور تیروں کی باڑ مار کر ہم دشمن کے قلب لشکر کے سامنے پہنچ گئے۔ احمد تنبل سو آدمیوں کے ساتھ اسی جگہ تھا۔ وہ اور ایک اور شخص صف کے آگے کھڑے پکار رہے تھے۔ مارو مارو انہیں مارو۔ لیکن اس کے آدمی کھڑے ہچر مچر کر رہے تھے گویا دل میں کہہ رہے ہیں کہ بھاگ جائیں یا نہ بھاگیں؟

اس عرصے میں میرے پاس فقط تین آدمی، ناصر دوست، قلی کوکلتاش اور ترکمان رہ گئے تھے۔ میں نے وہ تیر جو انگوٹھے کے نیچے دبا رکھا تھا۔ تنبل کے خود کے چھجے کا نشانہ لے کر چلا دیا۔ ترکش میں ہاتھ ڈال کر دوسرا تیر کھینچا تو بجائے تیر کے مرمت کی نئی چھڑ (گوشہ گیر) جو خان کو چک نے دی تھی، نکلی۔ میں نے جھنجھلا کر اسے ترکش میں واپس ڈالا۔ اس میں اتنی دیر لگی کہ دو تیر چلا سکتا تھا۔ تیر کمان میں جما کر میں پھر آگے جھپٹا تو میرے ساتھی تینوں پیچھے ٹھٹک رہے اور مقابلے میں سامنے سے دو سوار آئے۔ ان میں آگے خود تنبل پوری طرح مسلح تھا۔ میرے پاس کمان اور صرف تلوار تھی۔ میں نے تیر جوڑ کر کمان کان تک کھینچی اور تیر چلا دیا۔ اسی لمحے ایک تیر میری

دائیں ران پر لگا اور اندر تک گھس گیا۔ میرے سر پر خود کی بجائے گدہ دار کلاہ (طاقی) تھی تنبل کی تلوار اسی پر ایسی پڑی کہ میں سن ہو گیا۔ کلاہ ذرا نہیں کٹی لیکن سر میں سخت ضرب آئی۔ تلوار کو صاف نہیں کیا تھا، وہ زنگ کی وجہ سے جلد کھینچ نہ سکی۔ تامل کا وقت نہ تھا، دشمن مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ میں نے باگ موڑی اور ایک اور تیر میرے ترکش پر لگا۔ سات آٹھ قدم ہٹا۔ میرے تین ساتھ قریب آ گئے اب کے تنبل نے ناصر دوست کے تلوار ماری۔ ہم پلٹ کر چلے تو انہوں نے ایک پرتاب تیر تک ہمارا پیچھا کیا۔

ہم ندی کی بڑی دھار پر آئے جو گہری اور چوڑی تھی۔ صرف کہیں کہیں سے اترنا ممکن تھا مگر خدا نے صحیح راستہ دکھایا اور ہم وہاں پہنچ گئے جہاں کنارا نیچا اور پار اترنے کا موقع تھا۔ مگر یہاں ناصر دوست کا گھوڑا تھک کر گر پڑا۔ ہم نے اتر کے اسے کھڑا کیا اور پار ہو کے اوش کی بیٹا پر پڑ لئے۔ ٹیکرے پر چڑھے تو مزید طغائی آ ملا۔ وہ بھی زخمی تھا اور اگرچہ ٹانگ کے پار نہیں ہوا تھا مگر مشکل سے اوش تک آ سکا۔ اس روز غیر مسلح ہونے کیوجہ سے میرے کئی بہترین رفیق مارے گئے یا گھوڑوں سے گرا لئے گئے۔''

بابر زخم کی مرہم پٹی کرا رہا تھا کہ اسے یہ سن کر پریشانی ہوئی کہ ماموؤں نے تنبل کے سیر دریا کے پار اتر جانے سے خوشی خوشی بڑھ کر فرغانہ کا رخ کیا اور خان کو چک نے اندجان کے باہر اور بڑے نے ایساغ دولت بیگم کے باغ میں جسے ''قوش تنگیر یاں'' (چڑیا چکی کا باغ) کہتے تھے۔ ڈیرے ڈالے اور فوراً بابر کو بلوایا:

''میں اوش سے آ کر بڑے ماموں سے ملا تو انہوں نے وہ سب مقام (بہ تصحیح مترجم) جو پہلے مجھے دیئے تھے۔ اس عذر سے خان کو چک کو تفویض کر دیے کہ شیبانی جیسا دشمن سمرقند پر قابض اور روز بروز قوی تر ہوتا جاتا ہے (بابر نے اپنے چین جانے کے لئے جو خود بھی یہی سبب پیش کیا تھا)۔ دوسرے یہ کہ چھوٹے خان کے پاس یہاں کوئی علاقہ نہیں، مناسب ہے اس کے لشکر کے لئے سیر کے ادھر کا علاقہ اور اندجان بھی اسے دے دیا جائے۔ شمالی کنارے پراغی کے اضلاع مجھے دینے کا وعدہ کیا۔ پھر یہ بھی کہا کہ فرغانہ کا بندوبست کر کے سمرقند پر فوج کشی کریں گے وہ تم کو دیں گے گا اور فرغانہ کی پوری ولایت خان کو چک کے حصے میں آئیگی۔ غالباً یہ سب مجھے بہلانے کی باتیں تھیں مگر قبول کرنے کے سوا میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ بڑے خان سے مل کر میں چھوٹے خان کے ڈیرے کو جا رہا تھا کہ راستے میں قنبر علی سلاخ ملا اور کہنے لگا تم نے دیکھا کہ جو علاقہ تمہارا تھا وہ بھی انہوں نے ہتھیا لیا۔۔۔ یہ تمہارے کام نہ آئیں گے۔ بہتر ہے کہ اوش میں قلعہ بندی کر کے تم تنبل سے صلح کر و اور ان مغلوں کو مل کر پہلے یہاں سے دفع کرو۔ پھر چھوٹے بڑے بھائی کے حصے لگانے کی بات کرنا۔۔۔ میں نے جواب دیا، خان میرے رشتہ دار ہیں۔ ان کی نوکری کرنا تنبل کے ساتھ مل کر بادشاہی کرنے سے بہتر ہے۔ قنبر یہ جواب سن کر اپنے کہے پر پشیمان ہوا اور تین چار دن بعد چپکے سے اندجان چلا گیا۔

میں چھوٹے ماموں کے پاس گیا تو پہلی ملاقات کی تلافی کے لئے اس مرتبہ وہ مجھے لینے خیمے کے باہر تک دوڑے ہوئے آئے۔ میں ٹانگ کے زخم سے بہ مشکل

چل سکتا تھا۔ خان نے مجھے گلے لگایا اور کہا ''ارے بھائی تجھے تو سب بہادر اور سورما کہہ رہے ہیں۔ پھر خیمے میں بازو پکڑے پکڑے لے گئے۔ خیمہ قزاقانہ وضع کا چھوٹا سا تھا اور کچھ آراستہ یا صاف ستھرا بھی نہ تھا۔ یہاں انہوں نے مجھے خربوزے اور انگور کھلائے۔۔۔ میں رخصت ہو کر اپنے خیمے میں آیا تو انہوں نے اپنا مغل جراح میرے علاج کے واسطے بھیجا۔ وہ نہایت حاذق اور استیکہ بخشی ''یعنی طبیوں کا چھوٹا باپ) کہلاتا تھا۔ کہتے ہیں کسی کا سر پھٹ کر بھیجا نکل آتا تھا۔ تو بھی وہ اس کا تدارک اور معالجہ کر سکتا تھا۔ اس نے بہت سے عجیب علاجوں کا مجھے حال سنایا جو ہمارے (متمدن) ولایت میں نہیں ہو سکتے۔ میرے زخم پر پھلوں کی خشک چھال اور لومڑی کی ٹانگ کی کھال باندھ کر پٹی بندھوائی۔

اس کراماتی پٹی سے زخم کو کیا فائدہ پہنچا، یہ تو معلوم نہیں مگر چند ہی روز میں ہم شیر کو گھوڑے پر سوار نہایت طولانی راستہ طے کرتے دیکھتے ہیں۔ اس کے ماموں نے دوبارہ اسے اخسی پر حملہ کرنے کو مضبوط جمعیت دیکر روانہ کر دیا اور خود اندجان ہی میں رہے۔ پھر اس کے سن رسیدہ سرداروں نے دشمن پر جا پڑنے سے اسے روکا، تزک میں لکھتا ہے کہ اکثر یہی ہوا ہے۔ حالانکہ جب ارادہ کر لیا تو جو کچھ کرنا ہے کر گزرنا چاہیے۔ وقت نکل جانے کے بعد پچھتانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اس عرصے میں ایک خلاف گمان صورت پیدا ہوئی۔ اخسی کا قلعہ دار تنبل کا چھوٹا بھائی شیخ بایزید تھا۔ ازبک کے مقابلے میں بابر کو سمرقند میں تنبل نے جو مختصر فوج اظہار دوستی کے طور پر بھیجی تھی، اس کا سردار بایزید ہی تھا۔ اب اس نے ایک راز دار

قاصد کو بھیج کر بابر سے درخواست کی کہ بلا تاخیر خفیہ قلعہ اخسی میں آ جائے اور بایزید کو اپنی خدمت و جاں نثاری میں لینا قبول کرے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ایک مستحکم قلعہ ہاتھ آ جائے۔ بابر نے اس پیشکش پر غور کیا۔

''اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے چالاکی سے ماموؤں سے توڑ لیا جائے۔ میرے ان سے الگ ہو جانے کے بعد وہ اس وادی میں کچھ نہ کر سکتے تھے۔ عجب نہیں کہ مجھے بلانا اپنے بڑے بھائی تنبل کے اشارے سے ہو اور مغل خانوں سے دور بلا کر وہ میرے ساتھ کوئی عہد نامہ کرنا چاہتے ہوں لیکن میں نے خانوں کو اس بلاوے کی اطلاع کر دی۔ انہوں نے کہا: تم ضرور جاؤ اور جس طرح ہو سکے بایزید کو پکڑ لو۔ مگر ایسی فریب کاری میری خصلت نہ تھی خصوصا جب عہد و پیمان کرنے ہوں میں بد عہدی نہیں کر سکتا تھا تاہم مجھے فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح اخسی پہنچ جاؤں۔ یہ بھی خیال آیا کہ ممکن ہے شیخ بایزید بھائی سے ٹوٹ کر میرے ساتھ ہو جائے۔ پھر کوئی مناسب صورت نکل آئے اور یا وہ اپنی قسمت میرے قسمت سے وابستہ کر دے۔''

زندگی کے تلخ تجربے بھی عمر شیخ میرزا کے بیٹے کو یہ سبق نہ دے سکے تھے کہ سازباز کرنے میں صرف اپنی سمجھ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ حسب عادت اس مرتبہ بھی جو کام کرنے کو دل چاہتا تھا اسکے حق میں حجت نکال کر فیصلہ کر لیا۔ اور جب فیصلہ کر لیا تو پھر اس جال کی طرف دھیان بھی دینا چھوڑ دیا جو اسے پھانسنے کے لئے بچھایا جا رہا تھا۔

''غرض میں نے اپنا ایک آدمی بھیجا اور اس نے بایزید سے قول و قرار کر لئے۔ پھر بایزید کے بلانے پر میں خود چلا گیا۔ وہ استقبال کرنے باہر آیا اور میرے سب

سے چھوٹے بھائی ناصر میرزا کو ساتھ لایا۔ ہم اس کے ساتھ قلعے میں گئے اور اس نے مجھے میرے باپ کے محل میں ٹھیرا دیا۔"

یہی وہ مکان تھا جہاں کبوتر خانہ گرنے سے عمر شیخ میرزا کی وفات ہوئی تھی۔ یہ پہاڑی پر سنگین قلعے کی فصیل کے اندر بنا تھا۔ قلعے ہی میں بایزید کی سکونت تھی۔ یہ بات اندیشے سے خالی نہ تھی مگر بابر کو اس گھر کو دیکھ کر دوازدہ سالہ طفلی کی یادیں آ رہی تھیں۔ پائیں باغ میں باپ کی قبر تھی۔ فصیل کے طاقوں، کنگوروں پر کبوتر اسی طرح غٹرغوں کر رہے تھے۔ قدیم خدمت گار آ آ کر خوشی خوشی چوم رہے تھے۔ بہت سی باتیں چھوٹے بھائی کو سنانی تھیں۔

اب یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ بابر رواں دواں ساعتوں میں زندگی گزارنے کا ایک خاص مزاج رکھتا تھا اور اس کے لیے قریبی ماحول میں غضب کی دل کشی تھی۔ اتفاقیہ صاف راستہ سامنے آیا تو گھڑ دوڑ شروع کر دی۔

سایہ دار مرغ زار میں ندی نظر پڑی تو گھوڑے سے کود کر تھوڑی دیر اس کے کنارے لطف اٹھانے بیٹھ گیا۔ شب خونوں کے تلاطم میں بھی اس کے گھوڑے کے آس پاس جو کچھ گزرتا وہ اس کی ایسی صاف تفصیلات قلم بند کرتا ہے کہ تاریخ اور کوئی شخص ایسی کیفیات نہیں لکھ سکتا۔ اپنے اس پرانے گھر میں چھوٹے بھائی کے ساتھ رہنے میں اپنے ماموؤں سے رسل رسائل کرنا بھی یاد نہ رہا اور نہ وادی کے عام حالات کی زیادہ خبر رہی۔ یزید اس کا ہم عمر، متواضع آدمی تھا اس کا مہمان بن کر اس بات کی بھی فکر نہ ہوئی کہ قلعے اور بستی کے پل پر بایزید کا پہرہ ہے بحالیکہ بابر کے رفقا

منڈی کے چوک یا بیرونی پڑاؤ میں الگ الگ مقیم ہیں اور خود وہ پہاڑی کے کنارے پڑا ہوا ہے۔ غرض پھندا اس طرح لگایا تھا کہ اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔

ادھر جب تنبل اندجان میں زچ ہوا تو اس نے ازبکوں کو مدد پر بلایا، چنانچہ شیبانی خان سمرقند سے چل پڑا تھا۔ اس کی آمد کی خبر نے وادی کے حالات کا رنگ ایک دم بدل دیا، جیسے سیر بین کی تصوریں بدل جاتی ہیں۔ بابر تو دو جا چکا تھا۔ یہاں دونوں خانوں نے مغلی حفظ ماتقدم سے عاجلانہ کام لیا اور دریا (سیر) اتر کے اخسی کے راستے جانے کی بجائے نیچے کے رخ خجند کے معبر سے پار ہو گئے۔ خان کو چک بذات خود منصب مزاج، دین دار آدمی تھا لیکن اس کے قلعہ دار حسب عادت لوٹ مار کرتے ہیں۔ اب جو مغل پسپا ہوئے تو غضب ناک باشندے مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مغلوں سے لوٹ کا مال اگلوایا۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی دانش مند ازبک نے تیموریوں اور مغول پر اس وقت تلوار اٹھائی جب کہ وہ باہمی نفاق و شقاق میں مبتلا تھے۔

دو کھوجیوں کا موت کی تاک لگانا

''میں حمام میں تھا جب جہانگیر میرزا تنبل کی حراست سے نکل کر آیا۔ میں باہر نکلا، اسے دیکھا اور گلے سے لگایا۔ بایزید بہت گھبرایا، حیران تھا کیا کرے کیا نہ کرے؟ جہانگیر اور اس کے ساتھی سردار ابراہیم بیگ چاپوق نے مشورہ دیا کہ بایزید کو پکڑ کر قلعے پر قبضہ کر لینا چاہیے اور سچ یہ ہے کہ عقل کا تقاضا یہی تھا۔ میں نے کہا

میں اس کے ساتھ عہد کر چکا ہوں، عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ ہماری گفتگو کے وقت بایزید باہر حصار میں گیا ہوا تھا۔ ہمیں اس کے پل پر پہرہ دار مقرر کرنے لازم تھے مگر دیکھ بھال تک نہ تھی۔ یہ سنگین غلطیاں ہماری ناتجربہ کاری سے ہوئیں۔ گجر دم تنبل آیا اور دو تین ہزار پورے مسلح لشکریوں کو لئے ہوئے پل اتر کر وہ بھی حصار (ارک) کے اندر آ گیا۔ میرے پاس شروع میں ہی تھوڑے آدمی تھے۔ اخسی میں قیام ہوا تو کچھ سپاہی بیرونی اضلاع یا تھانوں میں بھیج دیئے گئے۔ سو کے قریب میرے پاس رہ گئے تھے۔ ہم نے انہی کو سوار کرا کے مختلف کوچوں کے سروں پر متعین کیا اور جنگ کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ بایزید قنبر علی، نوجوان محمد دوست گھوڑے دوڑاتے ہوئے تنبل کے پاس سے صلح کا پیام لائے۔ میں نے پہرے کے جوانوں کو اپنی اپنی جگہ مستعد کھڑے رہنے کا حکم دیا اور خود ان لوگوں کو لے کر باپ کی قبر پر آیا گھوڑے سے اتر کے جہانگیر میرزا کو بھی بلوالیا۔ شیخ بایزید اور قنبر علی پاس بیٹھے۔ دوست محمد حصار کو واپس چلا گیا۔ ہم مقبرے کے جنوبی مانچے میں گفتگو کر رہے تھے۔ جہانگیر میرزا نے ضرور ابراہیم چاپوق سے مشورہ کر لیا ہوگا، اب میرے کان کہا کہ ان دونوں کو پکڑ لینا چاہیے۔ میں نے کہا، جلدی نہ کرو۔ پکڑنے کا وقت گزر چکا ہے۔ بات سن لینی چاہیے۔ شاید کوئی نتیجہ گفتگو سے نکل آئے۔ یوں بھی ہماری تعداد کم اور وہ بہت زیادہ ہیں۔ پھر وہ قلعے میں اور ہم اس کی بیرونی فصیل پر ہیں۔ شیخ بایزید اور قنبر علی اس دوران میں منتظر بیٹھے رہے جہانگیر نے ابراہیم کو ارادے سے باز رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ یا تو غلط سمجھا اور یا اس بہانے کہ غلط سمجھا تھا۔ بایزید کو لپٹ گیا۔

اچھا نہ کیا۔ ہمارے آدمی جھپٹ کر آئے اور بایزید وقنبر دونوں کو زمین پر گرا دیا۔ صلح کی بات چیت ختم ہوگئی۔ میں نے حکم دیا کہ ان دونوں کو حراست میں رکھا جائے او رلڑائی کے لئے گھوڑے پر سوار ہوا۔

میں نے شہر کی ایک سمت پر جہانگیر کو متعین کیا اسکے اپنے آدمی کم تھے اس لئے کچھ اپنے آدمی بھی اس کو دیئے۔ پہلے اسی کا حصہ دیکھنے گیا۔ پھر دوسرے محلوں کا معائنہ کیا۔ شہر کے وسط میں ایک مسلح کھلا میدان ہے۔ یہاں کچھ سپاہی متعین کئے اور آگے چلا۔ اتنے میں دشمن کے ایک بڑے گروہ نے ان پر ہجوم کیا اور دھکیل کر ایک پتلی گلی میں ہٹا دیا۔ اسی وقت میں پلٹ کر ادھر گیا، اور اپنے مسلح جوانوں کو بڑھا کر دشمن وہ وہاں سے نکالا۔ جس وقت ہم چوک خالی کرا رہے تھے۔ میرے گھوڑے کی ٹانگ میں تیر لگا۔ وہ اچھلا اور اس طرح الف ہوا کہ عین میدان جنگ میں زمیر پر گرا۔ اٹھا تو میرے صاحب قدم (اردلی) کاہل نے اپنے مریل سے ٹٹو سے اتر کر اسے میرے سامنے پیش کیا۔ میں سوار ہوا۔ اپنے آدمیوں کی پورے چوک میں صف بندی کرائی اور دوسرے کوچے کی طرف گیا۔ سلطان محمد لاغری نے دیکھا کہ میں بہت لاغری مریل گھوڑے پر سوار ہوں، تو اپنا گھوڑا مجھے دے دیا میں اس پر سوار ہو اہی تھا کہ قاسم بیگ کا بیٹا زخم کھاتے ہوئے آیا اور خبر دی کہ تھوڑی دیر قبل جہانگیر میرزا پر ایک بڑی جمعیت نے حملہ کیا اور وہ مضطرب ہو کے بھاگا شہر سے نکل گیا۔ میرے سن کر حواس گم ہو گئے۔

اسی وقت سید قاسم جسے ایک (دور کے) قلعے پاپ میں تعینات کیا تھا، قلعہ چھوڑ

آیا۔ یہ اور نامسائد بات ہوئی کیونکہ اس نازک وقت میں بڑی ضرورت تھی کہ کہیں تو کوئی مضبوط قلعہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میں نے ابراہیم بیگ سے کہا اب کیا کرنا چاہیے؟ اسکے زخم خفیف آیا تھا اس کی تکلیف کے باعث یا ہمت ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ کے رہ گیا۔ میرے دل میں آیا کہ پل پر سے راستہ نکالیں اور پار ہونے کے بعد پل توڑ دیں۔ ایک اور جیوٹ بابا شیرزادہ (۳۸) نے بڑے کام کی بات کہی کہ ہمیں سب سے قریبی دروازے سے لڑ کر نکل جانا چاہیے۔ میں نے یہ رائے قبول کی اور ہم دروازے کی طرف چل پڑے ہم ایک کوچے میں داخل ہوئے۔ عقب کی حفاظت سید قاسم اور ناصر دوست نے کی اور (دشمن کے) باقی خیز (۳۹) سے خوب لڑے ابراہیم اور (بہ تصحیح مترجم) میرزا قلی کوکلتاش میرے ساتھ بیٹھے۔ دروازہ شہر پر پہنچے تو دیکھا ادھر سے بایزید دگلا پہنے دو تین کو ساتھ لئے اندر آ رہا ہے۔ وہ صبح کو میری مرضی کے خلاف گرفتار کئے جانے کے بعد جہانگیر میرزا کی حراست میں تھا۔ میرزا اسے لے کر چلا تو بعض لوگوں نے بایزید کو قتل کرنا چاہا لیکن دوسروں نے اسے چھوڑ دیا۔ دروازے میں داخل ہو رہا تھا کہ میرا سامنا ہوا۔ جو تیر میری شست میں دبا ہوا تھا، میں نے پورا کھینچ کر چلا دیا۔ نشانہ بہت اچھا تھا لیکن اس کی صرف گردن کو چھیلتا ہوا نکل گیا۔ وہ بدحواس ہو کر دائیں کو مڑا اور ایک گلی میں بھاگا۔ میں پیچھے چلا۔ کوکلتاش نے ایک پیادے پر بھاری لٹھ مار کر فرش کر دیا۔ وہ آگے چلا تو قریب ایک اور پیادے نے ابراہیم بیگ پر تیر کا نشانہ باندھا۔ ابراہیم نے ''ہے ہے'' کا نعرہ لگا کے اسے ڈرا دیا اور آگے بڑھ گیا۔ تب اس پیادے نے

اتنے قریب سے جتنی ڈیوڑھی کی سیڑھی ہوتی ہے، وہ تیر مجھ پر چلایا اور میری بغل میں لگا۔ میں قلماقی زرہ پہنے تھا، اس کے دو پتیر کٹ گئے۔ وہ بھاگا۔ میں نے اس پر تیر چلایا۔ اسی لمحے فصیل پر ایک پیادہ بھاگا ہوا جا رہا تھا۔ میرے تیر نے اسکی ٹوپی کی چندیا چھید کر اسے کنگورے سے چپکا دیا۔ وہ کھلتی پگڑی کو سنبھالتا ہوا بھاگ چلا گیا۔ پھر ایک سوار بایزید کے پیچھے دوڑتا جا رہا تھا۔ میرے قریب سے گزرا۔ میں نے تلوار ماری،۔ اس کی نوک گدی پر لگی وہ جھکا اور گلی کی دیوار سے ٹکرا کر بہ مشکل فرار ہوا۔ اسطرح ہم نے دشمن سے دروازہ خالی کرالیا۔ وہیں جمع ہوئے لیکن صلاح مشورے کی گنجائش نہ تھی۔ اس طرح ہم نے دشمن سے دروازہ خالی کرالیا۔ وہیں جمع ہوئے لیکن صلاح مشورے کی گنجائش نہ تھی۔ ہم کوئی دوسو آدمی تھے اور حصار کے اندر دشمن کی تعداد دو ہزار سے کم نہ تھی۔ میرے آدھے آدمی جہانگیر کے ساتھ جا چکے تھے اور اسے گئے اتنی دیر ہو چکی تھی جتنی دیر میں دودھ میں ابال آتا ہے۔ پھر بھی میری ناتجربہ کاری دیکھیے کہ ایک ہرکارہ اس کے عقب میں دوڑایا کہ اگر تم قریب ہو تو واپس آؤ۔ پھر مل کر حملہ کریں گے، حالانکہ اس کا وقت نکل چکا تھا۔ ابراہیم بیگ یا تو اس لئے کہ گھوڑا بہت تھک گیا تھا اور یا اپنے زخم کی تشویش کی وجہ سے کہنے لگا۔ میرا گھوڑا تو ختم ہوا۔'' اس پر مبشر کے ایک ملازم نے بڑی ہمت کی کہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور اسے ابراہیم بیگ کو دے دیا۔ کسی نے اس سے کہا نہ تھا کہ یہ کرے۔ اوروں نے بھی اس وقفے میں کہ ہم دروازے پر استادہ تھے۔ دلیری دکھائی یہاں تک کہ جہانگیر میرزا کے لئے جو ہرکارہ گیا تھا واپس آیا اور بتایا کہ دیر ہوئی وہ دور نکل چکا ہے

''اب ہم روانہ ہوئے۔ حقیقت میں اتنی دیر ٹھیرنا ہی غلط فیصلہ تھا۔ ہم چلے تو دشمن کے بہت سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے پل کے سرے تک آ گئے۔ میرے جلو میں بیس تیس رفیقوں سے زیادہ نہ تھے ایک پہلو سے قاسم کے بیٹے نے ابراہیم بیگ کو آواز دی کہ اپنی سپہ گری کی بہت شیخیاں ہانکا کرتے ہو، آؤ میرے ساتھ چلو، یہ موقع تلوار کے ہاتھ دکھانے کا ہے، ابراہیم بیگ نے جواب دے، کس نے منع کیا ہے تجھے آ جا۔'' یہ دیوانے اس ہزیمت کی حالت میں بھی اپنی دلاوری دکھانا چاہتے تھے۔ یہ ہمت آزمائی کا کہ ہم سے کو چلنے میں دیر ہو، بھلا کیا وقت تھا؟ ہم نے باگیں اٹھائیں۔ پوری رفتار سے گھوڑے چھوڑ دیے۔ مگر دشمن بھی دباتا چلا آتا تھا اور ایک ایک کر کے ہمارے سواروں کو آ لیتا تھا۔

''اخسی سے دو میل کے اندر گنبد چمن ایک مقام ہے۔ اس سے گزر رہے تھے کہ ابراہیم بیگ نے مجھے مدد کے لئے پکارا۔ مڑ کر دیکھا تو بایزید کے ایک خانگی غلام سے وہ لڑ رہا تھا۔ باگ کھینچ کر پلٹنا چاہتا تھا کہ قلی خان جو پہلو میں تھا باگ پکڑ لی اور کہا یہ وقت پلٹنے کا نہیں ہے اور مجھے تیز تیز بڑھائے ہوئے لے چلا۔ اخسی سے چار میل، مقام سنگ تک پہنچے۔ میرے اکثر ساتھی گرائے جا چکے تھے (اتفاقاً یا بالا ارادہ یہ لوگ شمالی پہاڑوں کی سرحد کی طرف جا رہے تھے جہاں سے سنگ ندی نکلتی تھی۔ اس کی بالائی گھاٹی پر پہنچ کر محفوظ ہو جاتے اور بائیں کو مڑ کر تاشقند کا راستہ پکڑ سکتے تھے۔ دونوں خان بھی تاشقند کو بھاگ رہے تھے)

سنگ کے قریب کوئی پیچھا کرنے والا نظر نہ آیا تو ہم اس گاؤں کے قریب سے ندی کے کنارے کنارے چلنے لگے اب ہم کل آٹھ رہ گئے تھے۔ ناصر دوست، قاسم بیگ کا لڑکا۔ میرزا قلی کوکلتاش اور چار اور تھے۔ ندی کے علاوہ ایک بٹیا پہاڑیوں میں بل کھاتی شارع عام سے دور، چلی گئی تھی۔ اس پر چلتے رہے یہاں تک کہ ندی کو دائیں پر چھوڑا اور دوسرے راستے سے چل کر مسلح میدان میں آئے عصر کے قریب کا وقت تھا۔ اتنے میں مجھے ایک دور سیاہی سی نظر آئی۔ ساتھیوں کو آڑ میں کر کے میں بلندی پر چڑھا کہ دیکھوں کیا چیز ہے۔ یکا یک ہمارے عقب کے راستے سے کچھ سوار ہم پر ٹوٹ کر گرے بغیر دیکھے کہ کتنے ہیں، ہم گھوڑوں پر چڑھ کر نکل گئے۔ حقیقت میں وہ بیس یا پچیس سوار تھے اور ہم آٹھ تھے کہ اگر پہلے ٹھیک معلوم ہو جاتا تو جم کر مقابلہ کر سکتے تھے۔ لیکن ہم سمجھتے ان کے عقب میں بڑی جمعیت ہوگی۔ دوڑے چلے گئے۔ سچ یہ ہے کہ بھاگنے والے زیادہ ہوں تو بھی کم تعداد پیچھا کرنے والوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مشہور ہے۔

صف مغلوب راہوئے سند است

(بہ تصیح) خان قلی نے کہا ہم اس طرح نہیں چل سکتے۔ سب کے سب پکڑے جائیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ دو گھوڑے چن لیں اور آپ میرزا قلی کوکلتاش ایک ایک گھوڑا کوتل لیکر تیز تیز نکل جائیں۔ شاید بچ جائیں۔ یہ اچھا مشورہ تھا، کیوں کہ سب مل بھی مقابلہ تو نہ کر سکتے۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ ہم دو ان سے بہت آگے نکل جائیں۔ جیسا اس نے کہا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ دشمن کے راستے دو کو

پیدل کر جاؤں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ایک کر کے خود ہی گرتے چلے گئے ۔

میرا گھوڑا تھک چلا تھا۔ خان قلی اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اسے میرے حوالے کیا۔ میں اچھل کے اس کے گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ میرے گھوڑے پر ۔ اسی وقت دشمن نے ہمارے دو اور آدمیوں کو جو پیچھے رہ گئے تھے، گرا لیا۔ خان قلی بھی پیچھے چھوٹ گیا ۔ اسے مدد دینے کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ ہم جو باقی رہے جس قدر تیز ہو سکتا تھا ، گھوڑے دوڑاتے چلے جاتے تھے ۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی مضمحل ہو گئے ۔ ناصر دوست بیگ بھی لڑکھڑاتا کر رک رہا۔ میرا گھوڑا بھی تھکنے لگا۔ قاسم بیگ کے بیٹے نے اپنا گھوڑا مجھے دیا، میرے پہ خود سوار ہو گیا۔ خواجہ حسینی لنگڑا تھا اس نے ٹیکروں کا رخ کیا اب میں اور میرزا کوکلتاش رہ گئے اور ہمارے گھوڑے بھی سرپٹ نہ دوڑ سکتے تھے۔ پوسیا ہو گئے اور اسکا اور بھی سست چلنے لگا۔

میں نے اس سے کہا تجھ سے الگ ہو کر کہاں جا سکتا ہوں ۔ ہمارا مرنا جینا ساتھ ہو گا، جیسا بھی ہو ۔ چلا آ ۔ میں اسے مڑ مڑ کے دیکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کہا، میرے گھوڑے میں دم نہیں رہا۔ تم میرے ساتھ رکو گے تو خود بھی نہیں بچ سکتے ۔ بہتر ہے کہ بڑھے جاؤ۔ شاید سلامت رہ جاؤ۔ میری عجیب حالت ہوئی آخر وہ بھی پیچھے چھوٹا اور میں تنہا رہ گیا۔

دشمن کے بھی اب دو ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ ایک (یہ تصحیح مترجم) بابائے سیرانی دوسرا بندہ علی ۔ میرے گھوڑے کے مضمحل ہونے سے وہ نزدیک تر آ رہے تھے ۔ پہاڑ ابھی کوس بھر دور تھا۔ سامنے ہی چٹانوں کا ایک ٹیکر انظر پڑا ۔ میں نے

سوچا گھوڑا تھک چکا ہے۔ پہاڑ ابھی فاصلے پر ہے، اب کیا کیا جائے؟ میرے ترکش میں کم سے کم بیس تیر تھے۔ خیال آیا اس ٹیکرے پر اتر جاؤں اور یہاں سے جب تک تیر باقی ہیں مقابلہ کروں۔ پھر سوچا کہ پہاڑوں تک پہنچ گیا تو گھوڑا چھوڑ کر تیر کمر بند میں لئے ہوئے اوپر چڑھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے چڑھنے کی قوت پر بھروسہ تھا۔ اسی خیال سے آگے بڑھے گیا۔

اب گھوڑا دلکی بھی نہ چل سکتا تھا اور پیچھا کرنے والوں دونوں سوار تیر کے پاتاب پر آ گئے تھے۔ میں تیر بچائے رکھنا چاہتا تھا۔ ان پر نہیں چلایا اور ادھر وہ بھی احتیاطاً دور رہی سے پیچھا کرتے رہے۔ سورج غروب ہوتے میں پہاڑ کے قریب آ گیا۔ یکا یک انہوں نے پکار کر کہا، اس طرح تم کہاں جاؤ گے؟ جہانگیر میرزا کو گرفتار کر کے لے آئے ہیں۔ ناصر میرزا بھی قید میں ہے" یہ کلمات سن کر مجھے پریشانی ہوئی اور سمجھا کہ اگر ہم تینوں پکڑے گئے تو یہ نہایت خطرناک بات ہوگی۔ میں نے جواب نہ دیا اور پہاڑ کے پہلو پر چلتا رہا۔

خاصی دور چلنے کے بعد انہوں نے پھر آواز دی اور اس مرتبہ گھوڑوں سے اتر کے ذرا ادب سے بات کی۔ میں نے کوئی توجہ نہ کی اور یک نلے میں گھس کر اوپر چڑھنے لگا۔ عشا کی نماز کے وقت ایک بڑی چٹان ملی جو خاصے مکان کے برابر تھی۔ اس کے عقب میں ایسے چھجے نکلے ہوئے تھے کہ گھوڑا ان پر نہ چل سکتا تھا۔ اب ان پیچھا کرنے والوں گھوڑوں سے اتر کر پھر زیادہ خادمانہ ادب کے ساتھ مجھ سے خطاب کیا۔ انہوں نے کہا "اس اندھیرے میں بغیر راستے کے آپ کہاں جا رہے ہیں اور

منشا کیا ہے؟ احمد تحنل آپ کو آپ کے تخت پر بٹھانا چاہتا ہے؟؟ انہوں نے قسم کھائی کہ یہ سچ بات ہے۔ میں نے کہا ''مجھے اطمینان نہیں ہوتا میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ اگر تم واقعی میری کوئی خدمت کرنی چاہتے ہو تو ایسا موقع سالہا سال تک نہیں ملے گا۔ تم مجھے وہ راستہ بتادو جس سے میں خانوں کے پاس جاسکوں۔ اگر تم ایسا کرو گے میں تمہاری خواہش سے بڑھ کر سلوک کروں گا۔ لیکن یہ نہ کرسکو تو پھر جدھر سے آئے ہو ادھر ہی واپس چلے جاؤ۔ یہ بھی اس وقت میری خدمت ہوگی۔'' انہوں نے کہا کاش کہ خدا ہمیں یہاں نہ لاتا مگر جب آ گئے ہیں تو آپ کو ایسی جگہ تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں چلتے تو جہاں آپ جائیں، ساتھ چلیں گے۔

میں نے کہا قسم کھاؤ کہ سچ کہتے ہو۔ انہوں نے حلفیہ عہد کیا اور مجھے بھی قدرے اعتبار آیا۔ میں نے کہا ''اس نلے کے قریب مجھے بڑا راستہ بتایا گیا تھا مجھے اس پر لے چلو'' ان کے حلف کرنے کے باوجود میں نے ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا بلکہ انہیں آگے رکھا اور خود پیچھے چلا۔ کئی میل چل کر ایک پہاڑی ندی کی گزرگاہ ملی۔ میں نے کہا میدان کا رستہ یہ نہیں ہوسکتا۔

وہ ذرا ہچکچائے۔ پھر ہٹ کر بولے۔ وہ آپ کی شاہراہ تو بہت دور پڑے گی۔ حالانکہ ہم اس راستے پر فی الواقع پہنچ گئے تھے۔ مگر انہوں نے مجھ سے اصل بات چھپائی اور پھر ہم آدھی رات تک چلتے رہے۔ ایک اور ندی آئی تب وہ کہنے لگے او ہو ہم سے غلطی ہوئی۔ میدان کو جانے کا راستہ پیچھے چھوٹ گیا میں نے کہا، پھر اب کیا کرو گے؟ کہنے لگے غوا کا راستہ ذرا آگے ہے، اس سے چل کر ہم فرکت پہنچ سکتے ہیں۔

چنانچہ پھر چلتے رہے اور تین پہر رات گزر چکی تھی جب ہم کرنان کے نالے پر جو غوا سے آتا ہے پہنچے۔ بابا سیرامی نے کہا۔ آپ یہاں ٹھیریں، میں غوا کی ڈنڈی کا پتہ لگا کر آتا ہوں، پھر تھوڑی دیر میں واپس آ کر کہنے لگا۔ مجھے اس راستے سے کئی آدمی جاتے نظر آئے۔ آگے والا مغلی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس راستے ہم نہیں جا سکتے، یہ بات سن کر میں بہت گھبرایا۔ صبح قریب تھی اور ہم ابھی مطلوبہ سڑک سے بہت دور کھیتوں ہی میں تھے۔ میں نے کہا ''دن کو چھپے رہنے کی کوئی جگہ مجھے بتا دو۔ رات کو گھوڑوں کے دانہ چارہ کھلانے کے بعد خجند کے گھاٹ کی طرف لے چلنا وہاں سے دریا اتر کر ہم دوسرے کنارے پر خجند پہنچ جائیں گے۔ ان میں سے ایک نے کہا ''پہاڑی کے اوپر جانب چھپنے کی جگہ مل سکتی ہے۔

بندہ علی کرنان میں (سڑکوں کا) داروغہ تھا۔ کہنے لگا۔ خود کچھ کھائے اور گھوڑوں کو کھلائے بغیر تو ہم سفر کر نہیں سکتے۔ میں کرنان جا کر دیکھتا ہوں کہ کھانے کی کیا چیز مل سکتی ہے۔ غرض ہم پھر چلتے رہے اور کرنان سے کوئی ایک کوس کے فاصلے پر ٹھیرے۔ بندہ علی ہمیں چھوڑ کر کرنان گیا اور بڑی دیر میں صبح ہوتے جلدی جلدی تین نان لے کر آیا۔ مگر گھوڑوں کے لئے کچھ نہ لایا۔ ہم ایک کر ٹیکرے پر چڑھے ہر ایک نے ایک ایک روٹی جیب میں دبائی۔ گھوڑوں کو پانی کے گڑھوں کے قریب باندھ دیا اور خود اوپر الگ الگ ہو بیٹھے کہ ایک دوسرے کو دیکھتا رہے۔

قریب دوپہر احمد قوشچی (باز شکاری) غوا کی راہ میں تین اور آدمیوں کے ساتھ اخسی کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ خیال آیا اسے آواز دے کر بلاؤں اور وعدے وعید کر

کے اپ نے گھوڑے اسے دے دوں جو دن رات چل کر تھک گئے تھے اور دانہ چارہ نہ ملنے سے بالکل بے دم ہو رہے تھے۔ اور ان کے عوض میں اس سے گھوڑے مانگ لوں۔ مگر پھر مذبذب ہو گیا اور اس پر مع ہمراہیوں کے اعتماد نہ جما۔ البتہ ہم نے آپس میں رائے کی کہ یہ سوار ضرور کرمان میں رات بسر کریں گے۔ اس وقت ہم اندھیرے میں جا کر ان کے گھوڑے نکال لا سکتے ہیں۔

دو پہر کو گھوڑے پر ایک چمکتی چیز دور جاتی ہوئی نظر آئی۔ پہلے تو ہم سمجھ نہ سکے لیکن پھر دیکھا کہ وہ (بہ تصحیح) محمد باقر بیگ تھا۔ وہ اخسی میں میرے پاس رہا اور ہمارے شہر چھوڑنے پر جو افراتفری مچی اس میں بھٹکتا ہوا ادھر آ نکلا اور کہیں چھپ جانے کی فکر میں تھا۔ یہ بات بابر کو بعد میں معلوم ہوگی۔ وقت کے تو وہ اپنے دو ساتھیوں اور کھوج لگانے والوں کی وجہ سے خلجان میں سوار پڑا ہوا تھا۔

بندہ علی اور بابا سیرامی نے کہا، دو دن سے گھوڑوں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ نیچے وادی میں چل کر انہیں چرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہیے چنانچہ ہم سوار ہو کر کچھ نیچے آئے اور گھوڑوں کو چرنے چھوڑ دیا۔ نماز عصر کے قریب ایک سوار اسی ٹیکرے کے نیچے سے گزرتا نظر آیا۔ جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ اغوا کا مکھیا قادر بروی ہے۔ میں نے کہا، اسے آواز دو۔ اور ہماری آواز سن کر وہ نیچے ہمارے پاس آ گیا۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی وغیرہ سے تا امکان استمالت کر کے میں نے کہا ہمیں ایک رسی، درانتی، کلہاڑی، دریا سے اترنے کا کوئی سامان مہیا کر دو اور ہمارے اور گھوڑوں کے لئے خوراک اور ممکن ہو تو ایک تازہ دم گھوڑا لا دو۔ قرار پایا

کہ نماز عشاء کے وقت تک یہ سب چیزیں اسی جگہ ہمیں مل جائیں۔

"مغرب کے بعد ہمیں ایک سوار کرنان سے غوا کی طرف جاتا نظر آیا۔ میں نے آواز دی کون؟ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔ اصل میں وہی باقر بیگ تھا جو دوپہر کو نظر آیا اور اب اپنی چھپنے کی جگہ چھوڑ کر رات ہوتے کسی اور جگہ جارہا تھا۔ اس نے اپنی آواز ایسی بدلی کہ برسوں میرے پاس رہا تھا۔ میں بالکل نہ پہچان سکا۔ ورنہ اسے روک کر اپنے ساتھ لے لیتا۔ اب تو اس کا ادھر سے گزرنا دیکھ کر انتہائی پریشانی پیدا ہوئی۔ میرے دونوں ساتھی قادر بروی کی طرف سے بھی بدگمان ہوئے۔ بندہ علی نے کہا، کرنان کی نواح میں کئی غیر آباد باغ ہمیں وہاں جا کر قادر بروی کو اطلاع دینی چاہیے کہ اسجگہ ہم سے آملے۔ یہی قصد کر کے ہم سوار ہو کر کرنان کے نواح تک آئے۔ سردی کا موسم اور بڑی سردی ہو رہی تھی۔ بھیڑ کی کھال کی ایک پرانی پوستین جس کے اندر اونی استر تھا۔ وہ میرے لئے کہیں سے لے آئے اور میں نے اسے پہن لیا۔ ارزن (جوار یا باجرہ) کے آٹے کی پکائی ہوئی آش کا ایک پیالہ بھی مجھے لا کر پلایا جس سے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ تم نے قادر بروی کے پاس کسی کو بھیجا؟ بندہ علی نے جواب میں یقین دلایا کہ آدمی بھیجا ہے۔ حالانکہ ان نمک حرام گنواروں نے تنبل کے پاس اُسی قاصد بھیجا تھا۔

ایک پختہ مکان ملا جس میں اندر جا کر ہم نے آگ جلائی۔ میں تھوڑی دیر سویا۔ یہ مردک خیر خواہی دکھانے کے بہانے کہنے لگے۔ جب تک قادر بروی کا جواب نہ آئے ہمیں یہاں سے کہیں جانا نہ چاہیے لیکن یہ مکان کئی مکانوں کے بیچ میں ہے۔

البتہ اس کے باہر کئی باغیچے غیر آباد ہیں آیا ہم ان میں چلے جائیں تو کوئی شبہ تک نہ کر سکے گا۔ چنانچہ آدھی رات کو ہم سوار ہو کر باہر ایک باغ میں گئے۔ بابا سیرامی چھت پر بیٹھ کر نگہبانی کرتا رہا۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب وہ کوٹھے سے اتر کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ یوسف داروغہ آرہا ہے۔ مجھے بہت تشویش ہوئی۔ میں نے کہا، معلوم کرو کیا وہ میرے یہاں ہونے کی خبر پا کر آرہا ہے؟''

بابا گیا اور کچھ دیر باتیں کر کے واپس آیا اور کہا، یوسف داروغہ کہتا ہے کہ ایک پیادہ سپاہی نے اخسی کے دروازے پر مجھے خبر دی کہ بادشاہ کرنان میں اس جگہ موجود ہے۔ میں نے کسی اور سے یہ بات نہیں کہی بلکہ خود اس پیادے کو ولی خزانچی کی حراست میں دے آیا ہوں۔ (یہ ولی اخسی کی جنگ میں گرفتار کر لیا گیا تھا) پھر میں سیدھا یہاں گھوڑے پر چلا آیا۔ اخسی کے حکام کو کچھ خبر نہیں ہے۔

میں نے بابا سے پوچھا، اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے کہا، وہ سب آپ کے نوکر ہیں آپ کو ان کے پاس جانا مناسب ہے۔ وہ سوائے اس کے کہ آپ کو بادشاہ بنائیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا انہوں نے تو بغاوت کی۔ مجھ سے لڑتے رہے۔ ان پر میں کس طرح بھروسہ کر سکتا ہوں؟

میری بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ خود یوسف آ گیا اور میرے سامنے گھٹنوں کے بل گر کے پکارا۔ میں سچی بات آپ سے نہیں چھپاؤں گا۔ تنبل کو تو آپ کے یہاں ہونے کی خبر نہیں، مگر بایزید آگاہ ہو گیا ہے اور اسی نے مجھے بھیجا ہے۔ میں نے

کہا، ٹھیک ٹھیک بات کہہ دے اگر اور بری صورت پیش آنے والی ہے تو میں باوضو ہو جاؤں؟'' یوسف قسمیں کھاتا رہا جو کچھ کہا صحیح ہے۔ لیکن میں نے مطلق اعتنا نہ کی۔ جانتا تھا کہ میرے حالت کیسی نازک ہے۔ اٹھ کر باغ کے ایک گوشے میں گیا اور سوچنے لگا کہ آدمی سو برس چھوڑ ہزار سال زندہ رہے تو بھی انجام کار۔۔۔۔''

اس مقام پر فرغانہ کے مفرور بادشاہ بابر کی داستان ناگہاں منقطع ہوگئی ہے اور پھر کہیں دو سال بعد کے حالات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اوراق یا تو اس کی آوارہ گردی کے زمانے میں کسی پانی کی طغیانی میں یا آئے دن کی برق وش بھاگ دوڑ میں ضائع ہوئے یا ممکن ہے بھول کر کسی اور صندوق میں حفاظت کی غرض سے رکھے گئے اور پھر یاد نہ رہے۔

بہر حال عجیب موقع پر سلسلہ ٹوٹا۔ اصل ترکی سے فارسی تزک کے کاتب نے حاشیے پر بے اختیار یہ الفاظ ٹانک دیے ہیں:

سال کے باقی ماندہ واقعات۔۔۔۔خدا کرے کہ وہ ہاتھ آجائیں۔

ترکی متن کے ایک اور کاتب نے بابر کو مذکورہ بالا یاس انگیز حالت سے نکالنے میں بظاہر خود طبع آزمائی کی۔ اس کی روایت کی رو سے جب بابر نے یقین کر لیا کہ موت آگئی ہے تو ندی میں جا کر شرعی غسل کیا۔ نماز پڑھی پھر ذرا دیر کو سو گیا تو خواب میں دیکھا آقائے قدسیاں آئے اور انہوں نے اسے نجات دلائی۔ یہ دیکھ کر تازہ قوت آئی اور اس نے تینوں دغابازوں کو جو اسے گھیرے ہوئے تھے روکے رکھا۔ اتنے میں گھوڑوں کے سرپٹ دوڑانے کی آواز آئی۔ دیکھا تو اس کے دو جاں نثار

عسکری باغ کی دیوارتوڑ کرآ پہنچے۔اس لئے کہ انہوں نے بھی اندجان میں جہاں بابر کے دونوں ماموں تھے خواب میں دیکھا تھا کہ اس لمحے بابر پادشاہ کرنان نام کے گاؤں میں ہے۔اس طرح کی بروقت نجات پانے یہ قصہ الف لیلہ کے قصوں سے ملتا جلتا ہے اور اسی قدر یقین کے لائق ہے (دونوں نمازیں بھی محض تھکی ہیں۔بابر کے خان ماموں اندجان میں نہ تھے اور نہ اب اپنی سلامتی کے لئے وہ اس شہر کا رخ کرسکتا تھا پھر اس واقعے کے کئی پریشان سال گزرنے تک اس نے پادشاہ کا لقب بھی نہیں اختیار کیا تھا۔مزید برآں بابر نے گوشہ باغ میں غور وفکر کی غرض سے جانے تک جو کیفیت لکھی ہے اس میں اپنے نمک حرام رفیقوں سے ہشت مشت کرنے کی کسی کوشش کا ذکر نہیں آتا اور نہ وہ ایسے شخص کو قتل کرنے کا خطرہ مول لیتے جو بادشاہ تھا اور زندہ رہنے کی صورت میں انہیں دولت کثیر انعام میں ملنے کی توقع تھی،انگریز مترجم فاضل بیورج نے یہ بھی جتایا ہے کہ ہرچند الحاقی عبارت ترکی زبان میں ہے لیکن ایسے شخص کی نہیں ہے جو بابر کی طرح سوچتا بھی ہو ترکی زبان میں۔دوسرے وہ دو مفروضہ بچانے والے جو عین وقت پر آ گئے تھے۔ان کا اس کی مستند تحریر میں کہیں نام نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ پھر بابر اس دن باغ سے کس طرح بچ کر نکلا۔وہ آئندہ اوراق میں اس واقعے کا دوبارہ کہیں ذکر نہیں کرتا۔ان دو سالہ مصائب میں وہ کوئی چھ مرتبہ اسی طرح گھرا۔لہذا یہ موقع غیر معمولی نہیں تھا۔بایں ہمہ اس زمانے کا آخری ایام کی جو کیفیت لکھی ہے۔اس میں بعض اشارے مل سکتے ہیں۔یاد ہوگا کہ تین دن و

رات میں وہ صرف تھوڑی دیر کے لیے، وہ بھی بے اختیاری سے سو سکا تھا۔ ان واقعات کو اس نے ضرور بابا سرامی اور بندہ علی کو پوری طرح قابو میں آ جانے کے کچھ دیر بعد ہی تحریر کیا ہوگا۔ دوسرے یہ ثابت ہے کہ محمد باقر بیگ (اس کا مسلح دوست جو چھپتا پھرتا تھا اور خود بابر کے گھیرنے والے اس سے بچنا چاہتے تھے) وہ بہت جلد اس سے آ ملا تھا۔

علاوہ ازیں، حقیقت میں بابر امداد سے بالکل محروم نہیں ہو گیا تھا جیسا کہ اس ن ے کمال اضمحلال کی حالت میں خیال کیا۔ فریبی بابا اور بندہ علی نے جو اسے یقین دلایا کہ جہانگیر میرزا بھی پکڑا جا چکا ہے۔ یہ جھوٹی بات تھی۔ جہانگیر بابر کی باقی ماندہ جمعیت کے ساتھ سیر دریا کے دوسری جانب ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ خاں ماموؤں کی جنگی لشکر قریب ہی سرحدی پہاڑیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اور مغول خانہ بدوشوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی ٹولیاں بلا اطلاع دیہات میں گشت لگاتی پھریں۔ فی الواقع ان کے بعض گروہ اخسی کے آس پاس اسی زمانے میں پہنچ گئے تھے۔ بابر کے کرنان کے باغ میں چھپنے کی خبر ضرور دریا کے کنارے تک پھیل گئی ہو گی۔

بہر حال وہ بہت جلد چھٹکارا پا کے باقر بیگ کے ہمراہ تاشقند کے رخ چل پڑا تھا۔ یہاں دو ماموؤں سے ملاقی ہو جو شیبانی کے مقابلے میں مغلوں کے آخری دفعہ جم کر لڑنے کی تیاری کر رہے تھے اور اخسی سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھے اگرچہ وہ میدان میں آنے سے بچتے رہے لیکن آخر کار سخت معرکہ پڑا، جس میں فرغانہ اور بابر کے مستقبل کا بھی (جون ۱۵۰۳ء میں) فیصلہ کر دیا۔

یہ شیبانی خان کا کام تھا۔ دوسرے ماخذ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے ازبک جنوب میں کوہستان سیاہ کے ان شہروں کو ٹٹول رہے تھے جن پر جاہ طلب خسرو شاہ کا عمل دخل تھا کہ اندجان سے تبنل نے انہیں مدد کے لئے بلایا۔ شیبانی نے فوراً لبیک کہی لیکن ہو سمر قند ہوتا ہوا آیا کہ فرغانہ کے الجھے ہوئے معاملات کا پہلے سے اندازہ کر لے۔ کچھ عرصہ بعد ہم اسے خجند میں جہانگیر میرزا کے مختصر لشکر کو گھیرے میں لیتے دیکھتے ہیں۔ اس میں کچھ زیادہ زحمت پیش نہ آئی۔ البتہ خانوں کی فوج تیاریاں اور اخسی کے اوپر پہاڑیوں پر قبضہ سن کر اس نے تامل کیا (بابر بھی اس وقت ماموؤں سے آملا تھا) پھر یکایک بھیڑیے کا ساوہ کاٹ کے وہ انہیں ایک طرف چھوڑ کر غیر محفوظ تاشقند میں جا پڑا۔ شاہی بیگمات کو گرفتار کر لیا۔ انہیں میں بابر کی ماں کہ پہلے ہی بہت کھکھیر میں جھیل چکی تھی، اور خانوں کی ماں بھی شامل تھیں۔ اس کے بعد ازبک سپہ سالار سرعت سے مشرق کی طرف مڑا اور کم تعداد مغل فوجوں کو صف بندی کی بھی مہلت نہ دی۔ بلکہ بلا مبالغہ گرد راہ کے ذروں کی طرح انہیں پراگندہ کر دیا۔ بڑا خان اس معرکے میں اسیر کر لیا گیا۔ چھوٹے نے کسی طرح بچ کر بالاخر اپنے ملک کی راہ لی، جہاں سے دراصل اسے آنا ہی ناسازگار تھا۔ پھر وہ اسی رنج میں جان سے گزر گیا۔ اس ہزیمت آفرین جنگ میں ایک دستہ بابر کے ماتحت تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اولا ارض مغول کی طرف چلا تھا لیکن تھوڑی مدت بعد ہی ہم اسے وادی فرغانہ سے گزرتے دیکھتے ہیں۔

شیبانی کو اپنی قوت قاہرہ کیساتھ رحم و کرم کے کرشمے بھی دنیا کو دکھانے کا شوق تھا

محمود خان کو اسی غرض سے سلامت رہنے دیا تھا۔ چنانچہ اس کے مداح ناظم شیبانی نامہ ''کے مصنف کے قول کے مطابق اس نے مغل خان سے کہا کہ میں نے تمہیں گرفتار کیا ، لیکن قتل نہیں کروں گا۔ میری جوانی کے زمانے میں تم نے ایک بار میری مدد کی تھی۔ میں بھی تم کو رہا کر دوں گا، لیکن کہاں جانے کے لئے؟ شیبانی کے سوار بچے کھچے مغل قبائل کو مشرق میں بہت دور، تیھان شان کے دروں تک خاقان چین کی سرحدی چوکیوں کے سامنے تک دھکیل چکے تھے۔ ان دیدبانی کے چینی برجوں او ربخارا کا مزارات و مقابر کے درمیان تمام راستوں پر اب ازبکوں کی عملداری تھی۔ کچھ مدت تک جس کا صحیح تعین نہیں ہو سکا، محمود خان صحرائی راستوں پر ادھر ادھر پھرتا رہا۔ ان کا سارا غرور خاک میں مل چکا تھا اسی حال میں اسیر ماں کے نام ایک نفیس خط تاشقند لکھ کر بھیجا۔ وہی تاشقند جہاں عیش و حکومت کے لطف اٹھائے تھے۔ پھر کچھ ایسے سامان ہوئے کہ ویران صحرا چوڑ کر خجند آنے کی ترغیب ہوئی۔ مگر یہاں اس کے پہرداروں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ سب بیٹے بھی ہلاک کر دیے گئے۔ ان میں وہ بڑا بیٹا بھی قتل ہوا جو مغل جھنڈوں کی سلامی کی رسم ادا ہوتے وقت بابر کے ساتھ سفید فرش پر ایستاوہ تھا۔ شیبانی ان کے قتل کے وقت موجود نہیں تھا لیکن یہ خبر سن کر کچھ کہا تو یہ کہ دشمن پر ایستادہ تھا۔ شیبانی ان کے قتل کے وقت موجود نہیں تھا لیکن یہ خبر سن کر کچھ کہا تو یہ کہ دشمن کو دوسری بار زندہ چھوڑنا بے وقوفوں کا کام ہے'' حقیقت میں اس نے جدید مقبوضات میں حکمران طبقے یا مرتبے کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑا۔ تنبل نے اخسی یا ارشیان کی جنگ میں شیبانی کو تھوڑی کمکی فوج بھیجی تھی لیکن اس کا بھی بہت

جلد چکے سے اور گویا بالا ہی بالا کام تمام کر دیا گیا۔

اب سارا فرغانہ بلکہ دریا پار تک کا علاقہ بلا شرکت شیبانی کے زیر نگیں تھا۔ اس نے اپنی خانہ بدوش قوم کی ایک سلطنت قائم کر لی تھی۔ اور نیم ویران سمرقند میں امیر تیمور کے تخت پر خود متمکن ہو گیا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے سلسلے میں بڑے بڑے تیموری خاندان کے اکثر اکابر کا استیصال کر دیا تھا۔ اس کے تسلط کے ساتھ ملک میں حضریت کی بجائے بڑے پیانے پر زراعت کی بجائے چراگاہ اور مذہبی تعلیم و تعلم کی بجائے ازبک سپہ سالاروں کی عسکری ملازمت کو فروغ ہو رہا تھا۔

شیبانی نے آئندہ جہانگیر میرزا کی کچھ فکر نہ کی جس کا کردار کمزور اور جمعیت پراگندہ ہو چکی تھی۔ البتہ سبک پا بابر اور خواجہ ابو المکارم کی تلاش و تعاقب کا حکم دیا (علی دوست کا ایک بیٹا زندہ رہ گیا تھا۔ اسے ازبکوں کے کھوجی پہلے ہی پکڑوا چکے تھے) خواجہ بیکار بیٹھنے والا نہ تھا۔ تاشقند کے قید خانے سے نکل بھاگا بھیس بدلا۔ حتیٰ کہ ڈاڑھی تک منڈوا دی تھی لیکن ضعیفی کے باعث زیادہ دور نہ گیا تھا کہ ایک مخبر نے دغا دی۔ شیبانی سے اس مرد بزرگ کا سامنا ہوا تو اس نے پوچھا آپ کی داڑھ کیا ہوئی۔ فاضل خواجہ نے جواب میں فارسی شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ۔

''خدا نے اگر چراغ جلایا تو جو اس کو پھونک مار کر بجھائے گا وہ اپنی ڈاڑھی کو آگ لگائے گا۔

بابر بچ کر نکل گیا اگرچہ بڑی مشقت اٹھانی پڑی۔ بظاہر ان پہاڑی پگ ڈنڈیوں سے گیا جنہیں خوب جانتا تھا۔ ایک پہاڑ کے درے سے مارا مارا نکلتا ہو

ادیکھا گیا جسے تھوڑی ہی دیر میں برف نے بند کر دیا۔ ایک مدت بعد لکھتا ہے کہ میں نے قریب قریب ایک سال پہاڑیوں میں بڑی تکلیف سے گزارا۔

حیرت ہے کہ شیبانی خان نے عورتوں کے بندی خانے سے جہاں بابر کی بارعب نانی ایسن (ایسان) دولت بیگم مرض الموت میں پڑی تھی۔ بابر کی ماں کو آزاد کر دیا۔ ازبک کمینہ فطرت نہ تھا۔ بلکہ خواتین کے معاملے میں خاصی عالی ظرفی دکھاتا تھا۔علی بیگ کی ماں، بابر کی بہن خانزادہ اور محمود خان کی ایک بیوی کو نکاح میں لا چکا۔ کیا اسے امید تھی کہ بیمار ماں بابر کے ساتھ ہوئی تو اسے ڈھونڈنے میں (جس کا ہلاکت کا خاص طور پر خواہاں تھا) آسانی ہو جائیگی؟ اور یا خانزادہ بیگم نے کہہ سن کر اپنی ماں کو رہائی دلوائی؟ اس سوال کا جواب تزک بابری کے گم شدہ اوراق کے ساتھ گم ہو گیا۔

زیر نظر سال میں آل تیمور کی اپنی قدیم سلطنت میں خانہ جنگی اور فتح و شکست کے واقعات پر پردہ پڑ گیا تھا۔ عمر شیخ اور اسکے بھائی بھتیجوں کا پر آشوب مگر خاصا درخشاں دور ختم ہوا۔ سمرقند برابر پیچھے رہا تھا۔ چند سال میں کچھ اور متروک ہونے پر محض قصہ ماضی بن جانے والا تھا۔

جون ۱۵۰۴ء میں جب کہ سورج برج سرطان ہوا ہمارے شیر نے از خود اور خلاف توقع ایک اور فیصلہ کیا۔ اس وقت وہ کوہستان سفید کے قبائل ایماق میں تھا۔ اس کی ماں اور باقی ماندہ رفیقوں کے اہل و عیال بھی ساتھ تھے۔ یہ اس کے وطن مالوف کی جنوبی سرحد تھی پھر میرے دل میں آئی کہ فرغانہ کو خیر باد کہنا چاہیے جس

ملک میں پاؤں لٹکانے کی جگہ نہ ہو اسے چھوڑ کر کہیں بھی چلے جانا بہتر ہوگا''

یہ فیصلہ یقیناً بہت گراں گزرا ہوگا۔ دس برس تک برابر سخت جدو جہد کرتا رہا کہ آبائی علاقے میں کہیں ٹھکانا میسر آ جائے۔ ان سنین میں بار بار میرا **ملک** ۔ میری رعایا'' کے الفاظ زبان پر آتے رہے۔ یہ تصورات دل میں جمے ہوئے اور محو ہونے والے نہ تھے لیکن اب پہلی دفعہ اس نے اپنی دادی، سیر دریا قدیم دارلسلطنت سمرقند سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ اس کے مختصر اردو میں جو خاندان یا ان کے نام لیوا باقی رہ گئے تھے، ان کے لئے کہیں نہ کہیں کوئی ملجاو ماوی تلاش کیے بغیر نہ رہے گا۔ اس طرح مصمم ارادہ کر لینا بابر کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ پھر اسے کوئی چیز متغیر یا متزلزل نہ کر سکتی تھی۔ اس استقامت کے ساتھ اقتدار طلبی کا نادر جذبہ بھی وہ شامل کر لیتا تھا۔ اس کے ذہن میں نئی سرزمین بعید کوہستانوں میں صرف پناہ گاہ ہی نہ ہوگی۔ چنانچہ ایک ایسے مقام پر وہ اپنی مہاجرت کے دوران بغیر ٹھیرے جلد آگے بڑھ گیا۔۔ بلکہ وہاں بھی کوئی دریا، کوئی شہر ایسا ہوگا جس کے گرد سمرقند جیسے باغ تیار کیے جا سکیں گے۔

پچیس برس بعد اس نے حکومت کرنے کے لیے ایسا **ملک** پالیا جہاں اس کے سب متوسلین کے اہل وعیال کو بھی پناہ مل گئی اور شہر بنانے کا بھی آغاز کر دیا۔ اگر چہ وہ ایسی جگہ تھی جہاں اسے تعمیر کا کوئی خیال نہ تھا۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس وقت اس نے **ملک** چھوڑ کر بے نوا ہو جانے کا ارادہ کیا، اسی وقت اس کے حق میں پلٹ گئی۔ واقع میں بابر کو خدا ہی نے طالع آزما بنایا تھا۔

باب سوم:: کابل کی بادشاہی

دریائے زخار کے پار

فرغانہ سے نکل کے ہم ولایت حصار کی گرمائی چراگاہوں میں داخل ہوئے۔ یہاں میری عمر ۲۳ سال کی ہوئی اور میں نے پہلی ڈاڑھی استرے سے منڈوائی۔ وہ لوگ جو ابھی تک مجھ سے امید رکھتے تھے۔ چھوٹے بڑے دو سو سے زیادہ، تین سو سے کم تھے، ان میں زیادہ تر بے سواری کے پیدل، چمڑے کے موزے پہنے، لاٹھیاں ہاتھ میں، بھیڑ کی کھال کے کوٹ شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ ہماری بے سروسامانی کا یہ حال تھا کہ ہمارے پاس صرف دو خیمے تھے۔ اپنا خیمہ میں نے والد کو دے دیا تھا۔ دوسرا جس کی چوبوں پر کمل باندھ لئے تھے، رات کو میرے واسطے نصب کر دیا جاتا تھا۔''

بابر وطن چھوڑ کر مقررہ راستے ہی سے جا رہا تھا۔ یعنی پہاڑی بیٹوں سے جو خانہ بدوش ایماق قبائل کے پڑاؤں سے گزرتی تھیں۔ اور وہ رات کے وقت اپنے معزز مگر بے نوا مہمانوں کو کھانا لا دیتے تھے۔ وہی اگلی منزل تک جہاں کوئی پہاڑی ندی بل کھاتی گزرتی، پہنچانے کی غرض سے رہنما ساتھ کر دیتے تھے۔ افواج کے کوہستانی غائبانہ تاروں نے بابر کا نام اور زوال کا قصہ ایماق قبائل میں پہلے سے پہنچا دیا تھا۔ وہ رات کے وقت اس کے دو خیموں کیلئے پاسبان مقرر کر دیتے تھے۔ کیوں کہ یہ قبائلی

عزت کا معاملہ تھا کہ ان کے یک شبہ مہمانوں پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ وہی بابر کو نیچے کی وادیوں کی خبریں لالا کے سناتے تھے۔ بعض نوجوان جنگ آزما اس کے فراری لشکر میں بھی شامل ہو گئے۔ حسب معمول بابر ان بالائی چراگاہوں میں لوگوں کے دل موہ رہا تھا۔ علی ہذا خود اس کا دل نئی زمینوں کی ایک ایک چیز پر متوجہ تھا۔ اس کے وطن کے دریا سیر (سیحون) کے سر چشمے اوپر چھوٹ گئے اور اب وہ آمو (دریائے زخار جیحوں) کے منابع سے گزر رہا تھا۔ یہ مشرق کی جانب بہتے ہیں۔ جہاں لاجوروی پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان بوسی کرتی نظر آتی تھیں۔ اس نے یہ بات بھی ذہن میں محفوظ کی کہ یہاں قدرتی حصار موجود ہے جو ازدست رفتہ وطن کے گویا سر پر چھایا ہوا تھا۔ اسی کو ایماق قبائل کے سردار بدخشاں موسوم کرتے تھے یہ لوگ چمکتے ہوئے کبریتی ٹکڑے بابر کے پڑاو کے الاو پر لاتے اور قسمیں کھاتے تھے کہ بدخشاں میں لاجورد، زمرد، سرخ آتشیں پتھر، یعنی یاقوت کثرت سے ہوتا ہے، البتہ وہ بہ قسم کہتے تھے کہ ''سردیوں میں تلے اور اوپر تین دن رات تک سورج نہیں دکھائی دیتا'' یہ بات بھی انہوں نے چپکے سے بتائی کہ ان پہاڑوں کے اندر سے ایک چور راستہ ندی کے کنارے کنارے جو کوہ پانگی کی برفانی ڈھلانوں سے بہ کر کاشغر گئی ہے۔ مشرق میں نکل جاتا ہے۔ اسے سن کر بابر کی رائے ہوئی کہ یہ چھپنے کی بہت محفوظ جگہ ہو سکتی ہے اور اس نے اسے یاد رکھا۔

سردست کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کے وسائل اسے میسر نہ تھے۔ پہلی دفعہ ڈاڑھی منڈوانے کی تقریب میں کوئی جلسہ ضیافت ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ اپنی غربت و

افلاس میں اس کا خیال تک نہ کر سکا۔ اگرچہ اپنے بھائی جہانگیر مرزا کی شادی انہی دنوں کی تو اس رسم کو منانے کا کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کیا۔ اس بھائی کی مخالفت سے جو چڑ کے دل کو لگے تھے، انہیں بابر بھول جانے کی کوشش کرتا تھا اور جہانگیر کے چھوٹے موٹے سازباز کو بھی اپنے ہی تک رکھتا تھا۔ نوجوان شہزادے کو ایسی سازشیں رات کو شراب کے نشے میں سوجھا کرتی تھیں جو وہ غم غلط کرنے کے لئے پینے لگا تھا۔ اس سے بھی چھوٹا بھائی ناصر میرزا بابر کے لئے ایک اور دردسر بن گیا تھا واضح رہے کہ یہ دونوں ازبکوں سے جان بچا کر بھاگے اور بابر کے پاس آ گئے تھے۔

خوف انگیز ازبک سواروں کی ٹولیاں فراریوں سے کچھ زیادہ دور نہ تھیں۔ یہ تو ٹھیک معلوم نہیں کہ ان کے قراول پہاڑی بیٹیوں میں بابر کا پیچھا کر رہے تھے یا نہیں مگر شیبانی کے صحرائی جنگ آزماؤں میں شکست خوردہ خانوں کے تیس ہزار مغل سپاہی آملے تھے اور اب یہ ٹڈی دل جنوب کی طرف بڑھتا چلا آتا تھا۔ جنوبی پہاڑوں میں خسروشاہ کا عمل دخل تھا۔ شیبانی اس کی سرکوبی کی تیاریاں کر رہا تھا جب کہ مغل خانوں سے لڑائی چھڑ گئی۔ لیکن اب تاشقند کا بندوبست کرنے کے بعد اس نے دوبارہ جنوب کا رخ کیا۔ پہاڑی ایماق ان واقعات پر نظریں لگائے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ اطلاعیں بابر کو پہنچائیں۔

حقیقت میں آمو دریا کے بالائی کناروں پر سبھی کی آنکھیں آنے والے طوفان پر لگی تھیں۔ اسی حالت منتظرہ میں طاقت وازبک سے پہلے بابر کے آنکلنے کا واقعہ پیش آ گیا۔ مگر اس کی اہمیت یہ تھی کہ وہی ایک ایسا تیموری شہزادہ تھا جو بہادری

سے شیبانی کے خلاف لڑا اور سلامت رہ گیا۔ تیز رو آمو کے معبر پا باقی بیگ منتظر ملا۔ وہ یہاں کی چوڑی پٹی کا حاکم اور خسرو شاہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے بڑی تعظیم تکریم سے تیمور کے بے خانماں وارث کا خیر مقدم کیا اور اس کی رفاقت میں رہنے کی پیش کش کی۔ اپنے اخلاص کے ثبوت میں اپنے اور اپنے عمائد کے بال بچوں کو بھی مصلحت اندیش باقی بیگ بابر کی لشکر گاہ میں لے آیا۔ یہ جنوبی لوگ لباس فاخرہ میں ملبوس، درباریوں کے ظریفانہ طرز میں خوب باتیں بتاتے تھے۔ بلکہ باقی کے طور طریق دیکھ کر تو بابر کو علی دوست کی یاد تازہ ہوگئی جو اس طرح بے نشان مارا گیا کہ کوئی رونے والا تک اسے نہ ملا۔ باقی نے آتے ہی، اگر چہ تمیز کے ساتھ جہانگیر میرزا کے ہمراہ رہنے پر بھی اعتراض کیا۔ اس نے سعدی کا قول بھی سنایا کہ وہ دو درویش در گلیمے بہ خسپند و دو پادشاہ در اقلیمے نہ گنجند'' بابر کلام سعدی سے واقف تھا۔ اسے پورا قطعہ یاد آیا کہ:

نیم نانے گر خورد مرد خدائے
بذل درویشاں کند نیمے دگر
ہفت اقلیم از بگیرد بادشاہ
ہم چناں در بند اقلیم دگر

تاہم وہ جہانگیر کو چلتا کر دینے پر آمادہ نہ ہوا۔

وہ دریا سفر کر رہے تھے کہ ایک پرانا مگر بے مروت دوست قنبر علی سلاخ آملا۔ معلوم ہوتا ہے اور وہ علی ہذا باقی بیگ اپنی سلامتی اسی میں سمجھے کہ ازبکوں کی آمد آمد پر

خسرو شاہ کو چھوڑ کر بابر کے پاس آ جائیں۔ مگر سلاخ کی بے ہودہ گوئی جسے بابر برداشت کرتا تھا، باقی بیگ کو بہت ناگوار ہوئی اور آخر سلاخ کو رخصت کر دیا گیا۔ اس مرتبہ سلامتی کی تلاش میں وہ ایسا گیا کہ پھر اس کا پتا نہ چلا۔

جنوب میں آگے بڑھتے جانے میں خود بابر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے پاس خاصا بڑا لشکر جمع ہو رہا ہے۔ پرانے پرانے مصاحب چلے آ رہے تھے۔ خود خسرو شاہ کے مغل سپاہیوں کی طرف سے ایک پیام بر صیغہ راز میں پیام لایا کہ "لشکر مغل بادشاہی کے سچے وارث کا خیر طلب ہے۔ خسرو کی فوج کا تارو پود بکھر رہا ہے۔ بابر بہ سرعت آ جائے۔ ہم سب اس کی ملازمت قبول کرتے ہیں۔ پھر زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ لشکر مغل کے کئی ہزار سوار فی الواقع بابر کے روز افزوں اردو میں آ ملے۔

ایک دن صبح کو خیمے کے باہر قدیمی سردار بیگ باریابی کا منتظر نظر آیا اپنے آقا سے خطا بخشوائے بابر کی عمر ہلالی حساب سن ۲۳ برس کی تھی (کہ شمسی تقویم کے ۲۱ سال اور کچھ مہینے ہوتے ہیں) پھر تلخ تجربوں نے اسے سبق دیا تھا کہ وہ آنیوالے رضا کاروں کی ایسی ایکا ایکی طغیانی کی علت پر غور کرے۔ آموکی اس عریض وادی میں یہ علت کچھ چھپی ہوئی بھی نہ تھی۔ اس کے عقب میں ازبک بند آہنی کی تنگ گھاٹی سے گزر چکے تھے اور یہ درہ ممالک سمرقند سے ممالک ہند کو جانے کا قدرتی دروازہ تھا۔ شیبانی خان قلعہ حصار پر بڑھ رہا تھا۔ اس نازک وقت میں مغل سپاہیوں کو بوڑھے خسرو شاہ کی نسبت نوجوان بابر اور باقی بیگ کی قیادت میں آنا بہت غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ ان سب باتوں پر طرہ یہ ہوا کہ خود خسرو شاہ کا ایلچی آیا اور اعلان کیا کہ خسرو

ان تمام ولایات کا اصلی وارث بابر کو تسلیم کرتا اور اسکی وفادارانہ خدمت پر تیار ہے، صرف اس شرط پر کہ اس کی جان اور مال محفوظ رہے گا۔ فی الواقع ممالک جنوبی کا یہ والی، بادشاہ کی اطاعت کا اقرار کرنے کے لیے اس طرف روانہ ہو چکا تھا۔

بابر اس وقت ندیوں کے ایک سنگم کی جانب کوچ کر رہا تھا وہاں خیمے نصب کرا کے، سمرقند کے اس سابق وزیر اور اپنے نوعمر برادر عم زاد کے قاتل سے ناگوار نہ ملاقات کی وہ اعتراف کرتا ہے کہ یہ شمالی ترک، ازبکوں کا رشتہ دار، سخاوت و مروت میں مشہور تھا'' اگرچہ یہ آدمیت جو ادنیٰ سے ادنی شخص کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ میرے ساتھ کبھی نہیں کی۔ بابر نے صاف صاف نہیں لکھا مگر حقیقت میں وہ خسرو کے آدمیوں کو اسے چھوڑ کر اپنے ساتھ آ ملنے کی ترغیب دے رہا تھا، الغرض ایک ندی اتر کر بابر ایک چنار کے نیچے باقاعدہ بیٹھا جب کہ دوسری طرف سے خسرو شاہ خدم و حشم کو جلو میں لئے ہوئے بڑی شان سے آیا۔ ضابطے کے مطابق فاصلے سے گھوڑے سے اترا اور پیادہ سامنے آ کر تین بار مجھے آداب تسلیمات بجالایا۔ میری مزاج پرسی کرتے وقت جھکا اور نذر پیش کرتے وقت پھر جھکا۔ اسی طرح جہانگیر میرزا اور راغری بیگ کے سامنے (جو بابر کے پاس بیٹھے تھے) جھک کر آداب بجا لایا۔ یہ بدبخت پیر فرتوت کہ برسوں ہوئے نفس میں رہا اور سوائے اسکے کہ اپنے نام کا خطبہ نہیں پڑھوایا، ہر اعتبار سے خودمختارانہ بادشاہی کرتا رہا، آج پچیس چھبیس مرتبہ جھک جھک کے آداب بجالایا اور آگے بڑھا اور پیچھے ہٹا کہ تھک کر لڑکھڑانے لگا، دولت و حکومت کے سب نشے ہرن ہو گئے۔ نذر گزرانے کے بعد میں نے

بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ کوئی گھڑی بھر بیٹھا فضول اور بے مزہ باتیں کرتا رہا کیوں بزدل، نمک حرام تھا" (بابر کے نزدیک)

اس پرانے پاپی سازشی سے بابر مطلق رو رعایت نہیں کرتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو شاہ جس کا نام ایک مبہم لقب ہے۔ ہمت و فراست دکھانے سے عاری نہیں رہا۔ جب بابر نے بے رحمی سے طعن کا نشتر مار اک اسکے اتنے آدمیوں کے ٹوٹ جانے پر اظہار ہمدردی کیا، تو بڈھے نے فوراً جواب دیا کہ یہ میرے مردک نوکر چار دفعہ پہلے بھی مجھے چھوڑ چکے ہیں اور ہر دفعہ پھر آ گئے ہیں۔" یہ میرے مروک نوکر چار دفعہ پہلے بھی مجھے چھوڑ چکے ہیں اور ہر دفعہ پھر آ گئے ہیں۔" اسی طرح جب بابر نے سوال کیا کہ اس کا ایک چھوٹا بھائی ولی کس گھاٹ سے دریا اتر کے آئے گا تو موٹے پستہ قامت بڈھے نے یہ مثل دہرائی کہ (دریا چڑھنے پر) آن گزررا آب برد، بابر توجہ سے سن رہا تھا۔ اس جواب کو اسی کے حق میں فال بد یعنی خدم و حشم کے دریا برد ہو جائے کا شگون سمجھا۔ یہ دور از کار تعبیر تھی مگر خود بابر اسے سچ کر دکھانے کا قصد رکھتا تھا۔ چنانچہ اس عجیب ملاقات کے بعد خسرو کا شاندار عملہ ایک ایک کرے یا جوق در جوق جدا ہو ہو کر مع اہل و عیال بابر کی لشکر گاہ میں آنے لگا۔ اس کا بیان ہے کہ دوسرے دن (بہ تصحیح مترجم) ظہر کی نماز تک کوئی شخص اس کے پاس نہیں رہا۔

شام کے وقت بابر خیمے کے میں اس کے امرا یہ بحث و تکرار کر رہے تھے کہ میرزا خان (ان تین شہزادوں میں سے ایک، جس کے ایک بھائی خسرو نے ہلاک، ایک کو اندھا کر دیا تھا) قصاص کا دعویٰ کرتا تھا۔ باقی بیگ نے ہوشیاری سے بابر کے ساتھ

صلح کی شرائط ملاقات سے پہلے ہی طے کر لی تھیں۔ وہ بھائی (خسرو) کی حمایت کرتا تھا۔ اکثر عمائد قصاص لیا جانا واجب جانتے تھے اور بابر دل سے ان کا ہم رائے تھا لیکن وہ اس کے جان و مال کی حفاظت کا قول دے چکا تھا۔ یہی فیصلہ کے اکہ اسے بلا ضرر مال اسباب کے ساتھ ملک سے جانے دیا جائے۔ حصار و قندز کے سابق والی نے گدھوں اور اونٹوں کی تین قطاروں پر سونا چاندی جواہرات بار کئے اور دریا کے کنارے کنارے چل نکلا۔ پھر بابر کو جس نے بطور تحفہ بھی اس کا کچھ مال و دولت لینے سے انکار کر دیا تھا اس نے صورت نہیں دکھائی (خسرو کے نکل جانے کے چند ماہ بعد ایک پریشان کن نتیجہ یہ ظہور میں آیا کہ پہلے وہ پناہ لینے ہرات شہر کے مغرب میں آ گیا تھا، مگر جب سنا کہ بابر اور شیبانی دونوں آمو دریا کی وادی سے چلے گئے تو وہ چند صد ملازمین لے کر پھر اس علاقے میں اپنے وطن قندز کو لینے کی غرض سے چلا اور یہ خبر بابر کی لشکر گاہ میں شائع ہوئی تو جیسا خسرو نے پیش گوئی کی تھی ، اسکے بہت سے سابقہ اجیر مضطرب ہوئے اور پھر اس کے پاس جانا شروع ہو گئے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر مغلوں نے بابر کی رفاقت ترک نہیں کی۔ یہ ان کی دوسروں کی نسبت زیادہ عاقبت اندیش ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ زیادہ خبریں یہ آئیں کہ، عالی جناب خسرو شاہ جو پہلے حصار و قندز بلکہ بند آہنی سے بدخشان تک سارا ملک بغیر لڑے بھڑے پھینک آئے تھے، اس مرتبہ جو ازبک سرداروں کے سامنے دوبارہ پہنچے تو اس بوڑھے مرد کے لئے کسی نے تلوار نہ کھینچی اور نہ اسے بھاگنے کا موقع ملا بلکہ گھوڑے سے گرا کر اسے قندز لے

گئے اور سر کاٹ کر شیبانی خان کے پاس بھیج دیا'' بابر نے یہاں خاص طور پر طعن آمیز عبارت لکھی ہے۔ مذکورہ بالا خبر آنے پر جو لوگ ادھر جانے پر پر تول رہے تھے، پھر بابر کے پاس رک گئے۔

طلوع ستارہ سہیل

آمو پر افراتفری اور خود بابر کی اتنی ناخوش گواری ک سبب ہرات کے سلطان حسین بایقرا کے خطوط تھے۔ بابر نے انہیں محفوظ رکھا اور کبھی فراموش نہیں کیا۔ حقیقت میں یہ سن رسیدہ اور نامی بادشاہ ہرات بڑی قوت فراہم کر سکتا تھا۔ وہ بابر کا ایک ہی چچا سلامت رہ گیا تھا۔ نہایت فاضل اہل علم اور شعراء کا دوست اور تیمور کی اولاد میں تنہا صاحب مل و حکومت شخص تھا۔ خراساں کے پائے تخت ہرات میں اس کا دربار طالبان علم و راحت دونوں ک لئے مرجع ہو گیا تھا۔ وہ ثمرقند کو پارہ پارہ کرنے والی خانہ جنگیوں سے بہت دور، حسب سابق آرام و اطمینان کی معاشرت کا دلدادہ رہا۔ ایک وقت میں خود بابر وہاں جا کر پناہ لینے کی سوچتا تھا۔ اس نے سمرقند پر قبضہ ہونے کے زمانے میں اپنے چچا سے دو بار فوجی کمک کی بھی درخواست کی تھی، دونوں دفعہ بے نتیجہ رہی۔ پھر جنوب کی طرف فراری کے وقت بہ صیغہ ضروری چچا کو لکھا کہ آمو دریا ازبکوں کے خلاف اس کے اور خسرو شاہ کے ساتھ مل کر مقابلہ کرنے میں ورنگ نہ کرے اور جتایا کہ شیبانی کی روز افزوں قوت ہرات کے حق میں خطرہ بنتی جاتی ہے۔ خسرو نے بھی یہی دلیل لکھی تھی۔

حسین میرزا نے بھتیجے کی سمرقند والی عرض داشتوں کا تو کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن اس موقوع پر جواب میں فورا قاصد دوڑائے اور خسرو شاہ اور بابر کو طولانی خط لکھ کر بھیجے۔ بابر نے انہیں پڑھ کر بہت پیچ وتاب کھائے۔ کیا چچا نے دریا عبور کرنے کے لیے صرف کشتیوں اور پلوں کا انتظام کر دینے کو لکھا اور اپنے فورا آنے کی اطلاع دی تھی؟ نہیں، بالکل نہیں۔ حسین میرزا نے تو بابر کے خنجر بھونک کر اسے اور پیچ دے دیئے تھے۔۔ اس نے نہایت خوش نما الفاظ میں لکھا تھا کہ صرف بارہ برس کی عمر میں جس بھتیجے نے اندجان کی جدی پر اپنے تین تین چچاؤں کی پیش قدمی روکی اور انہیں پسپا کر دیا تھا، آج آمو پر ازبکوں کی پیش قدمی بھی اسے روک دینی چاہیے۔ تمام قلعوں خصوصا حصار کی حفاظت کا معقول بندوبست وہ کرے اور ادھر خسرو شاہ اور اور اسکا بھائی ولی بدخشاں جا کر کوہستانی سرحد کے مورچے سنبھالیں۔۔۔ تاکہ ازبک لازما بے نیل ومرام واپس ہو جائے۔

ان خطوں کو پڑھ کر بابر سے بھی پہلے خسرو شاہ نے آنے والی مصیبت کا اندازہ کر کے ہی بابر سے مصالحت کی وہ صورت نکالی جس کا اوپر ذکر آیا اور اپنے خزائن لیکر ہرات کی طرف چلا گیا۔ بابر ان عجیب طول طویل خطوں کا اب مطلب سمجھا۔ حسین میرزا کا پیرانہ سالی میں خرف ہو جانا ممکن تھا لیکن اس جیسا آدمی جاہل و بے خبر نہ ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنے دور کے بھتیجے کی کسی بچپن کی بات کا بدلہ لے رہا ہو؟ بہر حال وہ سوچتا ہی رہا اور ادھر ازبک نے حصار کو آ گھیرا اور انہی کشتیوں میں، جنہیں بابر چچا کے لئے تیار کرانے کی سوچتا تھا، بیٹھ بیٹھ کر آمو کے پاس اترنے لگے۔

ادھر بابر کا حال یہ کہ دو تین سو نیم فاقہ کش رفیق اور چرب گفتار باقی بیگ ہم رکاب تھے۔ البتہ فراریوں کی فوج لشکر گاہ میں جمع ہو گئی تھی۔ اس نے مایوسی کی چادر اتار پھینکی، کام کرنے پر آمادہ ہوا۔

پاسبانوں کے سردار، ایشک آغا، صاحب در قاسم کو چند سوا دے کر بھیجا کہ ازبک قراول جو قریب آ گئے ہوں، پیچھے دھکیل دیئے جائیں۔ خسرو شاہ اسلحہ کا ذخیرہ چھوڑ گیا تھا۔ اسے ٹٹولا تو کئی سو زرہ جوش اور ہتھیار ملے جنہیں فوراً اپنے آدمیوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر خسرو کے بارواری کے اونٹوں کی گرد بیٹھنے نہ پائی تھی کہ خود بھی اپنے رضا کاروں کا لاؤ لشکر لے کر شباشب جنوبی پہاڑوں کی محفوظ سرحد کی طرف چل پڑا۔ تھوڑے سے محافظ چھوڑ دیئے کہ عورتوں بچوں کو پھیر کے راستے پیچھے پیچھے لے آئیں۔ خلاف معمول تامل کے ساتھ لکھتا ہے۔ اب یہ لشکر گاہ چھوڑ کر ہم کابل پہ چلے، فوجی پسپائی کی حالت میں ''بڑھنے'' کی یہ ایک قدیم نظیر کہی جا سکتی ہے۔

جنوب میں جس قدر آگے بڑھے پہاڑوں کی سیاہ نیلگوں قطاریں ایک کے پیچھے ایک بلند تر ہوتی گئیں۔ پہاڑ کے دامنوں سے بل کھاتے ہوئے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ یہ ہندوکش کے پہاڑ تھے جو موسم خزاں میں چٹیل رہ جاتے ہیں۔ یہاں بابر نے ایک شگون لیا اگرچہ ان دنوں سے شگونوں پر کچھ اعتماد نہیں رہا تھا۔

''ہم ساری رات چلے اور صبح ہوتے (بہ تصحیح مترجم) ہوبیان کے درے پر چڑھے۔ میں نے اس وقت تک ستارہ سہیل نہیں دیکھا تھا۔ درے کی چوٹی پر ایک ستارہ جانب جنوب خوب چمکتا ہوا نظر آیا۔ میں نے کہا یہ سہیل تو نہیں ہے؟ لوگوں

نے بتایا کہ سہیل ہی ہے۔

باقی بیگ چغتائی نے شعر پڑھا۔

تو سہیلی تا کجا تابی و کے طالع شوی
چشم تو بر ہر کہ می افتد نشان دولت است

ہندوکش سے پار ہونے کے بعد ہمارا شیرازبکوں کی دسترس سے تو باہر تھا لیکن ابھی قسمت کی مساعدت کی ضرورت تھی۔ جنوب کو کوچ کے آغاز میں ہی کچھ کم گڑبڑ نہ تھی۔ اب جوان کے اہل وعیال پیچھے پیچھے پہاڑی بیٹوں سے ہوتے ہوئے آئے تو مزید چرچا ہوا اور بہت سے پہاڑی لوگ جو کسی سرلشکر کے جھنڈے کے نیچے سلامتی اور لوٹ کے طالب تھے۔ ان کے عقب میں چل پڑے۔ چنگیزی مغول کی فاتح فوجوں میں بچے کچھے خانہ بدوش ہزارہ قبائل بھی تھے جو گھوڑوں پر چڑھ چڑھ کر اس لشکر گاہ میں آئے کہ آگے کے میدانی علاقوں کی لوٹ میں حصہ لگائیں۔ اس کے بے قابو نئی بھرتی والے آگے آگے دوڑاتے اور دیہات سے سامان رسد وصول کرتے تھے۔ خود راستہ با قاعدہ کاروانی شاہراہ نہ تھا بلکہ گلہ بانوں کی پگ ڈنڈی تھی۔ چراگاہوں میں بابر کے لچے پیادے۔ چرتے گھوڑے اڑالانا چاہتے تھے۔ مسلح فوجیوں کی سامان خوراک کے لیے دیہاتیوں سے لڑائیاں ہو جاتی تھیں۔ حتی کہ روغن زیتون کی ہنڈیا لوت لینے والے کو اس نے ایک بار لکڑیوں سے اتنا پٹوایا کہ اس کا دم نکل گیا۔ لکھتا ہے کہ یہ نظیر دیکھ کر سب کانپ گئے اور ایسی مزید حرکتیں بند ہو گئیں۔

حقیقت میں تادیب وتعزیر کی ضرورت تھی۔ جس علاقے میں لشکر گھسا، وہاں خانہ جنگیوں نے ابتری پھیلا رکھی تھی۔ اس ولایت (کابل) کا آخری تیموری حاکم بابر کا ایک اور چچا اور نامور عالم الغ بیگ کا ہم نام تھا۔ اہل ملک اسی کی تعدیوں سے نالاں رہے۔ جب وہ امرا تو ایک شخص نے غاصبانہ قبضہ جمالیا اور متوفی حاکم کے طرح طرح کے رشتہ داروں سے دیہات کی بھول بھلیاں میں جنگ کرتا پھرتا تھا۔ جاگیرداری نظام کی اس کامل بدامنی میں پہلے تو خسرو کے مغل جواب بابر کے لشکر میں آ گئے تھے، داخل ہوئے، پیچھے پیچھے ہزارہ اور دوسرے قبائل کے غول آ گھسے، ہر طرف مار دھاڑ کی ایک وبا سی پھیل گئی۔ اسی میں ایک مرتبہ بابر کی ماں اور لشکر کے دوسرے عورتوں بچوں کا قافلہ لشکر کو آتے آتے پھنس گیا تھا، خود بابر کو انہیں چھڑا کر بلند و وسیع چراگاہ میں لانا پڑا جہاں انہیں فی الجملہ اطمینان نصیب ہوا۔

اب ایک خاصا پرہیبت منظر ان کے سامنے تھا۔ پہاڑوں کے ایک عظیم دائرے میں تپتے ہوئے صحراؤں کے درمیان چاندی کی زنجیر سی ایک ندی چلی جاتی تھی اس کے کناروں پر ایک سرسبز قطعہ جڑا ہوا تھا۔ ان پہاڑوں کا قلعہ، کابل یہی تھا۔ مگر مقیم (ارغون) جو غاصبانہ قابض ہو گیا تھا، اس موقع پر قلعے کے دفاع کرنے کی مہلت نہ پاسکا۔ باقی بیگ نے زور دیا کہ فوراً حملہ کر دیا جائے۔ بابر نے یہ رائے مان لی۔ تجربے نے اسے سبق دیا تھا کہ ایسے جنگلی خطوں میں لوگ ہمیشہ اسی سپہ سالار کا ساتھ دیتے ہیں جو آگے آگے بڑھے جائے، نہ کہ اس کا جو خالی اپنی جگہ پر ڈٹا رہے۔ دونوں قائد اپنے مسلح سواروں کی تھوڑی بہت جنگی صف بندی کرا کے، پرچم

اڑاتے، حوصلہ افزا نقارے بجاتے ہوئے چلے۔ بابر قدرے بلند ٹیلے پر جہاں بعد میں چار باغ بنوایا، کھڑا تھا۔ اس نے سرکش محافظین قلعہ سے گفتگو کرنے کی غرض سے علاحدہ آدمی بھی روانہ ہو گئے۔ اس نمائشی یورش پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہے۔

''ہمارے ہراول کے جوان ندی کے کنارے قتلق قدم کے پل کے شمال میں پھیل گئے۔ مگر اس وقت وہاں کوئی پل نہ تھا۔ بعض گھوڑے ڈپٹا کر دروازہ چرم گراں تک جا پہنچے اور اس دروازے سے جو شہر والے مقابلہ کرنے باہر آئے تھے، وہ الٹے بھاگے۔ ازک کی ڈھلان پر کچھ کابل والے تماشا دیکھنے کو آئے تھے۔ وہ بھی بھاگے تو بہت گرد اڑی۔ بلندی سے کئی آدمی لڑھک پڑے۔ دروازے اور پک کے درمیان (حریف نے) گڑھے کھود کر اندر نوک دار میخیں گاڑ دی تھیں اور اوپر خشک گھاس بچھائی تھی۔ سلطان قلی چناق اور کئی سوار دھوکا کھا کر ان گڑھوں میں گرے۔ دائیں جانب میرے چند سواروں نے قلعہ والوں سے تلوار کے دو دو ہاتھ کئے لین انہیں جم کر لڑائی کرنے کا حکم نہ دیا اس لئے پلٹ آئے۔'' لیکن جنگ کا یہی گرما گرم مظاہرہ بابر کے قاصدوں کو حسب مراد جواب لانے میں کارگر ثابت ہوا، یعنی مقیم نے انہیں دوستانہ طور پر بٹھایا اور قلعہ خالی کرنے کی شرطیں طے کر لیں۔ مقیم کو جنگی اعزاز کے ساتھ نہیں، تو کم سے کم جملہ اہل وعیال، خدم و حشم اور اموال کے ساتھ دوسری صبح قلعہ خالی کرنے کی قرارداد ہو گئی۔ اس خوف سے جو بے جا نہ تھا، کہ ان لوگوں کے رخصت ہوتے وقت ہنگامہ برپا ہو گا۔ بابر نے چند معتمد علیہ سردار شہر کے دروازے پر متعین کئے کہ امن وانتظام قائم رکھیں۔ لیکن تھوڑی دیر میں ان سرداروں

کے آدمی آئے کہ خسرو کا (سابقہ) سپاہیوں نے مغلوب حریف کا قافلہ روک لیا ہے اور جب آپ خود نہ آئیں ہم ان کو آویزش سے باز نہ رکھ سکیں گے۔''

بابر نے صورت حال کو قابو میں کیا، میں سوار ہو کر خود وہاں گیا۔ دو تین زیادہ شورش کرنے والوں پر تیر مارے اور دو ایک کو تلوار سے قتل کرایا۔ تب مقیم، اس کے ساتھی اور مال اسباب روانہ ہو کر صحیح سلامت تیپہ پہنچ گئے۔ اس طرح اللہ تعالی نے مہینے (ربیع الثانی) کے آخر (اکتوبر ۱۵۰۴ء) تک اپنے کرم سے کابل وغزنی اور ان کے توابع کا لڑے بھڑے بغیر مجھے مالک بنا دیا۔''

ارض ''قابیل'' کا جائزہ

شیر کی سب سے پہلی۔۔۔ اور طبع ترنگ یہ تھی کہ آگے بڑھے جائے اور دیکھے کہ مزید کتنا ملک فتح کر سکتا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ اس کے نئے دارلملک کی ندی مشرق میں بہ کر دریائے سندھ میں جا ملتی ہے۔ جس کے پار ہندوستان ہے تو وہ اسی رخ چلنا چاہتا تھا۔ مگر باقی بیگ نے خبردار کیا کہ پہلے نئے گھر کو قرینے سے لگا لو اور آس پاس کے قبیلوں کی طرف سے اطمینان کر لو پھر انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے جانا۔ کیونکہ سرزمین قابیل (کابل) کی صفات خاصہ میں سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ کسی کی حکومت برداشت نہیں کرتی۔

تب بابر نے ذوق وشوق کے ساتھ اپنے نئے شہر، نئے ملک اور وہاں کے باشندوں پر توجہ مبذول کی۔ اس کی دیکھ بھال خاصی تفصیلی جنگی نوعیت کی تھی اور

جو کچھ دریافت کیا اس ک ساتو پوری دلچسپی لی۔ وہ سوچتا تھا کہ آیا یہ نئے نرالے مناظر، بادل چھونے والی بلندیاں نامتناہی فاصلوں والی سرزمین سمرقند ثانی بن سکتی ہے؟ اس نے رائے قائم کی کہ ''یہ تنگ عرض کا ملک ہے۔ ہندوکش کی فصیل شمال میں قندز سے اور جنوب میں (قبائلی) افاغنہ کی سرزمین سے اسے جدا کرتی ہے۔ مغرب میں غورک پہاڑ (ہرات تک) چلے گئے ہیں اور مشرق میں خیبر کے گردنے پر (پشاور اور مما لک ہند ہیں۔'' شہر کابل اسے پسند آیا کیوں کہ تیز روندی کے اوپر پہاڑوں میں الگ تھلک آباد تھا اور دامن میں باغ ہی باغ ''گل کتہ (یا گل کنہ؟) مقام جہاں عیاشی کی جاتی ہے پھیلے ہوئے ہیں۔ خواجہ حافظ کے شعر میں اس کے مناسب حال تصرف کرکے پڑھتا ہوں۔

اے خوش آن وقت کہ بے پاو سرا ایامے چند

ساکن گل کتہ (۴۰) بوویم بہ بدنامے چند

بالا حصار (ارک) سے متصل جو نہایت بلند پہاڑی کے اوپر واقع تھا، چناروں کے سائے میں قدم گاہ (خواجہ خضر۔ مترجم) کے چشمے کے پاس ایک ٹیکرے پر بابر کا قیام تھا (یہاں اس نے وہ غلطی نہیں کی جیسی اخسی میں کی تھی کہ میزبان دوست کے حوالے قلعہ کردیا تھا اور یہاں باقی بیگ کے حوالے کردیتا) یہاں سے مرغزار چالاک کی دلدلی چراگاہ اور کوئی تین میل دور کا بڑا تالاب نظر آتے تھے جس کی بابر نے قدموں سے پیائش کرائی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں قلعے کے دریچوں اور کنگوروں کے بیچ میں سے چلتی رہتی تھی۔ اس شمالی ہوا کو یہاں کے لوگ (بہ تصحیح) بادپراں کہتے

تھے (بہ تصحیح و اضافہ) ملا محمد طالب معمائی نے قلعہ کابل کی تعریف میں یہ شعر کہا تھا

بخور در ازک کابل نے بگرواں کاسہ پے درپے

کہ ہم کوہ است وہ ہم دریا وہم شہراست وہم صحرا

بعض شرابوں کی تعریف کے سلسلے میں کچھ آگے چل کر بابر (جو اس وقت تائب تھا) لکھتا ہے کہ ہم تو اب تقلید یہ تعریف کر رہے ہیں کیوں کہ۔

''لذت مے مست داند، ہوشیاراں راچہ خط''

(۴۱)

نئے وطن کی تعریف اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ کابل سے ایک دن کی مسافت پر ایک مقام ایسا ہے جہاں برف کبھی نہیں گرتی اور ایک ایسا ماحول دو نجومی ساعتوں میں پہنچ سکتے ہیں اور وہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔ مگر از راہ راستی یہ اضافہ کر دیا ہے ''سوائے کبھی کبھی سخت گرمی کے''

آب و ہوا کی تعریف میں بابر نے خاصا مبالغہ کیا ہے اور کاروانی تجارت کی بھی دل پسند تصویر کھینچی ہے۔ حالانکہ خود اعتراف کرتا ہے کہ یہ زیادہ تر گھوڑوں کی ہوا کر تی تھی۔ لکھتا ہیکہ کابل ایسی اچھی منڈی ہے کہ سوداگر روم (ترکی) یا خطا (چین) تک جائیں تو بھی یہاں کے تین چار سو فیصدی نفع سے زیادہ نفع نہیں کما سکتے۔ بعض اوقات بابر کے استدلال میں آرئستان کے لوگوں کی اندھی مطلب پرستی کی کیفیت آجاتی ہے۔ تاہم جنس کا جو ہندوستان سے تجارت کے لئے آتی تھی۔ فرداً فرداً شمار کرتا ہے۔ لونڈی غلام۔ اچھی قسم کا سفید کپڑا، لیشکر، قند مصری، معمولی شکر، مصالحے

کی جڑی بوٹیاں۔ مقامی پھلوں کا اس نے تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اور فرغانہ کے انگور و خربزہ کی یاد بار بار تازہ کی ہے۔ یہاں کی پیداوار کو پہاڑ کے اوپر (سیر و سیر) اور نیچے کے (گرم سیر) خطوں میں تقسیم کرتا ہے۔ سرو سیر میں انگور، انار، خوبانی، شفتالو، سیب، بہی، ناشپاتی، بیر، اخروٹ، بادام اور دریائے سندھ کی طرف گنا۔ آگے چل کر خود اس نے لیشکر کی کاشت کرائی جس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ باہر سے شاہ دانہ منگا کر لگایا تو وہ خوب پھل لایا۔ اسے اعتراف ہے کہ یہاں خربوزہ اچھا نہیں ہوتا۔ صرف ہرات کا اچھا خاصہ کہا جا سکتا ہے۔ شہد کے چھتوں کی کثرت تھی مگر شہد صرف مغربی اضلاع سے آتا تھا۔

یہ بات بابر نے بہت جلد معلوم کر لی کہ کابل غلہ خوروں کا خطہ ہے مگر کافی غلہ پیدا نہیں کرتا۔ لامحالہ پہاڑی قبائل سے غلہ لانا پڑتا ہے۔ اور یہ ایسا معاشی مسئلہ تھا جسے وہ آخر تک حسب دل خواہ حل نہ کر سکا۔ علی ہذا چراگاہوں کی بھی دشواری پیش آتی تھی جن میں مکھی مچھر گھوڑے کے گلوں کی تنگ کرتے تھے اور انہی پر بہت کچھ دارومدار تھا۔ بہر حال، بابر کسی قدر آرٹستانی مشیخت کے انداز میں تجارت و زراعت کا جائزہ ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔

”کابل کی آب و ہوا نہایت لطیف ہے کہ اور کسی جگہ کی اتنی اچھی معلوم نہیں ہوئی۔ گرمی راتوں میں بھی پوستین میں لپٹے بغیر نیند نہیں آتی۔ جاڑوں میں گہری برف پڑتی ہے پھر بھی سردی زیادہ شدید نہیں ہوتی۔ سمرقند و تبریز کی ہوا کی خوبی میں مشہور رہیں لیکن وہاں سردی

غضب کی پڑتی ہے۔‘‘

شہر کی دیکھ بھال کرنے سے معلوم ہوا کہ حویلیوں کی بجائے پہاڑی باغ زیادہ ہیں۔نواح کے مرغزاروں اور چراگاہوں میں گھومنے کے بعد جب بابر اپنے نئے ملک کی حدود دیکھنے نکلا تو پتا چلا کہ وہ فرغانہ سے بڑھ کر پہاڑی دیواروں سے مختلف اجزا میں بٹا ہوا ہے۔اس نے دروں کو پوری توجہ سے جانچا اور نتائج نے اسے حیران کر دیا۔ شمالی اور جنوبی پیچ در پیچ راستے اکثر صرف وسط گرما میں قابل استعمال ہوتے اور سوائے ایک کے باقی سب جاڑوں میں برف سے اور موسم بہار میں ندی نالوں کی طغیانی سے مسدود ہو جاتے تھے افغانستان میں آنے والے چار بڑے درے سطح بھر سے دس ہزار فیٹ سے زیادہ بلندی پر ہیں، ہرات کا سب سے اچھا راستہ نشیبی قندھار کا پھیر کھا کے اوپر جاتا تھا اور ہندوستان کا بہترین راستہ کابل ندی کے کنارے کنارے تھا۔ عام طور پر دونوں سرے قبائلی لوگوں کے قبضے میں تھے اور وہ چاہتے تو مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر بابر نے نتیجہ نکالا کہ کابل مضبوط قلعہ ہے جس کی آسانی سے مدافعت کر سکتے ہیں۔

اس نئی مملکت میں دوسرا قابل ذکر شہر غزنی قندھار کے راستے پر واقع تھا اور وہ معترف ہے کہ شکستہ حال، گھٹیا رہ گیا تھا۔اسکا امتیاز لے دے کر سلاطین عہد رفتہ کے مقبرے تھے بابر تعجب کرتا ہے کہ سلطان محمود اعظم نے اس مقام کو کیوں پسند کیا جب کہ خراسان میں اپنے محلات تعمیر کر سکتا تھا۔ اسنے ان مقبروں کی مرمت اور درستی کے احکام جاری کیے۔ عام تصور میں وہ اپنے آپ کو سلاطین غزنوی کا جانشین دیکھتا

تھالہذا ان کے روضات و مقابر سے غفلت نہ کرسکتا تھا۔

کابل میں خود اس کی سکونت گاہ، ظاہر ہے کہ تجدید و ترمیم کی متقاضی تھی۔ اس نے ٹیکرے پر جس سمرقند کے باغ کی یاد میں چار باغ موسوم کیا، درخت لگانے شروع کیے۔ قریب ہی ایک برف پوش پہاڑی سے ندی بہتی ہوئی آتی ہے، دونوں کنارے پر سرسبز و شاداب دلکش باغات ہیں۔ پانی اتنا ٹھنڈا کہ کسی زمانے میں برف کی حاجت نہیں ہوتی۔ انہی میں بڑے باغ کو میرے چچا الغ بیگ (جو بابر سے پہلے یہاں حاکم اور استحصال بالجبر کرتا تھا) نے زبردستی چھین لیا تھا۔ میں نے اس کا مالکوں کو قیمت ادا کر کے اپنے نام کرایا۔ اس کے احاطے میں چار طرف چنار کے درخت سایہ افگن ہیں جن کے نیچے بہت اچھی پر لطف نشست ہو سکتی ہے۔ ان کے درمیان سے ایک نالا گزرا ہے جو سارے سال جاری اور اتنا بڑا ہے کہ ایک پن چکی کو چلا سکتا ہے۔ میں نے اس کے پیچ و خم درست کرا کے گزرگاہ کو سیدھا کرا دیا۔ نیچے کیرخ آگے چل کر وہ چشمہ آتا ہے جسے (بہ تصحیح مترجم) خواجہ موسوم کرتے ہیں۔ ان کے دونوں طرف پہاڑیوں پر شاہ بلوط کے درخت ہیں۔ ان دو جھنڈوں کے سوا یہ درخت کابل کے مغرب میں کہیں نہیں ہوتا۔ چشمے سے نیچے کی طرف چلیں تو جگہ جگہ گل ارغواں کے چمن کھلے ہیں۔ یہ پودا بھی ملک بھر میں اور کہیں نہیں ہوتا۔ مشہور ہے کہ (چنار، بلوط، ارغواں کے) یہ تین درخت والے بزرگ کی کرامت سے یہاں پیدا ہوئے اور اسی لئے یہ جگہ خواجہ سیاران موسوم ہوئی۔ میں نے حکم دیا کہ چشمے کی دیواریں پتھر سے چن کر اسے باقاعدہ دہ دردہ کا حوض بنا دیا جائے۔ چشمے کے پاس

آرام لینے کی جگہ بنوائی۔ جس وقت یہ زرد و سرخ پھول کھلتے ہیں تو وہ کیفیت یہاں ہو جاتی ہے کہ میں جانتا ہوں دنیا بھر میں کہیں نہ ہوتی ہوگی۔ چشمے کے جنوب مغرب کی وادی میں ایک نالا بہتا ہے جس میں پن چکی چلانے کے قابل پانی سے آدھا پانی ہوتا ہے میں نے اس کے پختہ کنارے بنوا کر نہر اور اس کے اوپر بلندی پر گول چبوترہ بنوادیا۔''

ذاتی دلچسپی کے ان مقامات سے بابر کا شغف بڑھتا ہی چلا گیا۔ عجب نہیں کہ نئی مملکت کی وسعت اور دیو پیکری کے ساتھ، اس کا انسانیت سے عاری ہونا دیکھ کر یہ نفسی ردعمل ہوا ہو۔ بے گیارہ پہاڑوں کی خالی چٹانوں اور ویران گھاٹیوں کا وہ اعتراف کرتا اور لکھتا ہے کہ جیسے تنگ و محدود قطعات کوہ ہیں۔ ویسے ہیں ان میں بسنے والوں کے دل تنگ ہیں'' جانور تک کمیاب تھے۔ سرخ ہرن اور گورخر گھانس کی تلاش میں میدانی علاقہ چھوڑ کر پہاڑیوں کو ہجرت کر گئے تھے۔ شکاریوں کو شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑانے کی بجائے گھات لگا کے ان کو ہجرت کر گئے تھے۔ شکاریوں کو شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑانے کی بجائے گھات لگا کر انکی واپسی کے راستوں پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ پرندے تک ان بے ڈھنگی گھاٹیوں سے نکل بھاگتے تھے۔ ان کا شکار کھیلنے والے گزرتی ہوئی مرغابیوں وغیرہ کی عادت جانتے تھے کہ دروں میں مخالف ہوا تیز چلتی ہے تو یہ پرند زمین پر بیٹھ کر دم لینے لگتے ہیں۔ انہیں دو شاخہ تیر اور رسی کے پھاند سے شکار کرنا خاصا بے مزہ، محنت طلب کام تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ ''شکار بارش کی اندھیری راتوں میں کرنا پڑتا تھا۔ جب کہ یہ پرند درندوں کے خوف

سے زمین پر نہیں اترتے مگر زمین سے لگے لگے ہی اڑتے رہتے ہیں۔ خصوصاً بہتے پانی کے اوپر، کیوں کہ اس کی چمک انہیں نظر آتی ہے۔ اسی طرح کے ندی نالوں کے پاس شکاری اپنے جال ڈالتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے بھی جال ڈلوایا۔ مگر وہ ٹوٹ گیا اور پرندہ آگے اڑ گیا۔ لیکن دوسری صبح ہانکے والے اسے امرا ہوا لائے۔ وہ جال کی ٹوٹی رسی میں لپیٹ گیا تھا۔

ریگستانی ویرانوں میں رات کو رجال غیب کا گزر ہوتا تھا۔ ٹیلوں پر سے تیز ہوا گزرتی تو ڈھول بجنے کی مدھم آواز اور گھوڑوں کے چلنے کی چاپ سنائی دیتی۔ لوگ کہتے کہ شہیدوں کی فوج سوار جارہی ہے۔ بابر اسے تھوڑا بہت باور کرتا۔ تاہم اب لڑکپن کی طرح زود اعتقاد نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اسے ایک مسجد میں لے گئے۔ کہا کہ با آواز بلند نماز پڑھی جائے تو مسجد کی دیواریں ملنے لگتی ہیں۔ سمرقند کی گونج والی مسجد کی طرح بابر نے فوراً آزمائش کی اور دیکھا کہ نماز کے دوران میں بے ڈھنگی سی دیواریں چرچرائیں اور ہلنے لگیں۔ تحقیق کی تو موذن کے مینار پر ایک خادم لکڑی کی باڑ پر (چھپا) تھا اور بروقت دیواروں کو حرکت میں لاتا تھا۔ بابر نے حکم دیا کہ آئندہ نماز کے وقت تمام خدام نیچے مسجد میں حاضر رہا کریں۔ (۴۲)

آئندہ موسم بہار میں جب ہری گھانس اگی، بابر کو ایک صدمہ اٹھانا پڑا۔

''اس مہینے میری والدہ کو بخار ہوا۔ فصد کھلوائی لیکن اچھی نہ کھلی۔ ایک خراسانی طبیب نے جس کا نام بھی سید طبیب تھا۔ خراسانی اطبا کے معمول کے مطابق تربوز بھی کھلایا لیکن اس کا وقت آ گیا تھا۔ چھ

دن علیل رہ کر اللہ کے گھر سدھاری۔اتوار کے دن نوروزی باغ میں جہاں پہاڑی پر الغ بیگ نے ایک بارہ دری بنائی تھی۔باغ کے مالکوں کی اجازت لے کر میں نے اور قاسم کوکلتاش نے اسے قبر میں اتارا۔ اس کی عزاداری کے زمانے میں لوگوں نے مجھے اپنے ماموں الچھ خاں اور میری نانی ایسان دولت بیگم کے انتقال کی خبر سنائی۔خانوں کی ایک ماں شاہ بیگم میری باقی ماندہ خالہ کو ساتھ لے کر خراسان سے والدہ کے چہلم کے دن پہنچی اور عزاداری تازہ ہوگئی۔عزیز بزرگوں کی مفارقت کا سخت صدمہ ہوا۔غریب غربا کو کھانا کھلوایا۔قرآن خوانی کرائی مراسم عزا کی تکمیل اور دعائے مغفرت کر کے ہم نے دلوں کو تسلی دی اور صبر و استقامت حاصل کی''

دل مضبوط کرنے کی یقیناً ضرورت تھی۔علاقے کی کیفیت لکھنے کو بھی بابر نے یہ کہہ کر بالائے طاق رکھا کہ ''سرزمین کابل پر قلم سے نہیں، تلوار سے حکومت ہوتی ہے۔''

باقی بیگ کی دسویں برائی

بابر نے ماں اور نانی کے غم میں جو سیاہ لباس پہناوہ رسمی بات نہ تھی۔وہ حقیقت میں تنہا رہ گیا اور ان کے مرنے پر دلی رنج محسوس کرتا تھا۔تاج و تخت سے محروم ہونے کے بعد بھی فرغانہ میں دوست احباب اس کی خاطر بھوک پیاس کی تکلیف

سہتے رہے وہ اسے یاد آتے تھے، بدعقل سلاخ تک خدا جانے ساتھ چھوڑ کے کہاں چلا گیا۔ وہ صحبت بابر کی غذائے روح تھی۔ اس نے ایک مرتبہ کہا تھا ''مرگ با دوستاں جشن است''

بابر کی ماں اپنی زندگی سے مایوس ہوئی تو اصرار کرتی تھی کہ بابر دوسری شادی کرلے کیوں عائشہ مدت سے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بابر نے تعمیلاً شاخ سمرقند کی ایک عم زاد زینب سلطان بیگم سے شادی کی۔ یہ بھی کچھ سازگار نہ ہوئی۔ دو سال بعد چیچک کے مرض سے انتقال کرگئی۔ شہزادی زینب سلطان سے اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ وہ بابر کے بیرونی گشت لگانے میں ارک کابل ہی میں اپنے نوکروں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ادھر گھر والوں کی طرف سے نئی نئی پریشانیاں یہ پیش آنے لگیں کہ سب سے چھوٹا بھائی ناصر میرزا شرابی دوستوں کا ہم پیالہ اور بابر سے دور ہی دور رہنے لگا۔ جہانگیر کمزور فطرت کا جوان ہر وقت کی پاسبانی کا محتاج تھا۔ باقی بیگ سب سے پہلے اصرار کرکے ہرات کی بجائے اسے کابل لایا وہ اس بھائی کے خلاف برابر بابر کے کان بھرتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ جاہ طلب امیر اس ساز باز میں مصروف تھے کہ صاحب عزم بابر کی بجائے ضعیف الارادہ جہانگیر کو بادشاہ بنایا جائے۔ ایک مرتبہ دریائے سندھ کے کنارے کنارے جنوب کی طرف کوچ ہو رہا تھا کہ جہانگیر میرزا نے کان میں کہا باقی بیگ نے صیغہ راز میں مجھے بتایا تھا کہ چند سرداروں نے بادشاہ کو دریا پاس کی بہانے بھیج کر جہانگیر کی بادشاہی کا اعلان کرنے کی صلاح ٹھیرائی ہے۔ بابر جہانگیر کی یہ اپنائیت دیکھ کر خوش ہوا۔ جہانگیر

نے تو سوائے باقی کے اوروں کے نام نہیں بتائے مگر بابر نے گمان کیا کہ وہ خسرو کے پرانے سردار ہوں گے (خسرو اس وقت تک مارا نہیں گیا تھا) بایں ہمہ ایسی حالت میں کہ سابقہ مدعی مقیم ملک میں موجود اور ازبک شمالی دروں کے آس پاس گھوم رہے تھے وہ سردست ان سازشی سرداروں کے بغیر کچھ نہ کرسکتا تھا۔

اکثر کہا گیا ہے کہ جب بابر خیبر پہلی پہلی اتری سے نکلا اور صرف تجسس کی غرض سے سندھ کے کنارے تک گھوڑے پر سوار پہنچا تو اس بھورے بھورے پانی کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ ہندوستان میں گھس پڑے۔مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔اس کی مخلوط جمعیت تاخت کرنے آئی تھی کہ کابل کے علاقے سے باہر غلہ مواشی وغیرہ لوٹ کر اپنا اور کابل والوں کو پیٹ بھرے۔یہ ۱۵۰۵ء تھا اور ابھی بابر کے پاس ایک بھی ایسا معتمد علیہ آدمی نہ تھا جسے وہ اپنے پیچھے حفاظت ملک کے لئے چھوڑ جائے۔ اسے یہ بات بخوبی معلوم تھی اور ہندوستان کا سب سے پہلا منظر دیکھ کر جو کیفیت اس نے قلم بند کی۔اس میں کچھ زیادہ ذوق وشوق نہیں پایا جاتا۔

میں نے گرم ملک یا زمین ہندوستان کو کبھی نہ دیکھا تھا۔اب جو نظر پڑی تو دنیا ہی نئ تھی۔گھاس پات، درخت سب دوسری طرح کے جانوروں کی قسمیں مختلف، پرندوں کے پر نئی طرح کے۔ایل والوس، (قبائل) کے اوضاع واطوار بالکل نئے۔ ۔۔۔غرض دیکھ کر حیرت ہوگئی اور تھی بھی حیرت کی بات۔''

ہندوستان سے واپسی میں یہ فوج ایسے ویران، خشک پہاڑی ندیوں کے راستوں سے چلی جہاں گھوڑے گر گر کے مرجاتے تھے اور محض اتفاقی طوفان بارش

پڑاؤ سے ان کی لاشیں بہا کر صرف کرتا تھا۔ تاہم اس واپسی کے سفر میں پہاڑی بھیڑیں جمع کرتے ہیں ایک بڑی جھیل پر پہنچے جسے دیکھ کر بابر بہت خوش ہوا۔ لکھتا ہے کہ

''ساکن پانی کی ایک عظیم چادر ہمارے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ پانی آسمان سے باتیں کرتا معلوم ہوتا تھا۔ اور بعید کناروں کے ٹیکرے اوندھے نظر آتے تھے جیسے سراب کے ٹیلے نظر آتے ہیں۔۔۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں پانی اور آسمان کے درمیان ایک سرخ چیز دکھائی دیتی تھی جیسے دھوپ کے چمکارا کہ چمکا اور غائب ہوگیا۔ جب ہم زیادہ قریب ہوگئے تو معلوم ہوا کہ باغلان قازوں (لال لم ڈھینک ؟) کے بڑے بڑے جھلڑ، دس بیس ہزار کے نہیں، بے شمار قازوں کے اڑنے سے یہ کیفیت نظر آتی تھی۔ مگر یہاں صرف یہی قازیں نہ تھیں بلکہ اس پانی کے کنارے طرح طرح کے پرندے رہتے تھے کونوں اور کراڑوں میں ان کے ڈھیروں انڈے پڑے تھے۔''

افتادِ مزاج کے مطابق، اس سراب آسا آبِ ساکن سے بھی بابر اس وقت تک آگے نہیں گیا جب تک پوری طرح تحقیق نہ کرلیا کہ کون کون سے ندی نالے اس جھیل میں آکر گرتے ہیں اور وہ کتنی دیر چلتے اور کب خشک ہوجاتے ہیں۔ نیز یہ کہ جھیل سے آب پاشی کے بعد کتنا پانی اس قدرتی بند میں جمع رہتا ہے۔ اس کے تحریر کردہ کوائف کو پڑھیے تو بین السطور آپ اندازہ کریں گے کہ لکھنے والا اس پہاڑی سرزمین ''قابیل'' کو پوری طرح سمجھنے اور اس سے کام لینے پر اس لئے تلا ہوا ہے کہ وہ اسے وطن سمجھتا ہے۔ فی الواقع تھوڑی ہی مدت میں ہم اسے کابل کا گرویدہ ہوتا

ہوا دیکھتے ہیں۔

ایک فرماں روا کا ابتدا ہی سے بابر نے اختیار کر لیا تھا۔ ملک کے دوسرے شہر غزنیں کو جہاگیر مرزا کی جاگیر میں دیا اور اپنے مقربین کو بڑی بڑی زمینداریاں عطا کیں۔

کابل میں اسے نذرانے اور تحائف زیادہ نہ ملتے تھے لیکن انہیں جب کبھی قبول کرتا تو عوض میں کچھ نہ کچھ خود عنایت کرتا تھا۔ ملک کی کوئی گھاتی مشکل سے ایسی ہو گی جس کا معائنہ نہ کیا ہو۔ پھر ہر موقع سے دربار منعقد کرنے کا کام لیتا تھا۔ مثلاً ایسے موقع کے لیے بھی جب کہ جنگلی افغان قبائل اظہار اطاعت کرنے دانتوں میں تنکے لے کر حاضر ہوئے ۔ اگر افغان قبیلوں نے اپنے پہاڑی سنگھروں (قلعوں) میں مقابلہ کیا تو بابر لازماً مقتولوں کی کھوپریوں کا کلہ منار وہاں بنواتا کہ یاد رہے۔ یہ چنگیزی مغول کی پرانی رسم تھی۔ بابر نے غالباً پہلی مرتبہ اس سے کابل آ کر کام لیا۔ علی ہذا ابار رہا جنگ کے تمام قیدیوں کو رہا بھی کر دیا کہ جاہل عوام کی اس رحم دلی پر یقین لائیں۔ فرغانہ کے دوست وار پہاڑی قبائل بابر کو بادشاہ جائز جان کر اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ افاغنہ کا یہ حال نہ تھا اور وہ ان سے ایک دفعہ بھی آمو سے اپنے ہمراہ آنے والے رفیقوں کے اہل و عیال کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی غلہ حاصل نہ کر سکا۔ اصل میں ان پہاڑی کھیتوں کی پیداوار کا اس نے تخمینہ اونچا لگایا تھا اور یہ غلطی نقصان رساں ثابت ہوئی۔ چنانچہ آگے چل کر اقرار کرتا ہے کہ ”میں نے جو مقدار طلب کی وہ بہت زیادہ تھی اور علاقے بھر کو تکلیف اٹھانی پڑی۔“

حقیقتاً بابر خود کو حکمرانی کرنا سکھا رہا تھا۔ دس برس پہلے وہ ایک لڑکا تھا جو سمرقند کے آثار عظمت کو بہ چشم حیرت دیکھتا تھا اور جو سو دن کے لئے اس شہر کا حاکم ہوا تو دولت تیمور کی بحالی کے خواب دیکھتا تھا۔ وہی لڑکا ملک بدر ہوا تو چند رفیقوں کے ساتھ گھوڑے دوڑاتا ہوا جدھر منہ اٹھا چل پڑا۔ خدا پر بھروسہ تھا کہ سب کام بنا دے گا۔ اس کے سوا کچھ پروا نہ تھی کہ کدھر جانا ہے۔ یہ حقیقت اسے اب معلوم ہوئی کہ بادشاہ کہلانے کے کچھ معنی نہیں ہیں جب تک کہ ملک کے انسانوں پر اسکا قابو نہ ہو اور وہ ان کے بال بچوں کی خوراک کا بھی انتظام نہ کرے۔

یہ نیا اور عاقل تر بابر اب کسی نجوبی رماں کے سننے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ وہ اچھی طرح دل میں پرکھنے کے بعد باقی بیگ چغانی کی نصیحت پر عمل کرنے لگا۔ ہر شخص جو اس کے ہم رکاب چلتا، وہ اس کی قدر و قیمت جانچتا اگرچہ اس کا اظہار نہ کرتا تھا۔ وہ برابر گشت میں رہتا اور رارک کابل یا گل کتہ میں کبھی زیادہ مدت راحت و آرام کے واسطے قیام نہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا ایک بہادر سوار دشمنوں کے تعاقب میں دریا اتر گیا اور جب دیکھا کہ اور کوئی اس کے ساتھ نہیں تو ذرا ٹھٹکا ہی دشمن پر جا پڑا۔ انہوں نے دو تین چلائے پھر بھاگ نکلے۔ یہ محض پھبکی دے کے کام نکالنا تھا۔ یا زچ ہونے کے وقت اعلیٰ درجے کی مردانگی تھی؟ بابر اس کی مدح کا اظہار اور دل میں اسے ترقی دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ اسی زمانے میں باقی بیگ نے کابل اور حوالی میں محاصل راہ داری خود لینے شروع کیے۔ وہ جتنا قابل قدر، اتنا ہی گھنا آدمی تھا۔ کیا اس کا یہ فعل اپنی قوت کے وثوق پر تھا؟ بابر نے چند اور امرا کے ساتھ اسے

حاجب نامزد کیا تو یہ بھی سوچا کہ دیکھیے اس نئے عہدے سے وہ کیا کام لیتا ہے؟ تھوڑی ہی مدت میں باقی بیگ نے اپنے دروازے پر نقار خانہ لگایا کہ اس کی سواری باہر جائے و نوبت بجائی جائے۔ حالانکہ یہ امتیاز بادشاہوں کے لئے مخصوص ہے۔ پھر باقی نے وہ حرکت کی جو کم سے کم بابر کی نظر میں نا قابل معافی تھی۔ اس کی ملکیت میں ہزار ہا بھیڑ بکری مختلف چراگاہوں میں موجود تھی لیکن لشکر گاہ میں غذا کا قحط پڑ گیا تو خسرو شاہ کے اس بھائی نے فقط پچاس بکریاں بھجوادیں۔ بابر نے علانیہ کوئی مواخذہ نہیں کیا، لیکن اپنی سخت ناراضی کا اظہار ضرور کردیا۔ اس پر باقی بیگ جو نخوت سے ہو موقع پر اپنے سبک دوش کر دیے جانے کا مطالبہ کیا کرتا تھا، اب بھی رخصت کا طلب گار ہوا۔ بابر ہمیشہ اسے سمجھا بجھا کر ٹھہرالیا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ تامل اجازت دی کہ چلا جائے۔ باقی بہت گھبرایا اور سراسیمہ ہو کر ایک وکیل کے ذریعے بادشاہ کو یاد دلایا کہ آپ نے میری نو خطائیں معاف کرنے کا وعدہ کیا تھا (یہ بھی چنگیز خانی رسم تھی کہ کسی سردار سے خوش ہو کر نو خطائیں معاف کرنے کا اقرار کیا جاتا تھا اور اتنی تعداد میں وہ جو بھی جرم کرتے، اس کی سزا نہ دی جاتی تھی نو کا عدد مقدس سمجھا جاتا تھا) بابر نے اس کے جواب میں ملا (بابا) کے ذریعے گیارہ خطائیں گنوادیں اور جبکوئی چارہ کا نہ رہا تو وہ جملہ متعلقین کو لے کر دریا کے راستے خیبر روانہ ہو گیا۔ آگے اس کا قافلے پر یوسف زئی سردار نے گھات لگائی۔ باقی بیگ کو مار ڈالا اور اسکی بیوی کو بھگا لے گئے۔ (۴۳) بابر لکھتا ہے کہ میں نے تو اسے جانے کی رخصت دی اور کوئی برائی اس کے ساتھ نہیں کی لیکن خود اس کی برائی اس کے آگے

آئی، ان الفاظ میں علی دوست کے لئے نوحے کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

بہر حال جدل یا بدیر ان آزاد و خونخوار قبائل سے حساب چکانا تھا جو پہاڑیوں پر بھتنوں کی طرح گشت لگاتے رہتے تھے اور جاڑوں میں عملاً ساری آمد و رفت روک دیتے تھے۔ ان میں یوسف زئی عیسیٰ خیل اور سب سے بڑھ کر ترکمان ہزارہ قبائل نمایاں تھے۔ آخر الذکر نے خود بابر کو ملک کے اندر آنے میں مدد دی تھی۔ ان کے ہاتھ سے بابر کا ایک معتمد علیہ مارا گیا تو اس نے عین وسط سرما میں ایک سبک پا جمعیت سے یکا یک ان پر حملہ کر دیا۔ ان کا سرمائی پڑاؤ (بہ تصحیح مترجم) وادی خوش میں تھا جہاں سے اتر اتر کے چھاپے مارتے اور اپنے آپ کو خوب محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ اس جاڑے میں برف اتنی پڑی کہ گھوڑوں کے خوگیر تک آتی تھی۔ طلایہ کے سوار برف کی زیادتی کے باعث رات بھر گھوڑوں پر ہی بیٹھے رہے (بابر نے پہرہ داروں کے لئے سخت قانون بنایا تھا کہ اگر کوئی رات کو سو جائے تو اس کے نتھنے چھید دیئے جاتے تھے) خوش کی وادی نئی طرح کی ہے۔ تقریباً ایک میل لمبا درہ طے کرنا پڑتا ہے۔ جس کے اوپر اونچی اونچی چٹانیں اور نیچے کے رخ پچاس ساٹھ گز (بہ تصحیح مترجم) گہرائی ہے۔ صرف ایک سوار کے چلنے کا راستہ ہے۔ درے سے گزر کر ہم عصر کی نماز کے وقت تک چلتے رہے اور پڑاؤ کرنے تک کوئی شخص ہمیں راستے میں نہیں ملا۔ ہزارہ کا ایک فربہ لدو اونٹ ہاتھ آیا، اسے لا کر ذبح کیا اور کباب لگائے یہ اتنا بامزہ تھا کہ بعض لوگوں کو اس میں اور بکری کے کباب میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا، دوسری صبح سوار ہو کر ہزارہ کے قشلاق کی طرف چلے۔

ایک گھڑی گزرنے پر ہراول کا ایک سوار خبر لایا کہ ہزارہ نے ندی (نکاب) کے گھاٹ پر تنگ جگہ میں ٹہنیاں گاڑ کر راستہ روک دیا ہے اور لڑ کر ہمارے آدمیوں کو گزرنے نہیں دیتے۔ برف اتنی گہری پڑی تھی کہ بٹیا کے سوار راستہ چلنا ممکن نہ تھا۔ ندی کے دونوں کنارے یخ بستہ ہو رہے تھے اور اسے وہیں سے عبور کیا جا سکتا تھا جہاں سے بٹیا اسے پار کرتی تھی۔ یہ سن کر میں نے تیزی سے قدم بڑھایا۔ دوسرے کنارے کی ڈھلان سے درختوں کی باڑ کے پیچھے سے ہزارہ پیادوں اور سواروں نے تیر برسائے۔ محمد علی نقیب میرا نوجوان سردار جسے لیاقت کی وجہ سے میں نے ترقی دی، باڑ پر بڑھا چلا گیا۔ زرہ پہنے ہوئے نہ تھا۔ تیر سروں پر سے سنسناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ہر بار (بہ تصحیح مترجم) یوسف بیگ گھبراتا اور چلا کر مجھ سے کہتا تھا کہ یوں برہنہ تیروں میں کہاں گھسے جاتے ہو؟ میں نے کہا خود نہ کرو، ایسے بہت تیر میرے سر پر سے گزر چکے ہیں"

"پھر قاسم بیگ نے جس کے سوار زرہ پوش تھے، دائیں طرف ندی اترنے کی جگہ تلاش کر لی اور پار ہوتے ہی حملہ کیا تو ہزارہ قائم نہ رہ سکے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمارے کچھ آدمیوں نے تیز تعاقب کیا۔ اور ان میں گھس کر کئی کو گھوڑے سے گرایا یا قتل کیا۔

اس کارنمایاں کے صلے میں قاسم بیگ کو بنگش کا علاقہ دیا گیا۔۔۔ نقیب (قوربیگی) کا منصب عقلی بابا کو عنایت ہوا جس نے بڑھ کر جنگ کی تھی۔ سلطان قلی چناق تعاقب میں گیا تھا مگر اونچی برف کی پھسلن کے باعث بٹیا پر چلنا ممکن تھا۔

میں بھی اوروں کے ساتھ چلا۔ ہزارہ کے قشلاق (سرائی پڑاؤ) کے قریب بھیڑ بکری اور گھوڑوں کے گلے ملے۔ میں نے چار پانچ سو بکریاں اور کوئی بیس گھوڑے گھیرے۔ دو تین ذاتی ملازم بھی میرے ہمراہ تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایسی تاخت میں میں نے شرکت کی۔ ہمارے لشکری صدہا جانور پکڑ لائے۔ ہزارہا عورتیں بچے برف پوش ڈھلانوں پر پیادہ اوپر چڑھے اور وہیں ٹھیر گئے۔ ہم نے پیچھا کرنے میں تساہل کیا اور دن چھپتا دیکھ کر واپس ہوئے اور انہی خالی جھونپڑیوں میں رات بسر کرنے کے لئے گھوڑوں سے اتر پڑے واقعی ہمارے چار لطف برف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔"

واپس ہوتے ہوئے لشکر والوں نے ان لوگوں کا سراغ لگالیا جنھوں نے پہلے سردار (قوربیگی) کو مارا تھا۔ یہ ایک کھو میں گھس رہے تھے۔ پتا چل گیا تو دھواں کر کے انہیں باہر نکالا اور قتل کرا دیا۔

ڈنڈے نہ ہوں تو پتھر سہی

ترکمان ہزارہ کو سخت سزا دینے کا مقصد پورا ہو گیا۔ ان پر تاخت کی کہانی پہاڑی پہاڑی ہر جگہ شائع ہوئی۔ آزاد قبائل، مغل، ترک یا افغان سب سمجھ گئے کہ شیر ڈرنے کے قابل فرماں روا ہے۔ بایں ہمہ خود بابر اتنے کثیر مواشی مل جانے کے باوجود اس تاخت سے کچھ بہت مطمئن نہ تھا۔ اس طرح حکومت کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ کسی شیبانی کے برابر بھی کامیاب نہیں ہوا۔

سردی کی طویل راتوں میں وہ اپنے اپنے ملک کے حالات روزنامچے میں لکھتا رہا۔ موسم کی تعریفیں تو بہت کی تھیں۔ لیکن یہ تحریریں پوستین کے لبادوں میں لپٹ کر ہوا سے جھملاتے تیل کے چراغ کی روشنی میں لکھی ہوتی تھیں۔ اسی تحریر کے وقت اسے غزنیں یاد آتا رہا۔ جس کی وجہ سے یہ نہ تھی کہ اسے جہانگیر کی جاگیر میں دیا تھا بلکہ وہاں کے اور حالات جیسا کہ لکھتا ہے:

''غزنیں بھی کھیتی کرنا بہت محنت کا کام ہے۔ کیونکہ بہتر سے بہتر زمین میں بھی ہر سال نئ مٹی ڈالنی پڑتی ہے۔۔ گردونواح میں ہزارہ اور افغان آباد ہیں۔ کابل کے مقابلے میں یہاں کی آمدنی کم ہے۔ لوگ صحیح العقیدہ حنفی مذہب کے ہیں اور بہت سے تین تین مہینے روزے رکھتے ہیں۔ ان کی عفیفہ عورتیں پوری پردہ نشین ہوتی ہیں۔ یہاں کے سب سے مشہور لوگوں میں ملا عبدالرحمن ہوئے ہیں جو علم و فضل کے باوصف ہمیشہ طالب العلم رہے۔'' سلاطین غزنوی کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اسی شہر میں سلطان محمود کا مقبرہ ہے جسے روضہ کہتے ہیں اور جس کے باغ کے انگور سب جگہ سے بہتر ہوتے ہیں۔ سلطان کے دوسرے جانشینوں کی بھی یہاں قبریں ہیں۔ (بیچ میں گذشتہ سال کی وادی سندھ میں اپنی تاخت اور آب ساکن کے راستے واپسی کا ذکر کرکے وہ پھر غزنیں کی شوکت رفتہ کو یاد کرتا ہے) اب یہ بہت ادنی شہر رہ گیا ہے۔ حیرت ہے کہ ہندوستان اور خراسان جیسے ملکوں پر قبضہ ہونے کے باوجود ان بادشاہوں نے اسے پائے تخت منتخب کیا۔۔۔ سلطان محمود غازی کے وقت میں (تصحیح مترجم) یہاں پانی کے تین چار بند تھے۔ سب سے بڑا جو سلطان نے بنوایا، چالیس

پچاس گز کی بلندی پر تقریباً تین سو گز عریض تھا۔ ضرورت کے لائق یہاں پانی جمع ہو جاتا تھا۔ اب ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔''

جہاں غزنیں میں آب رسانی کا انتظام درست کرنے کی فکر تھی، وہاں سلطان کے عظیم کاموں کو بھی برابر یاد کرتا تھا جو ملت اسلام کا آخری سچا مسلمان بادشاہ گزرا ہے کہ دنیا کی اس پوری اقلیم پر فرماں روائی کی۔۔۔ پھر وہ شاہ بزرگ **ملک** شاہ جس کی عمر خام جیسے فاضل ہیات داں نے ملازمت کی۔۔۔ اور سلطان سنجر، ترکوں کا بہترین فرماں روا، دین دار متقی۔ ایک طرف فارسی بولنے والوں کی بستیوں کا محافظ اور دوسری طرف وحشی خانہ بدوشوں کے ریلے روکنے والا۔ یونس خاں والئی تاشقند اور بہت سے رشتہ دار چھوٹے رئیسوں کے خاتمے سے پہلے سنجر ہی ان بزرگ سلاطین کا آخری وارث تھا۔ بعد میں تو ''ہماری دنیا پارہ پارہ ہو گئی۔ لوگ ایک دوسرے کے دشمن غارت گر ہو گئے اور مزروعہ زمینوں پر تو سبھی گدھوں کی طرح گرتے تھے۔ اس سلسلے میں بابر کا اپنا تصور یہی رہا کہ ملت اسلامی کا واحد بادشاہ ہونا چاہیے جو مساجد و مدارس اور مشتاقانِ علم کا سرپرست ہو۔ اس کا لقب اہمیت نہیں رکھتا۔ قدیم زمانے میں ایسے صاحب شخص کو بادشاہ یا شہنشاہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔

بابر قندھار جاتے میں بیمار ہو گیا تھا۔ ابھی پورا تندرست نہ ہوا تھا کہ کابل میں سخت زلزلہ آیا۔ اس آفت ارضی کو اسنے کوئی بدشگونی نہیں سمجھا بلکہ بڑی دلچسپی سے کیفیت دیکھی اور قلم بند کی ہے:

''یہ ایسا زلزلہ تھا کہ قلعوں کی بہت سے فصیلیں پہاڑوں کی چوٹیاں، شہروں اور دیہات سبھی کے بہت سے مکانات زرو سے ملے اور زمین پر آ رہے۔ مکانوں اور بیوت کے منہدم ہونے سے بہت سے لوگ دب کر مر گئے۔ پمغان (تزک فارسی: لمغان) کے سارے گھر مسمار اور ستراسی بھلے آدمی نیچے دب گئے۔ اس کے اور بک توت کے درمیان ایک قطعہ زمین، تیر کے پرتاب کے مساوی چوڑا۔ اکھڑ کر اس قدر دور جا پڑا۔ چشمے پھٹ گئے۔ جگہ جگہ کوئیں بن گئے۔ استرغج سے میدان تک ۳۰، ۴۰ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ زمین جا بہ جا ہاتھی کے برابر اونچی اور کہیں کہیں اسی قدر نیچی دھنس گئی، جگہ جگہ سے ایسی پھٹ گئی (بہ تصحیح) کہ اس میں کوئی نہ جا سکتا تھا۔ زلزلے کے وقت پہاڑ کی چوٹیوں پر گرد کا بادل چھا گیا تھا۔ نوراللہ طنبورچی میرے پاس بیٹھا ساز بجا رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں ساز تھے۔ ایسا بے قابو ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ جہانگیر مرزا لغ بیگ کے بنائے ہوئے ایک مکان میں اوپر جھروکے پر تھا زمین نے ہلنا شروع کیا تو وہ نیچے کود پڑا۔ شکر ہے چوٹ نہیں آئی۔ لیکن یہ جھروکہ بھی اسکے ایک نوکر کے اوپر گرا۔ خدا کی قدرت تھی کہ اسے بھی کوئی گزند نہ پہنچا۔ اس روز ۳۳ مرتبہ زلزلہ آیا اور آئندہ مہینہ بھر تک زمین روزانہ دو تین مرتبہ جنبش میں آتی رہی۔ میں نے امرا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ قلعہ کابل کے شگاف اور دراڑوں کی مرمت کریں۔ ان کی محنت اور ہنرمندی سے ۲۰، ۳۰ دن میں پوری مرمت اور درستی ہو گئی۔''

زلزلے اور اپنی بیماری کے باوجود اگلی بہار میں شیر نے اپنی گشت جاری رکھی حتیٰ

کہ پالکی میں ڈال کر لایا گیا اور بحالیٔ صحت کی غرض سے کابل آ کر اپنے نئے چار باغ میں مقیم ہوا۔ یہاں دنبل پر چیرا لگا اور مسہل دیئے گئے۔اسی میں بعض بری خبریں آئیں۔ دریائے سندھ کی تاخت سے واپسی میں اسے بتایا گیا تھا کہ ناصر میرزا اس کا ساتھ چھوڑ کر چل دیا۔یہ شہزادہ اپنی جمعیت لے کر دروں کے پار شمال کو گیا اور حیلہ یہ کیا کہ ازبکوں سے لڑنے جاتا ہوں۔کوچ کرتا ہوا حصار بدخشاں تک چلا گیا۔اب اسی طور سے جہانگیر میرزا نے ہزارہ قبائل کے علاقے سے مغرب کی راہ لی۔بعض دوست دار قبائل کو ملایا جو ازبکوں کی طرح تاخت تاراج کر رہے تھے اور ہرات کی جانب چل دیا۔اتنی بات بابر کو پہلے معلوم ہوئی تھی کہ اس کے دو درباری اسے بابر کے خلاف ورغلاتے تھے۔وہ آسانی سے لوگوں کے کہے میں آ جاتا تھا۔بابر نے قاسم بیگ کو غزنیں بھیجا کہ جہانگیر کو مدد دے اور وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر نظر رکھے۔اس نے واپس آ کر چار باغ میں خبر دی کہ بہکانے والوں کی سرگوشیوں کا م جھ سے انسداد نہ ہو سکا۔وہ لوگ ذرا ذرا سے بات کو کچھ سے کچھ بنا کر جہانگیر کو آشفتہ کر دیتے ہیں۔مثلاً شہزادے نے بٹیر پر باز چھوڑا۔وہ زمین پر گری اور باز اور اسے جھپٹا۔لوگ پکارے پکڑ لیا یا رہ گیا؟ قاسم بیگ کے منہ سے نکلا ''پنجہ مار چکا ہے اب گرفت سے جانے دے گا۔'' جہانگیر سن کے پریشان ہوا اور ندیموں نے یقین دلایا کہ شکار، آپ ہیں جسے قاسم گرفت سے جانے نہ دے گا۔

بابر کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ اسی خلجان کے زمانے میں فوری توجہ کے قابل دوسری خبریں ملیں۔یعنی ازبکوں کا سایہ پھر ان ملکوں پر اس طرح پڑتا نظر آیا جیسے

دانہ چگتی بٹیروں کے جھلڑ پر شکرا دور سے گرتا دکھائی دیتا ہے۔ شیبانی خاں سال بھر تک بعید شمال میں اس شہر کا محاصرہ کیے رہا جس نے امیر تیمور کے زمانے سے اب تک بڑے بڑے حملوں کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ قدیم حصار آمو کے دہانے پر جہاں وہ بری سمندر، بحیرہ ارال میں گرتا ہے، ریگستان اور مزروعہ اقطاع، یعنی صحرائی غارت گروں اور جنوبی وادی کے زراعت پیشہ لوگوں کے درمیان واقع تھا۔ دور دور کے سوداگر یہاں آتے اور بڑے بڑے اہل علم یہاں ٹھکانا بناتے تھے۔ ترک اسے ارگنج کہتے تھے، عربوں میں خوارزم معروف تھا۔ یہ نامی شہر دغا کے ذریعے شیبانی خاں کے ہاتھ آ گیا۔ ادھر سے فراغت پا کر ازبک سمرقند کو پلٹے جیسے بھیڑیا اپنے بھٹ میں واپس آتا ہے اور اب خوارزم، اندجان، سمرقند قندز کی فتوحات کے بل پر، آل تیمور کے آخری نشان عظمت، ہرات پر فوج کشی کی تیاریاں کیں۔ وہاں سے معمر بادشاہ سلطان حسین میرزا نے اپنے بیٹوں کو ہرات طلب کیا اور اسی پرچم کے نیچے آنے کی عمر شیخ میرزا کے بیٹے بابر کو دعوت دی جسے تین مرتبہ مدد دینے سے انکار کر چکا تھا۔ ”خواب بین“ (سلطان علی) کے بیٹے سید افضل نے چار باغ میں یہ پیام آ کر دیا۔

بابر نے اس طلبی پر سوچ بچار تو کی، لیکن وہ شروع سے جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ لکھتا ہے کہ ”ہمیں کئی لحاظ سے جانا واجب تھا۔ ایک بڑا بادشاہ جو تیمور کا جانشین ہے اپنی اولاد اور امرا کو طلب کرے تو شیبانی جیسے دشمن کے خلاف میرا جانا ضروری تھا۔ دوسرے پاؤں پاؤں جائیں تو مجھے سر کے بل جانا چاہیے۔ دوسروں کے ہاتھ میں

ڈنڈے ہوں تو میں پتھر ہی لے کے جاؤں۔ پھر جہانگیر میرزا بگڑ کر گیا تھا، لازم ہوا کہ یا تو اسے منایا جائے اور یا اس کی دشمنی کا تدارک کیا جائے۔“

بایں ہمہ اس یادگار سال (۱۵۰۶ء) کے موسم بہار میں بابر کو جانچ تول کر ہی قدم اٹھانا تھا۔ اسے اپنے سازشی وزیر باقی بیگ سے تھوڑے دن پہلے نجات ملی اور جہانگیر میرزا کا دفع ہو جانا بھی غنیمت معلوم ہوا ہوگا۔ اسکی نئی بے تمیز رعایا میں فی الجملہ نظم و انضباط پیدا ہوگیا تھا اور تھوڑی بہت اجناس خوردنی مل گئی تھیں۔ قزاق مزاج قبائل کچھ عرصے کے لئے تو ضرور قابو میں آ گئے تھے مگر دوسری طرف، ان دروں کے پار، جو سارے جاڑے مسدود رہتے تھے، پانچ سو میل دور ہرات جانا اور فوج کو ساتھ لے جانا، خطرے سے خالی نہ تھا۔ خصوصاجب کہ بازووں پر ازبک لگے ہوئے تھے اور صرف یہی میدانی فوج تھی جس پر بابر اعتماد کر سکتا تھا۔ (یہ بھی ظاہر ہے کہ ان خطروں کا سارا بوجھ بابر کو اٹھانا تھا) لیکن جہانگیر سے وہ دست بردار نہ ہو سکتا تھا۔ بوڑھے چچا کی استمداد کی درخواست کو رد نہ کر سکتا تھا اور نہ آوازہ جنگ سننے کے بعد اس سے میدان میں نکلے بغیر رہ جاتا تھا۔ اسے آرزو تھی کہ اپنے دشمن ازبک سے پھر رد رد مقابلہ کرے۔ چنانچہ کابل و غزنین کو بعض سن رسیدہ، سرداروں کی نگرانی میں دے کر وہ خوشی خوشی اور دراصل سخت مصیبت جھیلنے، مغرب کی طرف چل پڑا۔

سفر خراسان

بابر نے جنوب کا کاروانی راستہ قندھار ہو کے اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے بھائی کے پیچھے پیچھے سیدھا مغرب کا رخ کیا۔ شہر کے ۱۰ ہزار فیٹ طولانی دروے سے نکل کر کوتل وندان شکن اور بدمزاج ہزارہ قوم کے علاقے کی طرف گھوم گیا کچھ ازبک جو قریب ہیں آ گئے تھے۔ انہیں قاسم بیگ نے مار کے دھکیل دیا حسب معمول وہ چیدہ فوج اور تھوڑے سامان کے ساتھ تیز رفتاری سے راستے کے پہاڑی قبائل کو مرعوب کرتا ہوا جا رہا تھا۔ جہانگیر میرزا نے ایماقوں سے سپاہی بھرتی کرنے چاہے تھے اور بامیان کی پہاڑی پر بابر نے اسے جا لیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے پیچھے آنے والوں کو پلٹ کر آیا تھا۔ بابر کا علم اور راتالا بچان کرالٹے پاؤں پھرا اور اپنی لشکر گاہ کے خیمے تک چھوڑ کر چند رفیقوں سمیت جانب مغرب پہاڑیوں میں گھس گیا۔

بابر لکھتا ہے کہ ان دنوں ملک بھر میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ ہر شخص دوسرے سے جو کچھ زبردستی لے سکتا، لوٹ لیتا تھا۔ میرے آدمیوں نے بھی زمین داروں اور خانہ بدوش ٹولیوں میں اسی طرح کی لوٹم مار کی۔

شمال مغرب میں تین دن کی مسافت پر آمو کے پار شیبانی خاں سرحدی شہر بلخ کا (باختر کی حسین وادی کے وسط میں) محاصرہ کر رہا تھا۔ بابر بڑھے چلا گیا۔ رات کی فرصت میں سلطان حسین میرزا کی زندگی کے واقعات لکھتا رہا۔ پھر ہرات سے اس کی مرنے کی خبر آئی تو ان یادداشتوں پر نظر ثانی کر کے دوبارہ مرتب کیا۔ آل تیمور کے آخری فرماں روا کا یہ ایک یادگار مرگ نامہ (دفیہ) ہے۔

سلطان حسین میرزا بایقرا ۸۴۲ ہجری (۱۴۳۸ء) میں بمقام ہری (ہرات) پیدا ہوا۔ اس کی ماں دلشاد بیگم (۴۴) بھی امیر تیمور کی پوتی (پروتی) تھی اس طرح وہ نجیب الطرفین، خاندانی بادشاہ تھا۔ اس کی آنکھیں کھچی ہوئی جسم کی ساخت شیر جیسی یعنی سینہ چوڑا، کمر پتلی تھی۔ بڑھاپے میں جب کہ سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ سرخ وسبز ریشم کا رنگین لباس پہنتا تھا۔ سر پر عموماً پوست برہ کی ٹوپی یا چوڑی باڑ کی کلپاک ہوتی لیکن عیدین کے دن تین پیچ دیکر دستار باندھ لیتا اور اسمیں سرخاب کے پر کی کلغی لگا کر نماز کو جاتا تھا۔ ہرات کی بادشاہی اسے ملی تو شروع میں سوجھی کہ اپنے نام کی بجائے دوازدہ امام کے ناموں کا خطبہ پڑھوائے۔ لیکن میر علی شیر اور بعض دیگر اشخاص نے اس ارادے سے باز رکھا اور پھر سب ضروری کام وہ اہل سنت والجماعت کے طریق پر کرانے لگا۔ وجع المفاصل کی وجہ سے نماز میں رکوع نہ کر سکتا تھا۔ باتونی، خوش طبع، زود حس آدمی تھا اور اسی مزاج کے مطابق گفتگو تھی۔ شریعت کا نہایت پابند تھا اور ایک مرتبہ اس کے بیٹے نے کسی کو مار ڈالا تو اس نے بیٹے کو مقتول کے ورثا کے حوالے کر کے قاضی کی عدالت میں بھیج دیا۔ تخت نشینی کے ۶ سال تک شراب سے تجنب رہا، لیکن پھر اس عادت بد میں مبتلا ہو گیا۔ مگر ظہر سے پہلے نہ پیتا تھا، لیکن ظہر کے بعد روزانہ پینے لگا۔ اور اسی طرح اس کے بیٹوں اور فوج والوں نے پینی شروع کی اور عیاشی اور بدکاری کرنے لگے۔

حسین میرزا جری اور بہادر آدمی تھا، بارہا دو تلوار لے کے میدان جنگ میں لڑا اور شمشیر زنی میں کوئی تیموری شہزادہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا۔ اسے شعر گوئی کا بھی

شوق تھا اور اپنے تخلص حسینی سے دیوان مرتب کیا تھا۔ اس کے اکثر اشعار کچھ برے نہیں ہیں لیکن پورا دیوان ایک ہی بحر میں لکھا ہے اتنے بڑے **ملک** کا فرماں روا ہونے کے باوجود ادنیٰ آدمیوں کی طرح لڑائی کے مینڈھے پالتا، کبوتر اڑاتا مرغ لڑایا کرتا تھا۔ اپنی چپاولی جنگ کے زمانے میں رودگرگاں (مجرخز کے قریب ایک ندی) کو تیر کے پار ہوا اور ایک ازبک ٹکڑی کو اچھی مار لگائی۔ سلطان (بہ تصحیح) ابو سعید میرزا نے تین ہزار سپاہی اس پر شبخون مارنے کے لئے بھیجے تھے وہ صرف ساٹھ جوانوں سے ان پر جا پڑا اور انکی خوب خبر لی۔ یہ اس کا سب سے نمایاں جنگی کارنامہ تھا۔ اسکی حکومت خراسان میں تھی جس کے مشرق میں بلخ، مغرب میں (بہ تصحیح مترجم) بسطام و دامغان، شمال میں خوارزم، جنوب میں قندھار و سیستان ہیں۔ ہرات جیسا شہر اس کے ہاتھ آ گیا تو پھر دن رات عیش و عشرت کے سوا اسے کوئی کام نہ رہا۔ اسی طرح اس کے ملازمین لہو و لعب اور خرافات میں مشغول ہو گئے۔ یہی سبب ہوا کہ اس نے جنگ آرائی کی مشقت اور فوج کشی کی زحمت اٹھانی چھوڑ دی اور نتیجتہ، اس کی مملکت اور فوجی جمعیت میں برابر کمی ہوتی گئی، کوئی اضافہ نہ ہوا۔"

یہ سطور لکھتے وقت بابر کو ضرور یہ تلخ بات یاد آئی ہوگی کہ اس کے چچا نے وادی آمو میں بابر سے اس وقت بھی تعاون نہیں کیا جب کہ حکومت خراسان میں کوئی کمزوری نہیں آئی تھی۔ مگر حسین میرزا کی خامیاں گنوانے کے ساتھ وہ اس کے بہادرانہ کارناموں کی جو خود بابر کے کاموں سے مشابہ تھے، ستائش میں کمی نہیں کرتا۔ اور میرزا کے تذکرے کو اس کی جملہ آل اولاد، بارہ لڑکیوں کے حالات سے جو زندہ تھیں، پھر

اس کے عمائد دربار اور اہل علم وفن کے ذکر سے طول دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک جگہ اس کی بدمزاج بیوی (بیگم سلطان) کی نسبت اپنی رائے بھی شامل کردی ہے:

اس کی پہلی بیوی ۔۔۔ بدیع الزمان کی ماں تھی (بدیع الزمان سب سے بڑا بیٹا تھا اگرچہ سب سے چاہتا مظفر تھا) وہ مزاج کی ایسی خراب تھی کہ حسین میرزا کو نہایت آزار دیتی رہتی تھی ۔ یہاں تک کہ تنگ آ کر اسے طلاق دی اور چھٹکارا حاصل کیا۔ اس کے سوا چارہ کیا تھا۔ میرزا حق پر تھا۔ بقول سعدی

''زن بد درسرائے مرد نکو
ہم دریں عالم است دوزخ او''

معلوم نہیں یہ کلمات لکھتے وقت بابر کو عائشہ یا اپنی کوئی اور بیوی یاد آئی؟ عورت کے متعلق یہ ترش ترین الفاظ ہیں جو اس کے قلم سے نکلے۔ اس کے ساتھ تو سوائے ایک کے اور کسی عورت نے بے وفائی نہیں کی ۔ یہ بھی واضح رہے کہ حسین میرزا کا یہ حیات نامہ آل تیمور پر بابر کی الوداعی تحریر ہے۔ ان شہزادوں کی نسبت جو دیں دار، خونی شرابی فنون لطیفہ کے دل دادہ منصب شاہی کے آرزومند اور ایک دوسرے کو فنا کرنے کے درپے تھے، یہ اسکی آخری تحریر تھی ۔ بابر پہاڑوں کے حصار سے پیچ در دریا کی وادی میں ادھر جا رہا تھا۔ جہاں اسے چچا سے مل جانا تھا اسے دیر ہو گئی اور ذی الحجہ (مئی) کے مہینے میں سلطان حسین میرزا شیبانی خاں سے مقابلے کے لئے فوج لے کر باب آہنی کے مقام تک آیا تھا کہ عالم بقا کی طرف رخصت ہوا۔ پھر بھی بابر نے ہرات کا سفر جاری رکھا۔

باب چہارم:: شراب دل

شیر کی مہمانی ہوتی ہے

۱۵۰۶ء کی خزاں کے اواخر میں بابر ہرات کے لشکروں کے مقام تک پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سارا میدان زربفت کا تھان معلوم ہوتا تھا۔ دریائے مرغاب کے کناروں پر ایک سے ایک قیمتی خیموں کا سلسلہ چلا جاتا تھا۔ انکی گہما گہمی دیکھ کر جشن کا گمان ہوتا تھا۔ جس طرح انگلستان کے ایک نوجوان بادشاہ پر ایک اور تاریخی میدان میں گزری تھی، بابر اپنے چار طرف یہ شان وشوکت دیکھ کر جو خود اسکے ادنیٰ سازو سامان پر طعنہ زن تھی۔ دنگ رہ گیا۔ وہ سالہا سال مشقت انگیز میدانی معرکے جھیل کر آ رہا تھا لہذا عظیم شامیانوں کے نیچے عیش وطرب کے درباروں میں داخل ہونا اور بھی عجیب معلوم ہوتا تھا اور اس کا پہلا تاثر یہ ہوا کہ یہاں سخت پریشان ہنگامہ گرم ہے۔

اس نے دور دراز مقامات، مقدس مشہد اور قدیم مرو کے امرا کے پرچم لہراتے دیکھے۔ وحشی ترکمان سرداروں کے سیاہ لبادے مشاہدہ کئے اور اپنے بھائی جہانگیر میرزا کو بھی دیکھا کہ خوف زدہ سا دبکا بیٹھا ہے۔ نوکروں کا ہجوم تھا۔ نقیب بابر کی آمد کی نودے پکارتے پھرتے تھے۔ ملاقات کے آداب طے کئے جا رہے تھے کہ مرحوم حسین میرزا کے فرزند اکبر کے سامنے وہ کہاں تک بڑھے گا اور کس جگہ آداب بجا

لائے گا۔اس کے گرد مجمع اتنا ہو گیا تھا کہ بعض درباریوں کے پاؤں کئی قدم تک اوپر ہی اٹھتے رہے اور بعض جو باہر جانا چاہتے تھے بالا ہی بالا اندر لے آئے گئے (بابر کی نظر اس تلاطم میں بھی ایک ایک بات دیکھ رہی تھی) شاہی قالینوں پر چل کر وہ بارگاہ کے اندر آیا جس میں پردے کھینچ کر کئی گوشے امرا کے لئے تیار کئے گئے تھے اور حسب مراتب ان کے لئے الگ الگ دستر خوان پر شربت، برف، فواکہ چنے تھے۔ بابر قاسم بیگ کی معیت میں اس جگہ جسے وہ شاہی دیوان خانہ کہتا ہے۔صدر کی طرف بڑھا جہاں مرحوم بادشاہ کے فرزند اس کے منتظر تھے:۔

یہ بات طے ہو گئی تھی کہ پہلے جھکوں گا اور پھر بڑا شہزادہ تعظیما مسند کے کنارے تک بڑھے گا۔ میں نے آداب کیا اور بے توقف آگے چلا مگر اس شہزادے (بدیع الزمان ''مترجم'') نے اٹھنے میں ذرا دیر لگائی۔قاسم بیگ دیکھ رہا تھا۔میری توقیر میں ہی اس کی عزت تھی۔اس نے میرا پٹکا کھینچا۔میں سمجھ گیا اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تا کہ ٹھیک جگہ پر ہی ملاقات ہو۔۔۔ ہر چند یہ کوئی جلسہ نہ تھا مگر ملازمین طرح طرح کے کباب اور مشروبات سونے چاندی کے پیالوں میں لائے۔

ہمارے بزرگ چنگیز خانی آداب و عادات کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ان کے درباروں، ضیافتوں اور نشت و برخاست کے طریقوں میں کوئی بات ان پرانے آدب کے خلاف نہ کی جاتی تھیں۔یہ قاعدے کوئی قرآن حدیث کے احکام نہ تھے کہ جسکی پابندی فرض ہو۔تاہم جن لوگوں کو ورثے میں ملے انہیں برتنے میں کچھ برائی نہیں۔ بلکہ ہر شخص کو ایسے ضابطوں کو اختیار کرنا چاہیے۔البتہ باپ دادا کی کوئی

رسم بری ہو تو اولادپر لازم ہے کہ اسے بدل دے۔''

چنگیز خاں اعظم کے قواعد پر بابر کی اپنے دل سے یہ باتیں اس کے ذہنی خلجان کی عجیب طرح غمازی کرتی ہیں۔ چنگیزی قوانین پر خود اس نے کبھی عمل نہیں کیا۔ بلکہ لڑکپن سے قانون شریعت ہی کا پابند رہا اپنے مرحوم ماموؤں کے ہاں خاص مغلی طرز کا فوجی مظاہرہ اور قدیم رسوم دیکھ کر وہ منغض ہو گیا تھا۔ لیکن اب اپنے عم زادہ شہزادوں کی پرتکلف صحبت میں بھی بیگانگی سی محسوس کرنے لگا۔ صحرائی پڑاوں میں نیم فاقہ کشی کی زندگی، مغل خانہ بدوشوں کا اصلی ورثہ تھا جو اسے ملا۔ علی ہذا شکار اور میدان جنگ میں وہ مغول ہی کے سخت آئین کو ذہن میں رکھتا تھا۔ ہرات کے شہزادوں کو ظاہر ہے کہ یہ چیزیں یاد نہ تھیں۔

دوسری ملاقات میں بڑے بھائی بدیع الزماں نے تعظیم کرنے میں کچھ کمی کی تو بابر نے فوراً ناگواری ظاہر کی۔ سن رسیدہ حسین میرزا کی وفات کے بعد وہ اپنے خیال میں باقی ماندہ تمام تیموریوں کی سرداری کا حق دار ہو گیا تھا۔ اس نے بلا تاخیر اپنے دو امیروں کو میزبان کے پاس بھیج کر یہ پیام دیا: بابر اگرچہ عمر میں چھوٹا ہے (وہ اس وقت ۲۳ سال کا تھا) لیکن سمرقند کے لئے دو دفعہ لڑا اور اپنے بزرگوں کا تخت واپس لے چکا ہے۔ خاندان کی خاطر بیرونی دشمن سے اس کی معرکہ آرائیاں موجب اعزاز و امتیاز ہوئی ہیں۔ چنانچہ پھر بدیع الزمان خاطر تواضع سے پیش آیا اور دھوم دھام سے اسکی عورت کی صورت میں اس کا اظہار کیا۔ بابر اعتراف کرتا ہے کہ یہ مجلس فی الواقع نہایت آراستہ اور پرتکلف تھی۔ نماز ظہر کے بعد سے شروع ہوئی۔ میں ان

دنوں شراب نہیں پیتا تھا۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوا تو انہوں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ شراب کے ساتھ ہر قسم کی گزک، مرغ اور قاز کے کباب خوانوں میں لگائے گئے۔

ایک بار میرزا مظفر حسین کی محفل شراب میں دریائے مرغاب کے کنارے جانا ہوا۔ حسین علی جلائر اور میر بدر بھی وہاں موجود تھے۔ بدر نے چھک کر پی تو پھر خوب ناچا۔ یہ ناچ اسی کی ایجاد تھا۔

شیر کو یہ راگ رنگ کے جلسے پسند آئے۔ اپنی عمر میں ایسے ماہرانہ رقص نہ دیکھے تھے نہ موسیقی کی یہ الحان سنی تھی۔ شراب کے دور میں اسکے ہیجان انگیز خواص پر غور کرنے لگا۔ کھانے میں قاز کو کاٹنے میں اس سے غلطی ہوئی تو بدیع الزمان نے ازراہ تواضع چھری لے کر سب دستی سے خود قاشیں تراش دیں۔

ان لطف اندوزیوں کے باوجود بابر شکوک سے خالی نہ تھا۔ ملک خراسان کے یہ والی تین مہینے سے مجتمع ہو رہے تھے۔ مگر ایک دوسرے کی ضیافتوں کے سوائے کوئی کام ان سے بن نہ آیا تھا۔ بدیع الزمان اور مظفر دونوں کی صحبت خوشگوار اور وہ عورتیں کھلانی خوب جانتے تھے لیکن جنگ کی تیاری بالکل نہیں کی۔ حقیقت میں وہ تدابیر حرب سے ناواقف اور جنگ یا مصائب سے ناآشنا تھے۔ وہ جلسے اور ضیافتیں ہی کرتے رہے، وہاں شیبانی خان کے سامنے بلخ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ازبک سواروں کی تاختیں مرغاب کی نواح میں میرزاؤں کے لشکر گاہ سے چالیس میل فاصلے پر ہونے لگیں۔ ان صاحبوں سے اتنا بھی انتظام نہ ہو سکا کہ ایک رسالہ بھیج کر ان غارتگروں کو بھگا دیتے۔ بابر نے اس کام کی اجازت چاہی تھی مگر میزبان

میرزاؤں نے غالباً اس خوف سے انکار کر دیا کہ بابر کی جنگی شہرت میں اضافہ ہوگا۔

(۴۵)

شیبانی کو ہرات کے لشکروں کا پورا علم تھا۔ ادھر جاڑا سر پر آ گیا۔ لہذا وہ چپ چاپ اپنے مضبوط حصار سمرقند میں چلا آیا۔ اس دانش مند فاتح نے کاپوا (یورپ) کے جاڑے کی سرگزشت تو کبھی نہ سنی ہوگی لیکن اس کی عین خوشی تھی کہ برفانی طوفانوں کا موسم ان اتحادی لشکروں کو پراگندہ کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس بھیج دے۔ باہمی مشاورۃ سے میرزاؤں نے یہی فیصلہ بھی کیا۔ انہوں نے بابر سے بھی اپنے لشکر سمیت ہرات چلنے اور کچھ روز وہاں ٹھیرنے پر اصرار کیا۔

بابر نے حسب معمول دل میں مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ اگر برف نے درے نہ روک دیئے ہوں اور کوئی بغاوت بھی سد راہ نہ ہو تو بھی کابل ایک مہینے سے پہلے نہ پہنچ سکتے تھے۔ دوسری طرف اندیشہ تھا کہ وہاں اس کے رشتہ داروں نے کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دیا ہو اور بیرونی اضلاع میں اسے نئی رعایا، ترک، مغل، افغان، ہزارہ نیز سرحد کے جرائم پیشہ وحشی قبائل کے فسادات کا خطرہ تھا۔ نظر بر ایں میں نے میرزاؤں سے معذرت کی مگر انہوں نے کوئی عذر نہ سنا۔ گھوڑوں پر سوار میرے خیموں میں آئے اور مصر ہوئے کہ سردیاں یہیں گزاروں۔۔۔شاہی رتبے کے لوگ بذات خود ٹھیرنے کی درخواست کریں تو پھر انکار کرنا محال ہو گیا۔ دوسرے شہر ہرات کو جس نے سلطان حسین میرزا کے زمانے میں وہ ترقی کی کہ آباد دنیا میں بے نظیر ہو گیا۔ اسے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔''

ارباب علم وفضل

اگرنکولوکمیاولی ہرات آتا، جہاں ل اس کے کسی ہم عصر فرنگی کے قدم نہیں پہنچے،تو وہ یہ اجتماع ضدین دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ عین سیاسی زوال کے زمانے میں وہاں علم وفن کا عروج ہو رہا ہے حقیقت میں ہری رود کے کنارے کا یہ شہر ایشیا کا فلورنس تھا۔ معلومات کے جویا بابر نے بیس دن یہاں پھر کر اپنی پیاس بجھائی۔

ہرات اور دوسرے شہروں میں ایک فرق تھا کہ تیموری محاربات کے بعد یہ از سر نو تعمیر ہوا اور سو برس تک یہاں (اگر چہ مخدوش) امن امان قائم رہا اور اسی لئے حسین میرزا بایقرا کے عہد میں پندرہویں صدی عیسوی کی، "نہضت تیموریہ" کا یہی شہر مرکز بن گیا۔اس کے جنگی استحکامات سے بڑھ کر ادبیات نے شہرت پائی۔قریب ہی ایک پارسی آتش کدے اور ایک نسطوری کلیسا کے آثار تھے۔ بارونق منڈی کے سرے پر بڑی مسجد جامع بلند تھی۔شاہی محل شہر کے باہر لہلہاتے باغوں،تاکستانوں رہٹ کے کنوؤں کے سلسلے میں ایک ٹیکرے کے اوپر بنا ہوا تھا۔ باہر کے ذہن میں نئے نئے مقبرے بھی بڑے بڑے علما اور ذی شان مشاہیر کی یادگار تھے۔اس حرکت اور توانائی کے دور میں علم صرف کتابی معلومات حاصل کر لینے کا نام نہ تھا بلکہ معبود حقیقی سے تعلق کی معرفت اور حقیقت کی تلاش کو علم کہتے ہیں۔

صوفی درویشوں کے مرشد کبیر مولانا رومیؒ نے ایک عاشق صادق اور (بہ تصحیح مترجم)موسیٰ کے قصے میں اللہ تعالیٰ کا قول تحریر کیا ہے کہ میں ظاہری الفاظ اور قال کو نہیں دیکھتا۔ دل کی سچی تڑپ چاہتا ہوں۔ دوسری جگہ سالک روحانی وارفتگی

میں پکارتا ہے کہ میں جماد کی صورت میں تھا۔ مرکز نبات ہوا۔ نبات سے حیوان اور پھر انسان بنا۔ جب مروں گا تو آئندہ ملکوتی زندگی پاؤنگا اور ملکوتی کے آگے وہ مرتبہ پا جاؤں گا جسے کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی یعنی فنا، فنا فی اللہ۔"(۴۶)

اس تصوف میں مسیحی عقاید کا سراغ ملتا ہے۔ عمر شیخ میرزا حضرت رومی کے اشعار پڑھ کر جھومتا تھا مگر سمجھتا نہیں تھا۔ خود بابر جامیؒ کا گرویدہ رہا جنھوں نے سنی عقائد تصوف کی زبان میں بیان کئے ہیں۔ ان کا بابر کے دور سے پانچ ہی سال پہلے ہرات میں انتقال ہوا تھا۔ وہ اپنی نوبت پر قطب الاقطاب خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے کسب فیض کرتے ہیں جو بابر کے بھی روحانی مرشد تھے۔ اپنی تلاش و جستجو میں جامیؒ نے "ہفت اورنگ" اور مثنوی "یوسف زلیخا" کی تمثیلات اور افسانے کے پیرائے میں اپنے افکار بیان کئے ہیں۔ بابر انہیں تعریف سے مستغنی بتا کر محض تبرکاً ان کا نام نامی اپنی کتاب میں لایا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہرات کے مصور پرانی روایات سے جو اسلامی ملکوں میں ہمیشہ بہت قومی رہیں۔ آزاد ہو گئے تھے۔ وہاں کے نقاشوں نے اس حد تک جسارت کی کہ عالم آخرت کی تصویر میں فرشتوں کی صورتیں بنائیں جو کنارے کی نیلگوں فضا میں آتشیں دکھائی گئی ہیں۔ حالانکہ چہروں کی تصویر راسخ العقیدہ مسلمانوں میں مدت وراز س ممنوع تھی۔ انہی میں بہزاد تھا جسے زمانہ کی تصویر میں اول درجے کا مصور مانا گیا ہے وہ تاثری تصاویر میں مرقع نگاری کی طرح باریکی سے نقاشی کرتا ہے۔ پس منظر کی زمین ہمیشہ خاص معیار کی ہوتی ہے جس میں قدرتی اشکال ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس نے گھوڑوں کی حیرت انگیز تصویریں بنائی ہیں اوران کے رنگ ،قرمزی، سیاہ، سفید تک پس منظر کے عین مناسب دیے گئے ہیں، ممکن ہے بہزاد کی استادی میں یو آن اور منگ خاندانوں کے چینی فن سے استفادے کا دخل ہو۔ اکثر اوقات یہ نقاشیاں صرف کسی کتاب کی آرائش کے لئے کی جاتی تھیں۔ کیونکہ ہرات کے نگار خانوں میں جومجلدات تیار ہوئے ان میں نقاشی ،تذہیب اورخطاطی تینوں فنون کے با کمال اساتذہ کا ہاتھ ہوتا تھا۔ایک ایک کتاب کی تیاری میں اکثر کئی سال لگ جاتے تھے۔خصوصا کلام اللہ کوجمیل ترین شکل میں پیش کرنے کے لئے قرآن مجید کا ہرنسخہ بڑی محنت اورعرق ریزی سے تیار کیا جاتا تھا۔پھرتاریخ کی کتابیں تھیں، جواسلامی جوش کے ساتھ لکھی گئی ہیں جیسے علی یزدی کا ''ظفرنامہ'' امیر تیمورمیر خواند کی ''روضتہ الصفا'' جس کا تکملہ اس کے پوتے خواندمیر نے لکھا اوروہ ان دنوں حیات تھے۔مزید برآں موسیقی میں نئی نئی الحال (نقوش) نکالی جاتی تھیں۔فن تعمیر کے استاد نئے نئے اسالیب سوچتے۔کوزہ گرعجیب عجیب صناعیاں کررہے تھے۔

یورپ میں لفظ ہسٹری (تاریخ) ابھی تک پوری طرح رائج بھی نہیں ہوا تھا جب کہ خراسان میں عالمی افکار کے لوگ اس موضوع پر کام کررہے تھے۔خودفرماں روا، سلطان حسین میرزا ہرقسم کے علم وفن کا ذوق رکھتا تھا۔اگرچہ بابر یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی تصنیفات میں کچھ کمی رہ جاتی تھی۔وہ بطورخاص حسین میرزا کے شہرآفاق وزیرعلی شیر نوائی کے نوتعمیر مقبرے پر حاضر ہوا اور فاتحہ پڑھی۔میر علی شیر تصنیف و تالیف میں زندگی بسر کرنی چاہتا تھا۔مجبوراوزارت پرآمادہ ہوا تو بھی نقاشی ،ترتیب

وقائع اور خصوصیت سے مذہبی رنگ کی شاعری کے لئے وقت نکال کر وزارت میں تضیع اوقات کی تلافی کر لیتا تھا۔ اس نے بیش تر اپنی ملکی زبان ترکی میں، نوامی تخلص سے شعر کہے اور اسے فارسی پر ترجیح دی۔ یہ رہنمایانہ اقدام وہی امتیاز رکھتا ہے جیسا یورپ کے احیائے علوم کے ابتدائی دور میں لاطینی کی بجائے عام لومبارڈی زبان میں تصنیف کرنے کو حاصل ہوا۔ بابر کو اس بات سے بہت ہی قوی دلچسپی تھی کیونکہ وہ خود بھی اپنی کتاب، چغتائی ترکی میں لکھ رہا تھا۔ اگرچہ شعر گوئی کے لئے ترکی اور فارسی دونوں سے کام لیتا تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ واقع میں علی شیر بے نظیر شخص تھا وہ سلطان حسین میرزا کا وزیر اتنا نہ تھا جتنا اس کا مصاحب و ہم نشین تھا۔ ترکی زبان میں اتنا کچھ اور ایسا اچھا کسی نے نہیں لکھا جتنا اس نے تصنیف کیا۔ فارسی میں پورا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اس میں بعض اشعار برے نہیں ہیں۔ اگرچہ اکثر ادنیٰ درجے کے ہیں۔ مولانا جامیؒ کی طرز پر ایک انشا کی کتاب بھی لکھی ہے۔ جس میں کچھ خطوط اوروں کے جمع کئے اور کچھ خود لکھے ہیں تا کہ ہر قسم کے پڑھنے والوں کو اپنی ضرورت کے مطابق خط کا نمونہ مل جائے۔ اس نے آزادرہ کر مجرد زندگی بسر کی۔ بیوی بچے آل اولاد کچھ نہ تھی" (شاید رہبانیت پسند تھا) ہرات کی گردشیں لگانے میں بابر کو ایک لطیفہ بہت پسند آیا۔ جس میں علی شیر پر چوٹ تھی۔ ہرات کے ایک معمولی شاعر (ملا) بنائی کو علی شیر طعنے دیا کرتا تھا کہ وہ موسیقی نہیں جانتا۔ ایک مرتبہ یہ امیر ہرات سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس فرصت میں بنائی نے موسیقی کے رموز سیکھے بلکہ خود نئی لحنیں (نقش) بھی نکالیں۔ علی شیر واپس آیا تو بنائی نے خود اپنا تیار کیا ہوا گیت اس خوبی

سے سنایا کہ وہ دنگ رہ گیا۔ پھر بھی ان میں چھیڑ چھاڑ چلتی رہی۔ ایک روز شطرنج کھیلتے میں علی شیر نے ٹانگ پھیلائی تو وہ بنائی کے کولہے کو چھوگئی۔ (حسب معمول یہ لوگ قالین پر چار زانو بیٹھے تھے) علی شیر نے از راہ تمسخر کہا ''ہرات میں بڑی آفت یہ ہ کہ ٹانگ بھی پھیلاؤ تو کسی شاعر کی کون میں جا لگے گی۔ بنائی نے کہا اور پیچھے کھینچو تو بھی اس مقام پر پہنچے گی۔''

''زبان طعن کی تیزی کی بدولت کو ہرات سے نکلنا پڑا۔ ان دنوں علی شیر نے بہت سی نئی چیزیں ایجاد کی تھیں اور دوسروں کی ایجاد کی سرپرستی کرتا تھا۔ پھر بہت لوگوں نے از خود کوئی نئی بات یا وضع نکالی تو شہرت کے لئے اسے ''علی شیری'' کہنے لگتے تھے۔ اسکی بے سوچے سمجھے تقلید کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ کان میں درد ہونے کے باعث اس نے سر کے گرد رومال لپیٹ لیا تھا۔ لوگوں نے خواہی نخواہی اسی طرح رومال لپیٹنا شروع کر دیا اور اسے تازہ ترین ''علی شیری'' طرز مشہور کر دیا۔ بنائی جب ہرات سے جانے لگا تو ایک خاص وضع کا پالان سواری کے گدھے کے لئے بنوایا اور (اس پر سوار ہو کر) کہا سب سے نیا ''علی شیری'' یہ ہے! چنانچہ ''علی شیری پالان'' ہر جگہ مروج ہو گیا۔''

صبح کے اوقات میں بابر ہرات کی عمارات کی اچھی طرح سیر اور تحقیقات کرتا پھرتا تھا۔ مدراس، مقابر خانقاہیں، کاریزیں، مچھلیوں کے تالاب، رصدگاہیں اگر چہ ان کی ایسی مفصل کیفیت نہیں لکھی جیسی سمرقند کے مشہور مقامات کی۔ اپنی قیام گاہ صرف علی شیر کا سابقہ مکان تحریر کیا ہے۔ اس کے شوق کا اصل مرجع صاحبان علم وفن یا

وہ درویش ہیں جنہیں ان کی سیاحت کے دوران ٹھیرا کر مہمان رکھا جاتا تھا یا عمدہ حافظے ک لوگ جنہیں ماضی کی روایات رواں تھیں اور آخر میں ''علوم دنیا'' کے جاننے والے کیونکہ اعلیٰ علوم دین کی تعبیر وتشریح کی شاخوں سے مختص تھے۔ بہر حال، بابر کا بہت دل چاہتا تھا کہ علم وفضل کی انہی صحبتوں میں زندگی گزار دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بطور بادشاہ کے جو دو بادشاہ بھائیوں کا مہمان تھا، اسے اپنے قیام کچھ بہت اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ ان بھائیوں میں بڑا بدیع الزمان متلون مزاج اور مظفر کے مقابلے میں اپنی کمتری کا بھی احساس رکھتا تھا۔ مظفر، سلطان حسین میرزا کی چہیتی اور چھائی ہوئی بیوی خدیجہ بیگم کے بطن سے زیادہ ہر دل عزیز شہزادہ تھا۔ ادھر بابر کو اپنے مرگسار، بے چین بھائی جہانگیر کی بھی دیکھ بھال رکھنی پڑتی تھی۔ شکی مزاج ہراتی درباریوں میں پھونک پھونک کے قدم اٹھانا ہوتا تھا۔ طرفہ تر یہ کہ ان جلسوں میں شراب پینے کو بہت جی چاہنے لگا تھا۔ لکھتا ہے کہ:

''مظفر حسین میرزا نے باغ سفید میں میری دعوت کی۔ کھانا ختم ہوا اور دستر خوان بڑھایا جا چکا تو خدیجہ بیگم ہم دونوں کو بارہ دری میں جس کا نام طرب خانہ تھا، لے گئی۔ باغ کے وسط میں یہ چھوٹا سا مکان بہت پر فضا بنا ہوا ہے...... ایوان کے ہر پہلو کی دیوار پر ابوسعید میرزا نے اپنے محاربات کی تصویریں بنوائی ہیں (ابوسعید آخری تیموری فرماں روا تھا جس کے زمانے تک زوال پذیر سلطنت کا کچھ نہ کچھ حلیہ باقی تھا) طرب خانہ مس ی بزم شراب آراستہ ہوئی۔ شمالی شہ نشین کی ایک مسند پر میں اور مظفر میرزا، دوسری سلطان مسعود اور جہانگیر بیٹھے۔ مہمان ہونے کی وجہ

سے مجھے میرزا نے صدر میں بٹھایا۔ ساقیوں نے جام بھر بھر کے حاضرین کو دیئے اور سبھی نے مئے ناب کو آب حیات کی طرح پینا شروع کیا۔ جب سرور گٹھا تو وہ لوگ خیال کرتے تھے کہ مجھے بھی شریک دور کیا جائے۔ میں نے اس وقت تک شراب نہیں پی تھی۔ اور اچھی طرح مخمور ہونے کی کیفیت سے واقف نہ تھا۔ اس جلسے میں سخت آرزومند ہوا کہ یہ ندی پار کی جائے۔ لڑکپن میں کبھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔ کبھی خود میرے والد نے کہا بھی تو میں نے عذر کیا اور اس گناہ سے محفوظ رہا۔ والد کی وفات کے بعد خواجہ قاضی کی خبر گیری کی وجہ سے محترز رہا۔ مشتبہ کھانے تک سے پرہیز کرتا تھا کجا کہ شراب حرام کو ہاتھ لگاتا؟ بعد میں جوانی کی خواہش نفسانی مجھے اس طرف ترغیب دینے لگی۔ لیکن کسی دوسرے نے پلانے پر اصرار نہیں کیا۔ کیونکہ میری دلی خواہش کسی پر ظاہر نہیں ہوئی تھی، اب اس محفل میں آیا کہ شاہزادے سرہو رہے ہیں، ہرات جیسے شہر میں پیوں گا تو اور کہاں پیوں گا؟ چنانچہ یہ سوچ کر قصد کر لیا کہ جب دونوں شہزادے مل کر تقاضا کریں گے تو پینی شروع کر دوں گا۔

اس جلسے کے گویوں میں حافظ حاجی نے خوب گایا۔ ہرات کے لوگ دھیمے سروں میں، نزاکت سے گاتے ہیں۔ جہانگیر میرزا کے ہمراہ بھی ایک سمرقند کا گویا میر جان نامی تھا جو ہمیشہ اونچی، سامعہ خراش آواز سے گاتا اور بےسرا ہو جاتا تھا۔ جہانگیر نے نشے میں گرما کر اسے گانے کا حکم دیا۔ وہ گایا تو سہی مگر بہت بےمزہ بے ڈھنگا گایا۔ سننے والوں میں کسی نے تو کان بند کر لئے کسی نے ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن اہل خراسان تمیز دار لوگ ہیں اور جہانگیر میرزا کے پاس خاطر سے کسی نے

اسے گانے سے روکنے کی جسارت نہیں کی۔

نماز مغرب کے بعد ہم طرب خانہ سے اٹھ کر مظفر میرزا کے سرمائی مکان میں آئے۔ یہاں اس کا کوکہ یوسف علی نشہ شراب کی مستی میں کھڑے ہو کے ناچنے لگا۔ فن داں تھا، اچھا ناچا۔ مظفر میرزا نے تلوار کی مرصع پیٹی، برہ پوستین اور ایک قب چاقی مجھے عنایت کیا۔ جانک نے گانا سنایا اور مظفر میرزا کے دو غلام چھوٹا چاند (کچک مہ) اور بڑا چاند (کنہ مہ) متوالے بن کر فحش نقلیں کرنے لگے رات گئے تک محفل گرم رہی رات کو میں اسی مکان میں سویا۔

قاسم بیگ نے جو سنا کہ مجھ سے شراب پینے پر اصرار کیا گیا تھا تو مظفر میرزا کے پاس آدمی بھیج کر صاف صاف لفظوں میں تنبیہ کی۔ لیکن اب بڑے بھائی بدیع الزمات نے اس دعوت کی خبر سن کر باغ میں میری، مصاحبوں اور فوجی سرداروں سمیت دعوت کی۔ یہاں جو لوگ میرے سامنے بیٹھے وہ میرے لحاظ سے علانیہ شراب نہ پیتے تھے۔ کبھی میری توجہ ہٹا کر کبھی ہاتھ کی آڑ لے کر چسکی لگا لیتے۔ حالانکہ یہاں میری طرف سے انہیں اجازت تھی کیونکہ دعوت ایسے شخص کی طرف سے تھی جسے میں اپنا برادر بزرگ سمجھتا تھا۔''

ہمارا شیر ہرات میں شراب خانہ خراب سے تو بچ گیا لیکن ایک عورت کی زد سے نہ بچ سکا۔ بڑی شہزادیوں سے ایک دفعہ ملنے آیا تو وہاں اس کی ایک چھوٹی عم زاد بہن معصومہ سلطان بھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی (بہ تصحیح مترجم) بابر کی طبیعت ادھر مائل ہوئی اور اس نے بڑی بیگموں کو اس سے شادی کا پیغام بھیجا، قرار پایا کہ بابر کے

جانے کے بعد لڑکی اپنی ماں کے ساتھ کابل بھیج دی جائے گی۔

بیس دن تک شبانہ روز سیر اور عیش و عشرت کے جلسوں کا لطف اٹھانے کے بعد، بابر نے پھر ایک دم رائے قائم کی:

''یہ لوگ مجھ سے کہتے تھے، قشلاق (سرما گزاری) یہاں کرو لیکن میرے یا میرے ساتھیوں کے لیے قشلاق کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا نہ کسی مکان کا انتظام کیا۔ ادھر سردی شروع ہو گئی۔ میرے اور کابل کے درمیان پہاڑوں پر برف گرنے لگی۔ کابل کی طرف سے مجھے فکر بڑھنے لگا مگر زبان سے کہہ نہ سکا لہذا سرمائی مقام (قشلاق) کی تلاش کا حیلہ کر کے ہرات سے چل پڑا'' (یہ 24۔ دسمبر 1506ء کا دن تھا) اس طرح کوچ کرنے کا نتیجہ یہ ضرور رہا کہ اس کے کچھ اہل لشکر بکھر گئے۔ بعض لوگ تو تھوڑے وقفے سے چل کر آ ملے، بعض نے ہرات کے عیش کدوں سے نکلنا پسند نہ کیا۔

طوفان شدت پر تھا

تقدیر کی خرابی سے قاسم بیگ مشرق میں دروں کے غلط راستے سے لے چلا۔ سن رسید قاسم اور نوجوان بابر میں اب نہایت عزیزانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ قاسم بیگ نے مصائب میں صرف ایک دفعہ ساتھ چھوڑا اور خسرو شاہ کی پناہ لی جسے بعد میں بابر نے بے تامل معاف کر دیا۔ لکھتا ہے کہ وہ ''نہایت وفادار، بہادر، راسخ العقیدہ دین دار مسلمان تھا۔ مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرتا تھا۔ اگرچہ اسے لکھنا پڑنا نہ

آتا تھا۔ لیکن بہت ذہین، حاضر جواب خوش طبع شخص تھا۔'' اس کی رہنمائی میں اب کے قندھار کا بہت پھیر کا راستہ جو آباد وادیوں میں سے گزرتا تھا، چھوڑ کر سیدھے جنوب کی طرف چلے۔ پہاڑوں پر ویران علاقہ ہوا۔ ادھر برف باری شروع ہوئی جو بعض اوقات گھوڑے کی رکابوں تک اونچی پڑتی تھی۔ ایک بوڑھے راہبر کو ساتھ لیا تھا، وہ تازہ برف باری میں بیٹا بھول گیا۔ لشکر کے سرداروں نے جہاں آگ جلانے کا ایندھن پایا وہاں پڑاؤ لگانے کا فیصلہ کیا اور ہرکارے دوڑائے کہ کچھ مقامی لوگوں کو ڈھونڈ کر پکڑ لائیں اور سامان خوردنی بھی فراہم کریں یہ ٹولیاں تین دن تک واپس نہ آئی۔ بابران کے انتظار میں پڑاؤ سے آگے نہیں بڑھا۔ چوتھے دن ہرکارے واپس آئے اور نہ کوئی رسد لائے، نہ کوئی آدمی انہیں مل سکا۔ ناچار اسی بڈھے رہبر کو لے کر لشکر آگے چلا۔ گھوڑے تھک گئے، سواروں کو سخت تکلیف ہوئی اور جتنا چلے اتنے ہی زیادہ اونچے پہاڑ انہیں گھیرنے کو سامنے آتے گئے۔ بابر کو ہرات کا عیش و آرام یاد آیا۔ دل بہلانے کو اس نے گردش تقدیر کے موضوع پر ایک نظم لکھی۔

'' ہم ایک ہفتے تک چلتے رہے۔ برف کو کاٹتے، کھودتے ہوئے چل رہے تھے۔ کہ سواروں کے لئے راستہ نکل آئے لیکن کوس ڈیڑھ کوس روزانہ سے زیادہ طے نہ کر سکتے تھے۔ قاسم بیگ اصرار کر کے اس راستے لایا تھا۔ لہذا اب وہ اور اس کے بیٹے برف کاٹنے میں آگے آگے ہوتے تھے۔ دس پندرہ ملازموں کے ساتھ میں بھی برف کاٹتا تھا۔ ہم گھوڑے سے اتر کر ساتھ آٹھ قدم تک کھدائی کرتے۔ کمر کمر بلکہ کبھی سینے تک برف میں دھنسے ہوئے ہوتے تھے۔ چند قدم راستہ کھودنے میں اگلے

تھک جاتے تو پچھلے ان کی جگہ لے کر کھدائی کرتے۔ گھوڑوں کو کھینچ کھینچ کر آگے چلانا پڑتا تھا۔ ان کے پیٹ تک برف ہوتی اور وہ دس پندرہ قدم گھسٹ گھسٹ کر چلنے میں رہ جاتے۔ بہت سے اچھے اچھے سپاہی اور سردار کھدائی میں حصہ نہ لیتے تھے۔ جب راستہ صاف ہو جاتا تو سر جھکائے چلے آتے تھے۔ کسی کو تکلیف یا حکم احکام دینے کا وقت نہ تھا۔ ہر شخص کی مرضی پر موقوف تھا کہ ہمت ہو تو خود آئے اور اس کام میں ہاتھ بٹائے۔ تین روز میں اس مقام عذاب سے نکل کر کوتل زریں کے نیچے ایک کھو (''خوال'') تک پہنچے جسے یہاں والے ''مبارک خوال'' موسوم کرتے تھے۔ اس روز طوفان شدید اور زمہریری ہوا ایسی تیز چلی کہ ہر شخص کو جان کے لالے پڑ گئے۔ طوفان کی عین شدت میں کھو کے منہ پر پہنچے گھوڑوں سے اترے۔ اب گہری برف اور پتلی سی پگڈنڈی پر ایک ہی آدمی چل سکتا تھا۔ گھوڑوں کے لیے اور بھی خطرہ۔ پھر سال کا سب سے چھوٹا دن کہ تھوڑی ہی دیر میں شام ہو گئی۔ مغرب کے وقت اندھیرا ہونے تک لوگ آتے رہے اور پھر کھو میں ہی جہاں تک گئے وہیں اتر پڑے کہ دن نکلنے کا انتظار کریں۔

کھو چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک بیلچہ لے کر اتنی جگہ سے برف کاٹی کہ نمدہ بچھا کر بیٹھ سکوں۔ پھر بھی زمین تک نہیں صاف کر سکا۔ البتہ ہوا سے بچاؤ ہو گیا۔ کئی آدمیوں نے پکار پکار کر کہا کہ آپ اندر چلے جائیں مگر میرا جی نہ چاہا کہ خود گرم اور محفوظ جگہ میں رہوں اور باقی سب باہر تکلیف اٹھائیں۔ یہ مروت و رفاقت کے خلاف بات تھی۔ جو اوروں پر گزرے وہی مجھے سہنا چاہئے۔ فارسی مثل کے

مطابق ''مرگ با یاراں عید است'' میں وہیں بیٹھا رہا (بہ تصحیح مترجم) عشا کے وقت اتنی برف پڑی کہ میرے سر، کمر اور کانوں پر کئی کئی انگل جم گئی۔ رات میرے کانوں میں ٹھر بیٹھ گئی۔

اتنے میں کچھ لوگ جو اندر گھسے تھے، پکارے کہ یہ کھو بہت لمبی اور سب کے لئے اس میں جگہ ہے۔ یہ سن کر میں اٹھا اور منہ اور سر پر سے برف کی تہ جھاڑ کر دوسروں کو آواز دی اور اندر چلا۔ حقیقت میں ساٹھ آدمیوں کی جگہ موجود تھی۔ خشک گوشت، ستو وغیرہ جو چیز کھانے کی کسی کے پاس تھی وہ اس نے پیش کی۔ اس طرح سردی اور زحمت سے بچ کر گرم، آرام کی جگہ پہنچ گئے اور کھانا بھی مل گیا۔ دوسری صبح برف باری اور تیز ہوا رکی اور ہم سویرے سے برف کاٹتے چلے کہ اوپر درے تک پہنچ جائیں۔ صحیح راستہ جو بھول گئے تھے، پہاڑ کے گرد سے پھیر کھا کے درے تک پہنچ جائیں۔ صحیح راستہ جو بھول گئے تھے، پہاڑ کے گرد سے پھیر کھا کے درے تک آتا تھا جسے کوتل زریں کہتے ہیں۔ اسے اختیار کرنے کی بجائے ہم سیدھے گھاٹی کی تلہٹی سے چلے اور درے کے دہانے تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ دن چھپ گیا۔ جہاں تھے، رات وہیں گھاٹی کے حلق میں گزاری۔ سردی قیامت کی تھی۔ بڑی تکلیف اٹھائی (بہ تصحیح مترجم) کنہ بیگ اور آہی کے دونوں پاؤں اور سیون رک ترکمان کے دونوں ہاتھوں کو جڑا مار گیا۔ فجر ہوتے ہی ہم خدا پر بھروسہ کر کے آگے چلے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اصلی راستہ یہ نہیں ہے۔ اونچی اونچی سلامی دار چٹانوں پر چڑھنا پڑا اور جگہ جگہ ٹھوکریں کھا کے گرے بارے عشاء کی نماز کے وقت سے کچھ پہلے گھاٹی سے باہر نکل

آئے۔ یہاں کے کسی بڑے بوڑھے کی یاد میں اتنی گہری برف کے زمانے میں کوئی شخص اس درے سے نہیں پار ہوا تھا۔ بلکہ اس کا بات کا کوئی دل میں خیال تک نہ لا سکتا تھا۔ ہر چند برف نے ان چند روز میں سخت آزاد دیا پھر بھی اسی اونچی برف کی بدولت ہم پار نکلنے کی بھی قابل ہوئے۔ کیونکہ وہ اتنی اونچی نہ ہوتی تو بغیر راستے کے ان ڈھلانوں پر نہ چڑھ سکتے تھے اور نہ گہرے گڑھوں کو عبور کرنا ممکن ہوتا۔

نماز عشا کے وقت ہم موضع یک اولانگ آ کے گھوڑوں سے اترے۔ گاؤں والوں نے ہمیں پہاڑ سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً اپنے گرم گھر ہمارے لئے خالی کئے۔ مچرب بکریاں پکائیں۔ گھوڑوں کو دانہ گھانس کھلایا۔ آگ کے لیے ایندھن اور اپلوں کا ڈھیر لگا دیا۔ دل کھول کے مہمان داری کی۔ اس خوفناک سردی اور برف سے بچ کر گاؤں کے گرم مکانوں میں آنے اور اچھی غذا اور آرام پانے کا مزہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں سخت مشقت اور مصیبت کے بعد ایسی راحت نصیب ہوئی ہو۔ اس گاؤں میں ہم نے فراغت و مسرت سے ایک دن قیام کیا۔ دوسرے دن عید رمضان تھی۔ پھر بامیان کے راستے درہ شہر (؟) کو پار کر کے جگمد لگ (یا جنگلک) کے قریب منزل کی۔

بابر کی جمعیت اب کابل کے مغرب میں شارع عام یا کہنا چاہئے کہ ٹھیک بیٹا پر آ گئی تھی۔ جیسا اس نے لکھا، برف کے تودوں نے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر انہیں طوفان سے سلامت نکل آنے میں مدد دی۔ یعنی ان تودوں کو کاٹنے، کھودنے کی محنت نے جسم کی حرارت قائم رکھی اور زمین کے گڑھوں کو بھی پاٹ دیا۔ یہ لوگ ایسے

جفاکش سوار تھے کہ برف کے طوفانوں میں، برف کاٹ کاٹ کر ایسے گوشے بنا لیتے تھے جس میں آڑ لے کر تھوڑی بہت نیند بھی لے لیتے اور وہ اور ان کے جانور کئی کئی دن برائے نام خوراک ہی پر چلتے رہتے اور برف چبا کر پیاس بجھا لیتے تھے۔ البتہ پار مار جانے کا خوف تھا بابر اپنے بھائی جہانگیر کی کمزوریاں بیان کرنے میں ہمیشہ سکوت سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے یہ تحریر نہیں کیا کہ وہ بیمار ہوا کہ اور پالکی میں لایا جا رہا تھا۔ پھر آرام کی جگہ اسے چھوڑ کر بابر کو جلد کابل جانا پڑا۔ لیکن جہانگیر روز بعد اسی قیام میں فوت ہو گیا۔

کھلا راستہ غوربند کی چوڑی گھاٹی میں سے گزرتا تھا۔ بابر کے قراول کے معلوم ہوا کہ ان کے آگے ہزارہ کے ایک گروہ کا پڑاؤ ہے اور وہ لوگ مسافروں پر چھاپے مارتے ہیں۔ بظاہر یہ لوگ اپنے قشلاق چھوڑ چھوڑ کر قزاقی کے لئے ادھر آ گئے تھے۔ انہیں گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ان کا بادشاہ اور اس کے جنگ آزمودہ سردار بلند دروں سے اتر کر آ رہے ہیں جنہیں برف سے مسدود سمجھا جاتا تھا۔ ''ترکمان ہزارہ بیوی بچوں سمیت ہمارے راستے میں سرما گزاری (قشلاق کر رہے تھے۔ دوسری صبح ہم ان کے ڈیروں اور مویشی خانوں میں گھسے اور خود بھی کچھ لوٹ مار کی۔ وہ بیوی بچوں کو لے کے بھاگے۔ ڈیرے، خیمے اور سب سامان چھوڑ گئے۔ اتنے میں آگے سے خبر آئی کہ ہزارہ تیر اندازوں نے ایک تنگ مقام گھاٹی نہ تھی مگر ایک ٹیکرے پر کچھ ہزارہ ہوشیار ہوئے بیٹھے تیر چلا رہے تھے۔ میں نے ملازمین کو تنبیہہ کی اور کہا کہ ایسے موقع پر نوکر کام آنے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ نہ اس لئے کہ ہر جگہ آقا کو

بھڑا دیں۔ پھر سب کے آگے ہولیا۔ ہزارے جلدی سے نکل بھاگے۔ ان کی چند بکریاں میں نے بھی گھیریں...... 14، 15 لٹیرے جوان گرفتار کر لئے گئے تھے۔ میں انہیں اگلی منزل پر عذاب دے کر قتل کرا دینا چاہتا تھا کہ دوسرے رہزنوں کو سبق ہو۔ لیکن قاسم بیگ کا ادھر سے گزر ہوا اور اس نے بے موقع رحم کھا کے انہیں جانے دیا۔ پھر مجھے بھی یہی کرنا پڑا اور باقی سب قیدیوں کو رہائی دے دی۔ انہیں ہزار پر تاختوں میں (کابل سے) ہمیں خبریں ملیں۔"

بے وفا اقربا اور وفادار سپاہی

بابر کو ہرات میں جو اندیشے تھے وہ اس کے اپنے محل (کابل) میں پیش آئے۔ دروں کے پار غیر حاضری میں یہ افواہ کابل میں اڑ گئی یا عمداً یا کر مشتہر کی گئی کہ ہرات کے دونوں شہزادوں نے اسے (بابر کو) قید کر لیا ہے۔ اسی کی بنیاد پر بابر کے دو خطاب یافتہ عزیزوں نے اجیر مغلوں کی، جو لوٹ مار کے ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے تھے، ایک جمعیت تیار کر لی اور قلعہ کابل کا محاصرہ کرنے بڑھ رہے تھے جس کی حفاظت کے لئے وہ تھوڑے سے سپاہی چھوڑ گیا تھا۔ حسب معمول جس وقت وہ اپنے سیر سپاٹوں میں مصروف تھا، یہاں اس کا تخت شاہ ہتھیا لینے کی سازش ہو رہی تھی۔ بابر کے لئے یہ غیر متوقع نہ ہو تو بھی حق یہ ہے ایسی سازشوں کا قلع قمع کرنا اسے کبھی نہ آیا۔ سازش کا سب سے ناگوار پہلو یہ تھا کہ وہ ان عزیزوں نے پکائی جنہیں سمرقند اور تاشقند کی تباہیوں سے نجات دلا کر بابر نے پناہ دی تھی۔ اہل سازش

کے پس پشت ایک عورت کا چھپا چھپا چہرہ تھا۔ یہ یونس خاں کی آخری اور بارعب بیوی شاہ بیگم اور اس کی بیٹی چغتا بیگم بابر کی سوتیلی خالہ تھیں۔ اسی کے بیٹے خان میرزا (بہ تصحیح مترجم) لاغری کو بابر کی بجائے تخت کابل کا انہوں نے حق دار بنایا۔ ان کی تائید نہیں تو کم سے کم چشم پوشی کرنے میں بابر کا سسرالی عزیز حسین دوغلات شامل تھا۔ خان میرزا چار باغ کے ٹیکرے سے باغیوں کو حکم دے رہا تھا۔ قلعے میں صرف دو چھوٹے درجے کے سردار، ایک قورچی (سلاخ دار) اور ایک عالم (ملا بابا) تھے جنہوں نے مدافعت کی تیاری کی۔

ضرورت کے وقت بے تحاشا کام کرنا بابر کی عادت میں داخل تھا۔ اس کے خبر کے سنتے ہی ہزارہ کا پیچھا چھوڑ کر وہ فوراً جتنے آدمی سامنے تھے، انہی کو لے کر کابل چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح یکا یک اس کا آپڑنا دشمن کے ہاتھ پاؤں پھلا دے گا کیونکہ انہیں اس کی آمد کا علم نہ تھا۔ اسی خیال سے بابر نے جھوکوں مول لینے میں مضائقہ نہیں کیا۔ لیکن کوئی شک نہیں کہ اپنے عزیزوں کی بے وفائی سے اسے دلی صدمہ ہوا۔ اگلے واقعات بھی کچھ اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی شخص ایک منحواس خواب دیکھ رہا ہو۔

''میں نے قاسم بیگ کے نوکر کو قلعے کے سرداروں کے پاس بھیجا، اپنے آنے اور آئندہ منصوبے کی سب کیفیت سے انہیں اطلاع دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہم غوربند گھاٹی کے سرے سے نکلتے ہی دشمن پر ایک دم جا پڑیں گے۔ کوہ منارسے گزرتے ہی آگ جلا کے تمہیں خبر دے دیں گے۔ ادھر سے تم قلعے کے پرانے برج پر آگ جلانا

تا کہ ہم سمجھ جائیں کہ تمہیں خبر ہوگئی ہے۔ہم ادھر سے براہ راست حملہ کریں گے۔تم اندر سے نکل کر حملہ کرنا۔جس قدر ہو سکے اس میں کمی نہ کرنا۔دوسرے دن فجر سے چل کر ہم ایک گاؤں میں اترے۔اگلی صبح چل کر غور بند کے نالے سے گزرے اور پل پر گھوڑوں کو پانی پلایا۔ظہر کے وقت سستا کہ آگے چلے تو جس قدر بڑھے، زیادہ گہری برف پڑی ہوئی ملی پھر سردی اتنی شدید کہ پہلے کبھی نہیں دیکھنے میں آئی تھی۔کوہ منار سے گزر کر ہم نے ڈھالان پر گھوڑوں سے اتر کر آگ جلا کر بدن تاپا۔ مقررہ نشانی کی آگ جلانے کا ابھی وقت نہیں تھا۔مگر ٹھنڈ نے ہمیں عاجز کر دیا تھا ......اس پہاڑی اور کابل کے درمیان گھوڑوں کے گھٹنوں گھٹنوں تک برف تھی اور کنارے اتنے سخت یخ بستہ کر بٹیا چھوڑ کر بھی نہیں چل سکتے تھے۔صرف ایک کے پیچھے ایک سوار چل رہا تھا، بارے بلا اطلاع ہوئے کابل تک آ گئے اور قلعے کے اوپر آگ چمکتی دیکھ کر سمجھ گئے کہ ہمارے سردار انتظار کر رہے ہیں...... ان دنوں الغ بیگ کے باغیچے میں ایک لنگر خانہ بنا ہوا تھا۔درخت وغیرہ تو باقی نہیں رہے تھے۔ البتہ احاطے کی دیوار سلامت تھی۔خان میرزا اسی میں مقیم تھا۔میں ایک گھرے ہوئے راستے سے ادھر چلا۔ابھی اس کی عقبی قبرستان تک گیا تھا کہ سامنے سے چار سوار واپس آئے۔یہ باغیچے میں پہلے دوڑ گئے تھے۔خان میرزا خوف زدہ ہو کے نکل گیا۔ان چاروں نے تیر و تلوار کے زخم کھائے۔جواب میں ہاتھ چلائے اور پسپا ہو کے میرے پاس آئے۔یہاں ہمارے اور سوار بھی جمع ہو گئے۔بھیڑ کی وجہ سے آگے جانا یا پیچھے پلٹنا محال ہو گیا۔میں نے قریب والوں سے کہا۔گھوڑوں سے اترو اور

اندر گھس جاؤ میرے کتاب دار محمد علی اور اس کے چند ساتھیوں نے فوراً حملہ کیا جس سے دشمن بھاگ نکلے۔ ہمارے کتاب دار محمد علی اور اس کے چند ساتھیوں نے فوراً حملہ کیا جس سے دشمن بھاگ نکلے۔ ہمارے قلعے کے آدمیوں نے پہنچنے میں دیر لگائی۔ مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ واپسی میں دوست نامی پیادہ جسے میں ترقی دے کر کابل میں چھوڑ گیا تھا، پل پر ملا۔ ننگی تلوار لے کر کھ پر جھپٹا۔ میں نے جلیبہ (زرہ) پہن رکھا تھا لیکن سر پر دوبلغہ (فولادی خود) نہ تھا۔ شاید سردی اور برف باری نے میری صوت بدل دی تھی۔ اور یا گھبراہٹ کی وجہ سے اس نے مجھے نہ پہچانا۔ میں چلایا ''ہے دوست، ہے دوست'' لیکن اس نے میرے کھلے بازو پر تلوار ماری۔ محض خدا کی رحمت سے میں بال بال بچ گیا۔

یہاں سے ہم حسین میرزا دوغلات کی تلاش میں بہشت باغ گئے مگر وہ بھاگ کر کہیں چھپ گیا۔ باغ کی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہاں سات آٹھ آدمی لڑنے کے لیے کھڑے تھے۔ میں نے گھوڑا ڈپٹایا تو وہ پلٹ کر بھاگے۔ ایک میں نے جھپٹ کر تلوار ماری اور وہ اس طرح سر کے بل گرا کہ میں سمجھا سکا سر اڑ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خان میرزا کا کوکہ تھا اور میری تلوار اس کے شانے پر پڑی تھی۔

حسین میرزا کے مکان کے دروازے پر ایک مغل نے چھت کی کمین گاہ سے میرے چہرے کا نشانہ باندھ کر کمان کھینچی۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ پہلے میرا نوکر تھا۔ لوگ چلائے ''ہائیں، ہائیں۔ بادشاہ!'' میں اس نے شست بدل کر تیز پھینکا اور بھاگا۔ تیر مارنے کا موقع بھی کیا تھا۔ میرزا اور اس کے سردار بھگا دیئے یا پکڑ لئے جا

چکے تھے۔ یہیں لوگ گلے میں رسی ڈال کر سلطان سنجر برلاس کو میرے پاس لائے۔ میں نے اسے بڑی جاگیر دی تھی۔ مگر یہ بھی بغاوت میں شریک ہو گیا وہ مضطربانہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "میرا کیا قصور ہے۔ میرا کیا قصور ہے؟" میں نے کہا "تمہارا صاف قصور یہ ہے کہ اس ٹولی کی چشم پوشی سے تمہیں بری رہنا چاہئے تھا!" مگر چونکہ وہ شاہ بیگم کا بھانجا تھا۔ میں نے لوگوں سے کہا "اسے ذلیل کر کے اس طرح کشاں کشاں نہ لاؤ۔ اسے موت کی سزا نہیں دی گئی ہے۔"

قلعہ کے ایک سردار کو تھوڑے سے عسکریوں کے ساتھ خان میرزا کی تلاش میں بھیج کر، خود میں شاہ بیگم اور مہر نگار (چغتائی) خانم سے ملنے چلا۔ وہ باغ بہشت میں ایک خیمے نے اندر ٹھیری ہوئی تھیں۔ شہر کے بلوائی چاروں طرف لوٹ مار مچاتے پھرتے تھے۔ میں نے اپنے آدمی بھیجے کہ ان شہدوں کو بھگا کر دفع کریں۔

شاہ بیگم اور خانم ایک ہی خیمے میں بیٹھی تھیں۔ میں حسب معمول فاصلے سے تعظیماً گھوڑے سے اترا اور اسی طرح ادب آداب سے ملا جیسے پہلے ملحوظ رکھتا تھا۔ باتیں کرنے لگا۔ مگر وہ بہت گھبرائی ہوئی، شرمندہ تھیں۔ مجھ سے انہوں نے خیر و عافیت تک نہ پوچھی اور نہ کوئی معقول عذر معذرت کر سکیں۔ (بغاوت کے سرغنہ کی یہ نانی اور ماں یہ معقول حیلہ پیش کر سکتی تھیں کہ بابر کے ہرات میں قید کر لئے جانے کی خبر سن کر ہم نے ایک ممتاز تیموری شہزادہ کو نیابتاً حکومت کابل سنبھالے رکھنے کی کوشش کرائی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ تیز عقل عورتیں اور بابر خوب سمجھتے تھے کہ واقعہ یہ نہ تھا) مجھے ان سے ایسی بے وفائی کی توقع نہ تھی۔ جو لوگ کھلے بندوں

بغاوت پر اتر آئے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو شاہ بیگم اور خانم کی نصیحت پر کان نہ دھرتا۔ خان میرزا شاہ بیگم کا سگا نواسہ تھا اور روزانہ ان کے پاس رہتا تھا۔ وہ بغاوت کے ساتھ نہ تھیں تو کم از کم اپنے آپ کو بالکل الگ رکھ سکتی تھیں۔ پہلے بھی جب تقدیر نے دو مرتبہ مجھے ملک و وطن، حکومت و لشکر سے محروم کیا، میں اور میری ماں ان سے مدد کے طالب ہوئے انہوں (شاہ بیگم) نے کوئی مہربانی ہم پر نہ کی۔ ایک کھیت اور بیلوں کی جوٹ تک عنایت نہ کی کہ اسی سے گزارہ کر لیتے۔ کیا میری ماں یونس خاں کی بیٹی نہ تھی؟ کیا میں اس کا نواسہ نہ تھا؟............ (اس کے مقابلے میں) جب یہ معزز بیگم میرے پاس آئیں تو میں نے انہیں کابل کی ایک بڑی جاگیر، بمغان حوالے کی...... یہ باتیں شکایت کے طور پر نہیں، محض اظہار حقیقت کے طور پر لکھی گئی ہے۔ ان سے اپنی مدح وستائش کرنا بھی مقصود نہیں ہے، جو کچھ گزرا اس کا ٹھیک ٹھیک بیان ہے۔ میں نے اس کتاب میں یہ التزام کیا ہے کہ ہر واقعے کی حقیقت معلوم ہو جائے اور صداقت سے اسے تحریر کر دیا جائے۔ اس سے اپنے یگانے اور بیگانے سبھی کا اچھا یا برا حال جو پیش آیا لکھ دیا گیا ہے۔ امید ہے پڑھنے والے یہ عذر قبول کریں گے اور مجھ پر سخت احتساب نہ فرمائیں گے۔''

ان کلمات کو پڑھنے سے پہلے ناظرین سوچتے ہوں گے کہ بابر نے اپنی عجیب تزک میں جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک یقین کے لائق ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہر معاملے میں جو کچھ اس نے تحریر کیا وہ فی الواقع بے کم و کاست اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ یہاں اس نے ہمیں بتایا۔ جملہ واقعات جس طرح اسے یاد تھے (اور بے شبہ وہ

نہایت عمدہ حافظہ رکھتا تھا۔) ٹھیک اسی طرح قلم بند کر دیئے ہیں۔ اپنے مختلف عزیزوں اور امیروں کی (مثلاً سمرقند کے سلطان علی کی) جو تصویریں اس کے قلم نے کھینچی ہیں، ان میں اپنی مخالفت کرنے والوں کی اکثر معاندانہ ہجو کی ہے۔ تنہا وہ دشمن یعنی شیبانی خاں، جس سے وہ خائف تھا۔ اس کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا۔ نیز ایسے چند خفت آمیز واقعات کو، جیسے بہن (خانزادہ) کا اسی شیبانی کے حوالہ کر دینا قلم انداز کر گیا ہے۔ بایں ہمہ خود اپنی تصویر، اچھی یا بری، سچی، ہو بہو اتاری ہے۔ اس قصد مصمم کی بدولت کہ ''جو کچھ گزرا اسے بے کم و کاست تحریر کروں گا۔'' واقعی ایک بے نظیر دستاویز تیار ہوئی، اور یہ ایک پوری زندگی کی داستان اس شخص کے قلم کی لکھی ہوئی جو سب سے بہتر اسے جان سکتا تھا اور اس کی جزئیات بیان کرنے میں کوئی کوتاہی روا نہیں رکھتا...... بابر اگر چاہتا تو خان میرزا کی ماں اور نانی سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح لکھتا جس میں خود اس کی تعریف کا رنگ ہوتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ سالہا سال کے بعد یہی واقعہ حسین میرزا کے بیٹے حیدر میرزا دوغلات نے اپنی ''تاریخ رشیدی'' میں تحریر کیا ہے وہ زیادہ رنگین فارسی میں لکھتا اور بابر کو شہنشاہ (بادشاہ۔ مترجم) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ:

''بادشاہ حسب معمول تپاک سے ملا۔ بغیر تلخی یا ناگواری ظاہر کیے، بے تکلف خوشی خوشی سوتیلی نانی کے پاس آیا اگرچہ اس نے ترک محبت کی اور دوسرے نواسے کو بادشاہ بنایا تھا۔ شاہ بیگم گھبرا گئی اور اسے کچھ کہتے بن نہ آئی۔ بادشاہ جھک کر آداب بجا لایا اور فرزندانہ محبت سے گلے مل کر کہنے لگا۔'' اگر ماں کی شفقت کسی دوسرے

بچے پر زیادہ ہو تو بھی ایک بچے کو برا ماننے کا حق نہیں ہے۔ ماں کا حق ہر حال میں اولاد پر قائم رہتا ہے۔'' پھر کہنے لگا '' مجھے تمام رات نیند نہیں آئی۔ طویل سفر کر کے چلا آ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کے اپنا سر شاہ بیگم کی آغوش میں رکھ کر آنکھیں بند کر لیں جیسے سونا چاہتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ بیگم کو ہر طرح مطمئن کر دے۔ ابھی مشکل سے آنکھ جھپکی ہو گی کہ اس کی خالہ مہر نگار بیگم آئی۔ بادشاہ فوراً اٹھا اور اس عزیز خالہ سے پورے تپاک سے گلے ملا۔ بیگم نے کہا '' تمہاری بیویاں اور گھر والے تمہیں دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ میں شکر ادا کرتی ہوں کہ خدا نے تم سے ملایا۔ اب تم اٹھو اور قلعے میں اپنے گھر والوں میں جاؤ۔ میں بھی وہیں چلتی ہوں'' (اور واقع میں وہ بھی ایک خاص غرض سے وہاں جا رہی تھی)

پھر بادشاہ قلعے میں آیا۔ جملہ خدام اور امرا خدا کی رحمت و کرم پر شکرانہ بجا لائے ...... اب شاہ بیگم خان میرزا اور میرے باپ (حسین میرزا) کو بادشاہ کو سامنے لائی۔ وہ قریب آئے تو بادشاہ انہیں لینے آیا۔ بیگم نے کہا '' جان مادر میں اپنے گنہگار بیٹے اور تمہارے بدنصیب بھائی کو لائی ہوں۔ ان کے حق میں تم کیا کہتے ہو؟'' بادشاہ نے میرے باپ کو دیکھا تو حسب عادت تعظیم سے یہ عجلت بغل گیر ہوا۔ مسکراتا اور خیر و عافیت وغیرہ پوچھتا رہا۔ پھر اسی طرح خان میرزا سے بغل گیر ہوا اور محبت و نکوخواہی کا ثبوت دینے میں کمی نہ کی۔ یہ جملہ مراسم نہایت نرمی سے ادا ہوئیں، کسی تکلف یا تصنع کا شائبہ تک ان میں نہیں آیا۔ لیکن بادشاہ عنایت و شرافت کے صیقل سے ان کی شرمندگی کے داغ مٹانے کی جتنی بھی کوشش کرتا تھا، وہ شرم کے

داغ جوان کے آئینہ اعمال پر لگے تھے، دور نہ ہو سکتے تھے۔میرے باپ اور خان میرزا نے قندھار جانے کی اجازت مانگی۔شاہ بیگم اور خانم کو بادشاہ نے منت سماجت کر کے اپنے پاس روک لیا۔''

بابر نے ان سازش کے دو سرغنوں کے متعلق مختلف کیفیت بیان کی ہے۔وہ لکھتا ہے کہ ''حسین میرزا'' مہر نگار بیگم (بہ تصحیح مترجم) کے توشک خانے کی رضائیوں میں چھپا ہوا ملا اور اپنے کرتوت کی سزا میں ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے کے قابل تھا مگر بابر کی نظر میں اس کا بڑا گناہ یہ ہے کہ (یہاں سے چھوٹ کر) شیبانی خاں کے پاس گیا اور اس سے بابر کی برائیاں کیں۔خان میرزا، حسب تحریر بابر، پہاڑوں کے نیچے پکڑا گیا اور ایسا بے حواس تھا کہ بابر کے سامنے آتے میں دو دفعہ لڑکھڑا کر گرا۔اسے شربت دیا وہ بھی جب تک بابر نے خود نہ پیا، اس نے (زہر دیئے جانے کے خوف سے) نہیں پیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بابر کہ بالطبع عالی حوصلہ تھا، اس موقع پر ان لوگوں کے ساتھ زیادہ تر اس لئے رحم و کرم سے پیش آیا کہ شاہ بیگم کا خانم کا پاس خاطر منظور تھا۔ جہانگیر کے بعد اس کے قریبی رشتہ دار بہت کم رہ گئے تھے۔بہترین مصلحت اسی میں تھی کہ عدم موجودگی میں جو سازش کابل میں ہوئی اسے نظر انداز کر دیا جائے۔تاہم ان کنبے والوں کی غداری کا اسے دلی ملال ہوا۔

دورہ ہرات کا خاتمہ

اگر چہ ممکن ہے بابر نے سوتیلی نانی اور خالہ کو یرغمال کے طور پر کابل میں رکھا ہو لیکن کوئی شک نہیں کہ قطع نظر اس سازش کے، وہ ان سے بڑی محبت کرتا تھا۔ طرفہ تر یہ کہ سازش کا سارا الزام ان دو رشتہ داروں کو دیتا ہے اور یہ بھی خوب جانتا ہے کہ انہیں شہ دینے والیاں یہ عورتیں تھیں، پھر بھی اپنی پریشانیوں کے سلسلے میں ان عورتوں کا ذکر نہیں کرتا۔ یہ صرف آئین مردانگی نہیں بلکہ وہ سگی نانی (ایسان دولت بیگم) اور اپنی ماں کا غم نہیں بھولا تھا اور شاہ بیگم اور مہر نگار بیگم اس کے مختصر محل سرا میں ان مرنے والیوں کی خالی جگہ پر کرتی تھیں۔

ترک و مغول نسل کی بیوہ خواتین کا نوجوانوں میں بڑا احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ وحشی مزاج چنگیز خانی تک ''التون ارک'' یعنی شاہی حرم سرا کی دادیوں، نانیوں کا مشورہ مان لیتے تھے اس زمانے میں بھی جب کہ ایک عالم پر ان کی فرماں روائی تھی۔ شاہ بیگم اپنے رسوخ سے کام لینا جانتی تھی۔ تھوڑے ہی دن میں اس نے اپنے بد نصیب نواسے خان میرزا کے لئے خاصا محفوظ منصب حاصل کرلیا۔ اس کی پر مغز دلیل یہ تھی کہ ''میرے بزرگوں نے تین ہزار برس بدخشاں میں بادشاہی کی۔ میں عورت ذات زمام حکومت ہاتھ میں نہیں لے سکتی، میرا نواسہ لے سکتا ہے۔ اس کا سلسلہ اولاد بدخشاں میں صاحب عزت و توقیر رہے گا۔'' چنانچہ یہ پہاڑی نشیمن (بدخشاں) انہیں دے دیا گیا۔ مگر مغلوں کی شکست میں حسین میرزا نے شیبانی سے نامہ و پیام کرکے اپنی تباہی اپنے ہاتھوں کرائی۔ یہی موقع تھا جب اس نے بابر کو آل

تیمور کے ساتھ دشمن شیبانی کے سامنے مطعون کیا مگر ازبک نے اسے بھی قتل کرا ڈالا۔ اسی تتم پر بابر نے بے تامل یہ فقرہ جڑا کر تقدیر نے اسے اپنی بد گوئی کی سزا دی۔

چند روز قلعہ کابل میں جشن اور جلسے ہوتے رہے۔ نوجوان شہزادی معصومہ بیگم بدر قے کے ساتھ ہرات سے آئی۔ وہاں کے پر شکوہ دربار میں وہ بابر کو دیکھ کر شیدا ہو گئی تھی۔ بابر نے اسے عقد زوجیت میں لیا اگر چہ شادی سادگی سے ہوئی تاہم شاہ بیگم کی پر وقار شرکت نے تقریب کو اس گھٹیا قلعے میں یادگار چیز بنا دیا۔ خود بابر معلوم ہوتا ہے بہت شاد ہوا۔ اسی موقع پر حسب معلوم گشت لگاتے ہوئے۔ اس نے اپنے سواروں کو افغانوں پر جھپٹتے دیکھا تو دور سے بھاگتوں پر تیر چلا چلا کر انہیں روکا۔ اسے بڑے مزے لے کر بیان کرتا ہے کہ ایک ہزار سے زیادہ سواروں کو سرپٹ دوڑاتے میں روک لینا کچھ آسان نہیں ہے۔ اسی طرح لطف کے ساتھ ایک موٹے گورخر کو گھیر کر شکار کرنے کی کیفیت لکھی ہے۔ اور یہ تفصیل کہ اس کی پسلیاں ایک گز سے زیادہ ناپیں۔

یہ عیش ونشاط تھوڑے دن میں ختم ہوئے۔ ہرات کی دلہن کی پہلی ہی زچگی میں موت واقع ہو گئی مولود جولڑکی تھی سلامت رہی۔ بابر کے حکم سے اسے بھی ماں کا نام معصومہ بیگم دیا گیا۔ اس نے اسی قدر بیان کیا ہے۔ لیکن اس نام کی یاد تازہ رکھنے ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس نوجوان بیوی کو کس قدر چاہتا تھا۔

مذکورہ بالا زچگی (بلکہ شادی) سے بھی پہلے، موسم بہار کونپلیں پھوٹنے کے بعد جب راستے کھلے تو ہرات کے واقعہ ہائلہ کی خبر پہنچی۔ بظاہر بابر کا خود کوئی معقول فوج

لے کر ہرات واپس جانا محال تھا۔ وہاں کے دعوتیں کھانے کھلانے والے شہزادوں نے بھی غالباً بابا اوے کا کوئی پیام اسے نہیں بھیجا۔ صرف ایک آزمودہ کار سپاہی، یعنی قندھار کا حاکم فوج لے کے اپنے ہراتی سلاطین سے آملا اور انہیں مشورہ دیا کہ چھوٹا بھائی مظفر قلعے کو مورچہ بند کر کے یہاں رہے اور بڑا باہر کوہستانی علاقوں میں گشت لگا کر قبائل سے جتنے جوان مل سکیں بھرتی کرے اور خوفناک ازبکوں کے ہرات کا محاصرہ کرنے میں رکاوٹ ڈالے۔ جیسا کہ بابر نے بعد میں لکھا، یہ بہت اچھا مشورہ تھا۔ لیکن تیموریوں کے آخری گڑھ کے شریک بادشاہوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ جس وقت شیبانی پورے لشکر کے ساتھ ان کے خلاف بڑھا تو انہوں نے پھر اسی مرغاب ندی کے کنارے دل کشا چراگاہ میں خیمے ڈالے، جہاں بابر گزشتہ سال ان سے آ کر ملاقی ہوا تھا۔ انہیں ایک دوسرے پر بھروسہ نہ تھا اور بقول بابر ''نہ ہرات کو مستحکم کرنے پر متفق ہوئے نہ میدان میں لڑنے پر۔ بس خیمہ گاہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا ہے، بھروسہ کر لیا۔ خیالی خبطی لوگ تھے اور اس طرح کام کر رہے تھے جیسے کوئی خواب میں ہو۔''

شیبانی کے چالیس ہزار ازبکوں نے اس خواب کو بہت جلد باطل کر دیا۔ جب وہ ان بھائیوں کے پڑاؤ کے مقابل پہنچا، تو بہادر والئ قندھار کے سوا کوئی سامنے نہ ٹھیرا۔ یہ بہادر سردار اپنے چند صد جنگ آزماؤں کے ساتھ یہیں کھیت رہا۔ رہے اصلی حریف، یعنی مظفر و بدیع الزمان تو ''وہ فقط بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنی ماں، بہن، جورو، بچوں تک کو ازبکوں کا اسیر بننے کے لیے چھوڑ گئے۔'' مظفر کا تو پھر پتا نہیں

چلا۔ بدیع الزمان نے خراسان سے نکل کر ایران کی پناہ لی۔ ان کا مال اسباب اہل و عیال ایک پہاڑی قلعے میں تھے۔ اسے جملہ غنائم کے ساتھ لینے میں ازبکوں کو دو ہفتے لگے۔ شہر آفاق ہرات پر قبضہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے شیبانی نے عفو و کرم سے کام لیا۔ مظفر میرزا کی ایک بیوی کو اپنے حبالہ عقد میں لے آیا مگر کوئی قتل عام یا غارت گری شہر میں نہ ہونے دی بلکہ جو اہل علم وہیں رہ گئے تھے، اور خواندمیر مورخ ان میں شامل ہے، ان کی حفاظت کی بلکہ ان کی صحبت سے مستفید ہوا۔ جلاوطن ظریف شاعر بنائی بھی اس کے پاس رہا۔ لیکن بابر جسے ان واقعات کا سخت رنج تھا، اس روادارانہ قبضے کو بھی تعصب کی عینک سے دیکھتا ہے:۔

"شیبانی نہ صرف شہزادوں کے اہل و عیال بلکہ سبھی کے ساتھ بری طرح پیش آیا ایک شہزادی کو بطور مال غنیمت اپنے بخشی کو دے دیا۔ سارے شعرا آئندہ بنائی کا تسلط قائم کرایا (جس نے ضرور شاعرانہ انتقال لیا ہوگا۔) ہر چند ان پڑھ تھا مگر تفسیر قرآن میں ہرات کے دو مشہور عالموں کو سبق سکھانے کی جسارت کی۔ (47) قلم لے کر مشہد کے ملا کی خوش نویسی (قطعات۔ مترجم) میں اور بہزاد کی تصاویر میں اصلاح کی! بے مزہ شعر لکھے اور چوک کی مسجد میں منبر پر چڑھ کر پڑھے کے لوگ داد دیں۔ وہ فجر کے وقت اٹھتا اور پانچ وقت کی نماز کا پابند، نیز قرآن کی قرات پڑھنے میں خاصا کمال رکھتا تھا، بایں ہمہ ایسی لغو اور (بہ تصحیح مترجم) بے ادبی کی حرکتیں اس سے سرزد ہوئیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ ازبک سردار اعظم نہایت دین دار اپنے سنت والجماعت

عقاید میں پختہ تھا۔آل تیمور کو جو اس کے ہاتھ پڑا، بے شبہ اس نے قتل کرایا۔ ورنہ وہ رحم دل آدمی تھا۔اس کے راسخ العقیدہ سنی ہونے ہی کے باعث ہم دیکھیں گے کہ آئندہ تقدیر کی ستم ظریفی نے بابر کو سخت پریشانی میں ڈالا۔ دوسرے، ایسی کسی کمزوری یا عیب کی وجہ سے نہیں، بلکہ فی الواقع شیبانی خاں کی غیر معمولی قابلیت، تنظیم، سلطنت کی بے باک حوصلہ مندی وہ اوصاف تھے جن سے بابر اتنا خائف تھا کہ اور کسی سے اتنا خائف نہ تھا۔تیمور کے خانوادے میں وہی آخری فعال شہزادہ رہ گیا تھا اور اس سے اپنے سخت خطرے میں ہونے کی حقیقت کو وہ خوب سمجھتا تھا۔

1507ء کے وسط گرما میں کچھ مدت اسے شیبانی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ازبکوں کا سیلاب ایران کی جانب پھیلتا معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ مشہد میں جمع ہو رہے تھے۔لیکن خود شیبانی جنوب کی طرف حرکت میں تھا۔اس نے یہ غلطی نہیں کی کہ پہاڑوں کے دشوار گزار دروں سے جس طرح ہو سکے گزر کر کابل کا راستہ لیتا۔جیسی پچھلے جاڑوں میں بابر نے کی تھی۔ بلکہ اس نے وادی کی شاہراہوں سے قندہار کا رخ کیا۔

بے حساب اموال

بابر کو سازشیوں کے جال دکھائی نہ دیتے تھے اور دوسری طرف اتفاقی اسباب نے بھی اسے قندھار کی جانب کھینچنا شروع کیا۔دراصل وہ اس قسم کی ترنگ میں آیا ہوا تھا۔جس کے بعد اکثر ٹھوکر کھانی نصیب ہوئی۔ ہرات کے شکست خوردہ لشکر کی بہت سے فراری معصومہ بیگم کے ہم رکاب آئے اور بابر کے لشکر میں بھرتی ہو

گئے۔اور جنگ آزماؤں نے بھی جنہیں ازبکوں کے بڑھتے ہوئے تسلط سے بچنے میں کسی سردھرے کی تلاش تھی اس کے اردو کا رخ کیا۔جیسے پہلے خسروشاہ کی ولایت میں ہا تھا، یہاں بھی بہت سے لوگ مایوس ہوکر ازخود اسی کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔اس عرصے میں وہ اعلیٰ درجے کا سردار مشہور ہو چکا تھا، کہ اپنے آدمیوں کی خبر گیری کرتی ہے۔ رعایا کو مزروعہ اراضی جیسی کچھ بھی ''ارض قابیل' میں میسر ہو، عنایت کرتا ہے۔اپنی ذات کے واسطے بہت کم چاہتا ہے۔کھوہ میں پناہ لینے کی بجائے رفیقوں کے ساتھ طوفان برف وباد میں باہر بیٹھ کر ٹھٹھرتا رہتا ہے۔اس کی جواں مردی اور فیاضی پہلے سے معلوم تھی۔ خصوصا سپاہیوں کے ساتھ۔اور اس کی اقبال مندی کا بھی لوگ اعتقاد رکھتے تھے۔نئ فوج میں ترخان، مغول، نیز، ''اردس'' (روسی) نام سنے جارہے تھے۔اس معجون مرکب کو گرمیوں میں فوجی تربیت دیتا ہوا خوشی خوشی قندھار کو چل پڑا۔

قندھار، ہرات کے سلطان حسین میرزا بایقرا کی سلطنت کی ایک ولایت تھی۔ اس کا آخری والی، جیسا کہ بیان ہوا، ازبکوں کی جنگ میں مارا گیا۔شہر کابل کی پہاڑی حدود کے جنوب میں رود ہلمند کے کنارے ہندوستان اور مغرب کی کارروانی شاہراہ پر واقع تھا۔اس کے برج وبارہ اچھے نہ تھے۔مگر اس کے راستوں پر عرب، ہندی، یہودی سوداگروں کے قافلے برابر چلتے رہتے اور ہندوستان کی قیمتی اجناس۔ نیل، مصالحے۔شکر، ہاتھی دانت، جواہرات وغیرہ لاتے تھے۔رئیسوں، بادشاہوں کی باہمی لڑائیوں میں بھی ان قافلوں کو کوئی نہ ستاتا تھا۔ایک غیر مکتوبہ قانون، پھر

شریعت اسلامی کا قطعی قانون ملکیت ان کی حفاظت کا ضامن تھا۔ بابر نے بھی اپنے لشکر کو ایسا قافلہ لوٹنے سے روک دیا اگر چہ سوداگروں سے ایک عشر لے لیا تھا۔ ازبکوں کی طغیانی میں بہت سے قافلے ہرات یا مشہد نہیں جا سکے اور زیر نظر زمانے میں قندھار کے آس پاس پلٹ آئے تھے۔ مجموعی طور پر شہر سونے کی چڑیا نظر آتا تھا۔

قندھار پر وقت کے وقت شاہ بیگ ارغون اور مقیم جسے بابر نے کابل سے نکالا، متصرف ہو گئے تھے (47) بابر نے باور کر لیا کہ ارغون بھائی اس کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتے ہیں اور حسب معمول شتاب کاری سے ایک دم چل پڑا کہ ان سے مل کر ازبکوں کے مقابلے کی تیاری کی جائے۔ لیکن حقیقت میں انہوں نے ہرات کے فاتح کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ بابر نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو ارغونوں نے کورا جواب دیا اور وہ بھی اس طرح گویا کسی ماتحت کی عرضی کا جواب ہو۔ بر آشفتہ ہو کر بابر نے کوچ کی رفتار تیز کی۔ اتنے میں ہراول کے سردار نے مطلع کیا کہ ارغونوں کے پاس فوج کی تعداد کہیں زیادہ ہے وہ راستہ روک کر جنگ کے لئے صف بستہ ہیں۔

اس کے بعد بابر کا ایک اور بے تحاشا معرکہ ہوا۔ اس کے سپاہی سخت منزل چل کر آئے اور آدھے کے قریب غلہ، بھیڑ بکری، نیز پانی لینے منتشر ہو گئے تھے۔ مگر ایک ہزار سوار جو گرد تھے اور وہ انہی کو لے کر قندھار کی صفوں پر بڑھا۔ اس مرتبہ اس کے سپاہی دس دس، پندرہ پندرہ کے پیوستہ جوقوں میں مرتب اور آزمودہ کار سرداروں کی قیادت میں تھے جنہیں معلوم تھا کہ کس طرح لڑنا ہے، علاوہ ازیں اب کے بابر نے بھی مغلوں کی جنگی چال سے کام لیا کہ دائیں بازو کو بہت آگے بڑھا کے اس

طرح گھمایا کہ دشمن اس کی لپیٹ میں آ گیا۔لڑائی جم کر ہو رہی تھی ۔یہاں تک کہ یہ تیز پا دائیں بازو والے ارغون کے قالب لشکر میں گھستے چلے آئے اور وہ بکھر کر شہر کی طرف پسپا ہوا۔بابر نے اس موقع پر (بہ تصحیح مترجم) مشہور آیہ کریمہ "کم من فئتہ قلیلتہ غلبت فئتہ کثیر ۃ باذن اللہ" نقل کی ہے لیکن قندھار کی یہ جنگ اس نظم کی بدولت جو اس نے نافذ کیا اور بہ حیثیت سپہ سالار اس کی مہارت سے حاصل ہوئی۔فتح کا ثمر بھی ایسا ملا کہ دیکھا کیجئے۔اس دولت مند تجارتی شہر کے خزنوں میں بے شمار چاندی کے سکے بھرے تھے انہیں بوریوں میں بھر بھر کر گدھوں اور اونٹوں پر لادا گیا۔بابر نے مزا لے کر لکھا ہے کہ وہ لڑتا ہوا مقیم کے خزانے پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک عزیز پہلے سے وہاں گھوڑے سے کود کر گھس رہا ہے۔بازاروں ،منڈیوں سے قیمتی سامان الگ ہاتھ آیا۔بابر بالا دوی کے لئے چلا گیا تھا۔شہر کے دروازے کے باہر سبزہ زار میں پڑاؤ تھا۔واپسی پر اس کی ہیئت بدل جانے کی کیفیت تحریر کرتا ہے کہ "میں ذرا دیر سے فرودگاہ میں داخل ہوا تو لشکر گاہ کی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔ ہر طرف اچھے اچھے گھوڑوں کی قطاریں اونٹ اور خچر لدے پھندے کھڑے تھے۔ بیش قیمت خیمے،شامیانے فرش فروش کے ڈھیر لگے تھے (ارغونوں کے) خزائن سے پارچے کے گٹھے اور چاندی ک سکوں کے بھرے ہوئے تھیلے کثرت سے ملے۔ ہمارے ہر آدمی کے ڈیرے میں خود اس کا حاصل کردہ مال غنیمت تھا۔بہت سی بھیڑ بکریاں لائی گئی تھیں مگر ان کی کی طرف کسی کو توجہ نہ تھی۔"

مالا مال ہو جانے والا پڑاؤ جلد ہی اٹھا لیا گیا۔قاسم بیگ کے اگرچہ پیشانی پر

زخم آیا تھا، مگر بابر پر اس نے زور دیا کہ فوراً کابل واپس چلو۔ اس نے حجت کی کہ شکست خوردہ جوق نواحی علاقے میں کثرت سے موجود ہیں۔ اور ازبک بھی اب زیادہ دور نہ ہوں گے۔ ہمیں کابل کے کوہستانی حصار کی پناہ لینے میں ہرگز تاخیر نہ کرنی چاہئے۔ غنیمت ہے کہ وفادار قاسم بیگ کی عرض معروض بابر نے مان لی۔ لکھتا ہے کہ ''اموال وخزائن کے بھاری بوجھ لے کر عزت و نام آوری کے ساتھ ہم واپس روانہ ہوئے۔ ان کلمات میں رجائیت کا دخل کم تھا۔ قندھار کی حکومت کے لئے ناصر میرزا کو مقرر کیا گیا کہ اس سے بدتر انتخاب دوسرا نہ ہوسکتا تھا۔ حالانکہ بابر کا یہ علاقی چھوٹا بھائی محفوظ اور تالیف قلوب کئے ہوئے بدخشاں کو بھی نہ سنبھال سکا تھا۔ چند ہی روز میں اور کابل کے راستے ہی میں یہ تشویش ناک خبر ملی کہ شیبانی نے آکر قندھار کو گھیر لیا ہے۔ اس وقت قاسم بیگ کے انتباہ کا بابر دوبارہ شکر گزار رہوا۔

کابل پہنچتے ہی اعیان و امرا کی مجلس مشاورۃ طلب کی گئی کہ اب کیا کیا جائے؟ قاسم بیگ کی رائے تھی کہ کابل کے مورچے ناقص اور ایک میدان میں وہ سب سے الگ واقع ہے اس کی مدافعت نہ ہوسکے گی۔ ہمیں بدخشاں کے پہاڑوں میں ہٹ جانا چاہئے۔ بابر کو اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ صورت حال کو اس نے زبانی یا کم سے کم اپنی کتاب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ''ہمارے دشمن اور اغیار ازبکوں کا امیر تیمور کی اولاد کے جملہ ممالک پر اب قبضہ ہو چکا ہے۔ ترک ومغول (چغتائی) قبائل جو ادھر ادھر بعید گوشوں میں ہیں، وہ بھی طوعاً و کرہاً ازبکوں سے مل گئے ہیں۔ میں تنہا کابل میں رہ گیا ہوں اور ایسے طاقتور دشمن کے مقابلے میں اتنا کمزور ہوں کہ نہ صلح کی

شرائط (حسب مراد) طے کرانے کی گفتگو کے ذرائع رکھتا ہوں اور نہ اتنی جمعیت کہ جم کر لڑسکوں۔ایسی طاقت سے بچنے کے واسطے لامحالہ کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی چاہئے کہ ہمارے اور ایسے قوی دشمن کے درمیان کافی فاصلہ حائل ہو جائے۔ایسی جگہ بد خشاں اور ہندوستان نظر آتے ہیں۔انہی دو میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا ہوگا۔''

بابر کی اپنی مرضی ہندوستان جانے کی تھی۔صورت حال کی جو کیفیت اس نے لکھی وہ بالکل درست تھی۔مگر ہندوستان کی رائے دینے سے پتا چلتا ہے کہ دس برس میں بابر کتنا بدل گیا تھا۔کیونکہ پہلے وہ غالباً اسی کو ترجیح دیتا کہ پہاڑوں میں پناہ لے کر موقع کی تاک میں رہے اور جب وقت آئے حملہ کر کے پانسہ پلٹ دے۔قاسم بیگ کا مشورہ یہی تھا۔اندازہ ہوتا ہے کہ اس لمحے کابل میں بابر پر شیبانی کا خوف غالب آ گیا اور شاید عمر بھر میں یہی ایک موقع تھا جب کہ خوف نے اسے بے تحاشا بھاگنے پر آمادہ کیا۔مزید خرابی یہ سمجھے کہ اس نے ولایت بدخشاں خان میرزا جیسے بے اعتبار آدمی اور اس کی سازش پسند نانی کے اور خود شہر کابل ایک دوسرے عزیز (عم زاد) عبدالرزاق کے سپرد کر دیا۔یہ وہ عزیز تھا جو مقیم ارغون کے خزانے پر دوڑ کر اس سے پہلے جا پہنچا تھا۔

ان غلط فیصلوں کا بہت جلد بابر کو خمیازہ بھگتنا پڑا۔خیبر کی تنگ گھاٹی میں دریا کے کناروں پر جو افغانی قبائل تھے، وہ اس کے مارا مار کوچ کرنے کو سمجھے کہ کابل چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔بدقسمت باقی (چغتائی) پر جو افتاد پڑی تھی، اسی طرح بابر کے لشکروں پر پڑی کہ افغانی لٹیروں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح لشکر پر جھپٹنا شروع کیا۔سردیاں سر پر آ رہی تھیں اور اس مختصر فوج کے پاس سامان رسد کی کمی تھی۔

سپاہیوں کو خواہی نخواہی چھاپے مار کر قبائلی بستیوں سے غلہ حاصل کرنا پڑا۔ بابر سچائی سے اقرار کرتا ہے کہ ”ہم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کدھر جائیں گے، کہاں ٹھیریں گے اور پڑاؤ لگائیں گے بس اوپر نیچے کوچ کر رہے تھے اور نئے نئے مقامات پر خیمے ڈال کر منزل کرتے تھے۔ کان خبروں پر لگے ہوئے تھے۔“

ہندوستان کے گرم میدانوں تک پہنچنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اس درے میں جسے پناہ گزینوں نے ”بادپیچ“ سردی سے ٹھٹھر گئے۔ ایسی قریب قریب مایوسی کی حالت میں بھی بابر کی ہمت افسردہ نہ ہوئی۔۔ شاید جنگ چپاولی کی یاد تازہ ہوگئی اور یہ خیال کہ اس سے بھی بدتر زمانہ دیکھ چکا ہے۔

اسی اثنا میں افغانستان کی جنوب مغربی پہاڑوں سے جو خبریں آئیں، وہ خوش آئندہ تھیں۔ شیبانی خاں (بہ تصحیح مترجم) کابل ایک طرف، قندھار کے محاصرے سے بھی دست بردار ہوگیا۔ اس کے وسیع الحدود شمالی علاقوں میں ازبکوں کی ایک بغاوت سے خود اس کے اہل وعیال ضغطے میں پڑ گئے یہ ہوا کہ سارا خوف زائل اور اپنی مملکت کی، اگرچہ چھوٹی سی ہو، سلامتی کا اطمینان ہوتے ہی ایک نیا خیال سوجھا جس میں تازہ امیدوں کے ساتھ دشمن کو چڑانے کا بھی پہلو تھا۔ لکھتا ہے ”میں نے حکم دیا کہ آئندہ لوگ مجھے ”پادشاہ“ کے لقب سے یاد کریں۔“ یہ لفظ یورپ والوں کے ”ایمپرر“ کے مشابہ ہے یعنی شاہنشاہ، اگرچہ اس میں وہ معنویت نہیں ہے۔ بہر حال کسی تیموری فرماں روا نے اسے اپنے لئے نہیں استعمال کیا تھا۔ ان سے بہت پہلے ایشیا کے بڑے خان اسے اپنے القاب میں شامل کر لیتے تھے۔ اس میں دوسرے فرماں رواؤں پر

حکمرانی کرنے کا پہلو نکلتا ہے حالانکہ اس وقت بابر ایسی قوت و سلطنت نہ رکھتا تھا۔ واقعتاً کوئی ''پادشاہ'' تھا تو فتحمند شیبانی خاں اور شاید اسی سے دعویٰ ہمسری جتانے کے لیے بابر نے اسے اختیار کیا۔ اس نے اپنے ذہن میں جو بھی اسباب سوچے ہوں، آئندہ برابر اس لقب پر قائم رہا۔ انہی دنوں کابل میں اس کے ہاں فرزند پیدا ہوا۔ یہ بچی فال نیک تھی۔ لکھتا ہے ''اس کا نام ہمایوں (مبارک) رکھا گیا۔ ولادت کے چوتھے یا پانچویں دن اس خوشی کا جشن منانے میں چار باغ میں آ گیا۔ وہیں چھوٹے بڑے امرا نے نذریں گزاریں۔ چاندی کے اتنے سکوں کا ڈھیر جمع ہو گیا کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ جشن بڑی دھوم دھام سے ہوا۔''

(انگلستان کے) رچرڈ کی طرح پھر بابر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

''میں آہنی دروازے تک گیا تھا''

کوہستان میں بہار آ گئی تھی۔ خانقاہ ''خواجہ سیاراں'' کے آس پاس پھول کھل رہے تھے۔ قلعے کے شمالی دریچوں سے ٹھنڈی ہوائیں آنے لگی تھیں۔ ہمایوں اور اس کی ماں ماہم دونوں زچگی میں بخیر و سلامت رہے۔ سال نو آنے والا تھا۔ ادھر نیا خزانہ دار مقرر ہوا جس کی نگرانی کی بدولت پہلی مرتبہ کابل کا خزانہ معمور تھا۔ غرض خود ساز پادشاہ کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا تھا اور کوئی بدفالی کی بات سننی نہ چاہتا تھا۔ حقیقت میں ہمارے لئے آج ساڑھے چار سو برس بعد ان خطرات کو دیکھنا آسان ہے جن میں بابر گھرا ہوا تھا۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ جب کابل سے مارا مار روانہ

ہوا تو اپنی جبلی فیاضی سے بابر نے کابل کی حکومت عبدالرزاق کے سپرد کردی تھی جو اس کے رشتے کے چچا، اور سابق والئ کابل الغ بیگ کا بیٹا تھا۔ الغ بیگ کی حکومت میں سخت ابتری رہی مگر بہر حال وہ فرماں روا، اور اس کا فرزند وراثت کابل کا جائز حق دار تھا۔ قندھار میں بابر نے عین وقت پر پہنچ کر عبدالرزاق کو بھرپور خزانے سے محروم کیا اور صرف "کسی قدر" اسے دے دیا۔ علیٰ ہذا اب خطاب پادشاہ کے ساتھ کابل آ کر اس شہر کی حکومت عبدالرزاق سے واپس لے لی۔ انہی وجوہ سے عبدالرزاق نے بے پروا بابر کو نکال باہر کرنے کی سازش پکائی مگر بڑی حزم واحتیاط سے یہ کام کیا۔

بابر کی قلیل سپاہ میں دو ہزار کے قریب مغول کا گروہ تھا جسے عبدالرزاق نے اپنا آلہ کار بننے کے قابل پایا۔ واضح رہے کہ بابر نے فوج کو سختی سے نظم وضبط کا پابند بنایا تھا اور وہ سپاہیوں کو لوٹ مار کی مطلق اجازت نہ دیتا تھا۔ اہل فوج کی لوٹ مار پسند تھی، خصوصاً نا تربیت یافتہ مغلوں کو جنھوں نے مال دار غاصب خسرو شاہ کی ملازمت میں شریک ہونے کے وقت سے اپنا الگ جتھا بنایا اور وہ ابھی تک قائم تھا۔ خان میرزا کی ناکام بغاوت میں بھی اکثر مغل شامل ہو گئے تھے۔ اب ان کے کانوں میں پھر پھونکا جانے لگا کہ عبدالرزاق بادشاہ ہو گیا تو بھرپور خزانے کی تھیلیوں کے منہ پھر کھل جائیں گے، بابر کے سخت ضوابط کی پابندیاں ختم ہو جائیں گی اور قندھار سے لے کر بدخشاں تک سارے ممالک سے محاصل وصول کیے جائیں گے۔ فوج کی چھاؤنی شہر کے باہر تھی۔ مغلوں کے سوا دوسرے سپاہی اکثر شہر کے گلی کوچوں میں اہل وعیال میں یا ادھر ادھر منتشر تھے۔ پھر خود بابر ایک افغانی قبیلے کی تادیب نیز رسد

رسانی کی تاخت کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اس موقع پر جو کچھ پیش آیا وہ اسی کی زبان سے سنئے :۔

''اس بہار میں مہمند افغانوں کی ایک (بہ تصحیح مترجم) بستی پر تاخت کی گئی۔ واپس آنے کے چند روز بعد معلوم ہوا کہ چند سردار بھاگ جانے کی سوچ رہے ہیں ۔ایک مضبوط جمیعت انہیں پکڑلانے کے لئے بھیجی گئی اوراس نے انہیں استرغچ کے آگے جالیا۔ ان فراریوں کی باغیانہ باتیں جہانگیر میرزا کی زندگی میں سنی گئی تھیں۔حکم دیا کہ انہیں بازار کے دروازے پرقتل کر دیا جائے۔وہ رسیوں میں باندھ کروہاں لے جائے گئے اورسولی پر چڑھائے جانے والے تھے کہ قاسم بیگ نے خلیفہ کوبھیج کرالتجا کی کہ ان کی خطا معاف کردی جائے ۔(خلیفہ نے گزشتہ سال قلعہ کابل کی دفاع میں حصہ لیا اور بابر کی ایک رضاعی بہن سے اس کی شادی ہوئی تھی) قاسم بیگ کی خاطر سے میں نے جان بخشی کردی مگرانہیں قید میں رکھا۔

اب خسروشاہ کے (سابق) سپاہیوں اورمغل سرداروں نے ترکمان سے سازباز کی ۔ان کا ترغنہ سیوندوک تھا۔(قندھار کے معرکے میں یہ بابر کی طرف سے بہادری سے لڑا تھا) پھر ان سب نے مجھ سے بدخواہی پر کمر باندھی۔ یہ لوگ سنگ قورغان کے مرغزار میں تھے ۔عبدالرزاق دوسری طرف سے افغانی بستی میں آگیا تھا۔

چند روز پہلے محبّ علی قورچی نے خلیفہ اور ملابابا نے ان لوگوں کی ملی بھگت کا دو ایک دفعہ ذکر کیا اور انہوں نے مجھ سے اشارۃً کہہ دیا تھا لیکن یقین کے لائق بات نہ تھی۔ میں نے کچھ توجہ نہ کی ۔اب ایک رات چارباغ کی بارہ دری میں بیٹھا تھا کہ

موسیٰ خواجہ اور ایک اور آدمی جلدی جلدی میرے پاس آئے اور کان میں کہا کہ ''واقع میں مغل بغاوت کرنے والے ہیں۔ یہ تحقیق نہیں کہ عبدالرزاق میرزا بھی ان کے ساتھ مل گیا ہے یا نہیں۔ لیکن آج رات کو وہ بغاوت کا آغاز نہیں کریں گے۔''

''پھر بھی میں ٹال گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے زنان خانے کی طرف جو خلوت باغ میں تھا، چلا اور اپنے آدمی (مفسدوں کی ٹولی کے پاس) روانہ کیے لیکن وہ راستے سے لوٹا دیئے گئے اور پہنچ نہ سکے۔ تب میں خود محل سرا کے داروغہ (بہ تصحیح مترجم) غلام سرور کو لے کر خندق کے راستے شہر کی جانب گیا۔ آہنی دروازے تک گیا تھا کہ بازار کی گلی سے خواجہ محمد علی (ہمایوں کی ماں ماہم کا بھائی) آتا ہوا ملا۔ وہ بھی ساتھ ہو لیا۔ حمام کی ڈیوڑھی کے قریب ......

یہاں پہنچ کر تزک کا سلسلہ دوبارہ یکا یک ٹوٹ گیا ہے اور پورے گیارہ سال تک کوئی حال لکھا ہوا نہیں ملتا۔ جہاں تک معلوم ہے کسی مخطوطے میں، اصلی ہو یا جعلی ،اس خلا کو بھرا نہیں گیا۔ البتہ دوسرے مورخ ،خصوصاً نوجوان میرزا حیدر دوغلات 1508ء کے اس فساد کابل کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں واضح ہو کہ میرزا حیدر دوسرے سال کابل پہنچا تھا۔ اس کی عمر گیارہ برس کی تھی مگر اس نے ضرور عینی شاہدوں سے فساد کے حالات سن کر محفوظ رکھے ہوں گے۔

القصہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر جو حسب عادت بے پروائی سے بغیر مسلح پاسبانوں کے عاجلانہ شہر کے اندر آیا ،قریب تھا کہ آہنی دروازے کے اندر گرفتار ہو جائے ،مگر کسی طرح بچ کر نکل گیا۔ تاہم اس کو دیکھ کر باغیوں نے ارادہ کر لیا کہ جو کچھ کرنا ہے

فورا کر گزریں۔ شورش گلی کوچوں میں اتنی پھیل چکی تھی کہ وہ اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ ادھر چھاؤنی کے بازار کو جا کے دیکھا تو لٹ رہا تھا اور وہاں کے جوان مضطربانہ، بغیر کسی سردار و حاکم کے ادھر ادھر منتشر ہو رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ باغی مغلوں سے لڑیں یا ان کے ساتھ ہو جائیں۔ بچ کر نکلیں یا شہر میں جا کر بال بچوں کی خبر لیں۔ اس پراگندہ نفری سے بابر نے پانسو وفادار سپاہیوں کو فراہم کر لیا۔ اگلے دن دوسرے امرا اور سردار آ ملے۔ بظاہر بیرونی چھاؤنی پر باہر کے حامی قابض رہے اور باغیوں کے ہر اقدام کا جواب دیا۔ اب میرزا عبدالرزاق علانیہ بغاوت کا سرغنہ بن کر سامنے آیا اور پتا چلا کہ اس تحریک کے اکسانے میں شکست خوردہ ارغونوں میں حصہ تھا، جو اب دوبارہ قندھار کے حاکم ہو گئے تھے۔

ایک روز وفاداروں کی قلیل جمعیت باغیوں کی پوری فوج کے سامنے صف آرا ہوئی۔ حیدر میرزا لکھتا ہے کہ یہ بابر بادشاہ کے سب سے بڑے معرکوں میں ایک معرکہ تھا جس میں بابر نے عبدالرزاق کو للکارا کہ آئے اور تنہا اس کے ساتھ لڑے۔ اس کے محتاط حریف نے انکار کیا اور خود لڑنے نہیں نکلا البتہ باغیوں میں سے پانچ جنگ آزما الگ الگ لڑنے آئے اور بابر نے اس کرشمہ خیز جنگ یک یکی میں پانچوں کو مار گرایا یا گھوڑے پر سے گرا لیا۔ ہرچند یہ روایت بعد کا افسانہ شجاعت معلوم ہوتی ہے لیکن حیدر میرزا نے پانچوں مغلوب ہونے والے مبازرین کے نام تحریر کیے ہیں۔ بابر کا ہٹیلا پن اور دست بدست جنگ میں صفائی سے اپنے کو بچا لینے کا ہنر بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ ادھر حریفوں کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف

اقوام کے نمائندہ تھے اور قیاس کہتا ہے کہ ایسی سراسیمگی میں کہ کچھ بنائے نہ بنتی تھی، ہر گروہ نے ایک ایک شہسوار چن کر مقابلے میں بھیجا تھا۔ جملہ قرائن کے پیش نظر ہم حیدر میرزا کی روایت کو قبول کر سکتے ہیں۔

بابر کا اس طرح جان پر کھیل کر ڈٹ جانا بے اثر نہ رہا۔ اخلاقی طور پر عبدالرزاق میرزا بازی ہار گیا تھا اور زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ پکڑ لیا گیا۔ لیکن حیدر میرزا یقین دلاتا ہے کہ "اس کے ساتھ عفو و درگزر سے کام لیا اور رہا کر دیا گیا۔"

وقائع سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرمیوں کے ختم تک کابل میں امن و امان قائم ہو گیا۔ یہی ایام تھے جن میں فتح مند شیبانی خاں نے اپنے ممالک میں نسل تیمور کا بالکل استیصال کر دینے کی ٹھانی۔ اسی تطہیر میں حسین میرزا دو غلات قتل کیا گیا۔ صرف چند لڑکے جن میں حیدر میرزا بھی تھا، بدخشاں کے برفانی پہاڑوں سے گزر کر کابل، دربار بابری کی پناہ میں آ گئے۔ پھر یہی زمانہ ہے جب کہ بادشاہ کا لقب خود پاسپان کر لینے والے بابر کی حکومت کا بیرونی ملکوں کے معاملات میں نام آنا شروع ہوا۔ مغربی ایشیا کے وسیع تر مجادلات کی تشکیل دربار کابل کے گرد ہونے لگی، ایک نیا خانوادہ شاہی ظہور میں میں آیا اور بابر پر شیبانی کے چھٹکی مارنے کی کوششیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ واقعی یہ تقدیر کا عجیب کرشمہ اور پہلا موقع تھا کہ بابر جو کابل کے کوہستانوں کے غلاف میں دبکا بیٹھا تھا، اسے ان واقعات نے نفع پہنچایا جو خود اس کی دسترس سے باہر تھے۔

باب پنجم:: بابر کی جدال اپنی رعایا سے

نیم تاریک بھول بھلیاں (49)

سچا تصوف بند آنکھوں والی سادگی سے آتا ہے۔ سینٹ فرانسس کا عشق، سینٹ ٹریسا کی وارفتگی میں کوئی ذہنی خلش نہ تھی۔ یتیم پیغمبر اسلام (صلعم) کا رات کے اندھیرے میں آسمان پر روشنی دیکھ کر شیفتہ ہو جانا بہت سادہ واقعہ تھا۔ ظلمت میں نور...... ایک تنہا جان اور اس کا واحد خدا۔

لیکن الفاظ، خیالات لاتے ہیں اور اشارات، افکار کی شرح سناتے ہیں۔ پس روحانی عقائد یا تصوف کا بیان کرنا ایک دلکش معما بن سکتا ہے۔ ایشیا کے بزرگ صوفیہ میں رومیؒ لکھ سکتا ہے کہ ''عشق آسمان کے نورانی دروازے سے ندا دے رہے ہیں۔'' عمر خیام سناتا ہے کہ ''میں وہ شاہین ہوں جسے آسمان پر چھوڑا گیا ہے کہ قضاو قدر کی لوح کو جھپٹ لاؤں'' اور حافظ خود اپنے فکر کی پیروی میں پکارتا ہے کہ ''اس بلند نگاہ باز کا آشیانہ عشق ہے۔ خدائے عرش کے کنگوروں سے اسے واپس آنے کی صغیر سنائی دیتی ہے۔''

ان شعرا نے اپنے معتقدین کے افکار کی رہنمائی اس وقت شروع کی جب کہ کئی کئی نیم تاریک راہیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرتی تھیں۔ ان میں سے اکثر شیعہ یا تفریق پسند لوگ مذہب راسخہ، سنت والجماعت کے مخالف تھے۔ (50) پیغمبر

اسلام (صلعم) نے جو سادہ مذہب منکشف کیا وہ پڑھی جانے والی کتاب (کتاب مثانی ؟ مترجم) میں ملفوظ ہوا۔ لیکن معاملات انسانی سے متعلق اس قرآن کی تعبیر کے لئے احادیث قلم بند کی گئیں۔ شریعت نے ضوابط حیات متعین کئے اس خدائے پاک کی مرضی کے مطابق، جو خود دنیا سے بے حساب بعد رکھتا تھا۔ بخلاف اس کے صوفیہ سینٹ فرانسس کا سا عقیدہ، قرب خدا کا رکھتے تھے۔ علی عذ انسطوری عیسائیوں کی طرح جن کے گرجے اسلامی ممالک میں جا بہ منتشر تھے وہ مسیح جیسی فطرت کے امام کے ظہور کے بھی معتقد تھے۔ پھر صوفیوں میں اسی قسم کے "طریقے" بنے۔ خصوصاً نقش بندیوں میں جیسے سینٹ فرانسس کے گداگر درویشوں کا گروہ تیار ہوا تھا۔ ان (مسلم) درویشوں کو کبھی کبھی لوگ ستاتے تو وہ اخفا کا طریق اختیار کر لیتے اور اپنے روحانی مرشدوں کو "ایشاں" کے رمزی خطاب سے یاد کر کے ان کی پیروی کرتے تھے۔ عالی خیال خواجہ (عبید اللہ) احرارؒ ان عابد زاہد یا صوفی بزرگوں کے مرشد اعلیٰ تھے بابر ان سے کمال عقیدت رکھتا تھا اور ان کے مریدوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ شروع میں جس کام کا ارادہ کرتا تو پہلے ان جہاں گرد درویشوں سے اسے بیان کرتا تھا رہبانیت پسند میر علی شیر علی جسے خلاف طبع ملک داری کے میدان میں آ پڑا، غالباً ایسا ہی صوفی اور حضرت جامیؒ کا دوست دار تھا۔ بابر بھی یقیناً ان کو بہترین سالک شاعر جانتا تھا۔ سنت والجماعت قیدہ رکھنے کے باوجود جامیؒ صوفی تصورات کے پیرو ہو گئے تھے۔ ممکن ہے بابر نے بھی اسی قسم کا مذہب اختیار کیا ہو۔ اعمال ظاہری میں وہ شریعت کی پوری پابندی کرتا تھا۔ مگر اس کا بھروسہ ہمیشہ خدائے حاضر و ناظر پر

ہوتا۔ اسے ریاکاری نہ آتی تھی لہذا جب وہ کہتا ہے کہ میری زندگی کے واقعات کی مشیت الٰہی نے تشکیل کی، تو وہ حقیقت میں ایسا ہی سمجھتا تھا۔ البتہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا جانے وہ کس حد تک ظاہری رسوم، طہارت، اکل وشرب اور نماز کو نصرت الٰہی کا ذریعہ خیال کرتا تھا۔ جو اس کی دلی آرزو کے مطابق دنیا کے جھگڑوں میں بھی اسے تقویت دے گی۔ اس کا ذہن اینچ پیچ نہ جانتا تھا اور وہ بلا قیل و قال رسوم کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا۔ حضرت رومیؒ کی تلقین کہ خدائے قاہر کے حضور میں ایسی ظاہری رسمیں کوئی وقعت نہیں رکھتیں، بابر کے فہم سے بالا تھی۔ ہاں آگے چل کر اس نے دونوں کے بین بین خود ایک صورت نکال لی تھی اور اپنے آپ کو ہنس کر ''درویش بادشاہ'' کہا کرتا تھا۔

لیکن خود کو بادشاہ ملقب کرنے کے بعد دس برس تک اس کی زندگی اپنے سے کم عمر ایک اور شخص کے زیر اثر رہی، بلکہ کہنا چاہئے کہ ڈھلتی رہی...... جو ہر اعتبار سے درویش اور بادشاہ تھا۔ 1501ء میں یہ مجہول الاحوال سا نوجوان اسمٰعیل صفوی اور امیر تیمور کی سابقہ سلطنت کے مغربی اقطاع میں شاہ ایران موسوم ہوا تھا۔

ایران (یا فارس) کہلانے والے خطے کا کسی ایسے خیالی منصوبے بنانے والے کے ہاتھ میں آ جانا لائق تعجب بات نہ تھی۔ جن دن سے خاندان کیانی کے کورش (کیخسرو) نے بابل ونینوا کے سامی دیوتاؤں کا تختہ الٹا اور اپنے پیغمبر زرتشت کے تبلیغی دین کا حلقہ بگوش ہوا، اسی وقت سے ایران تصوف یا باطنیت کا گہوارہ بن گیا تھا۔ رومہ کے جیوش جس طرف گئے فتح سے ہمکنار ہوئے لیکن نہر فرات کے پار

مشرقی مذاہب کے ملکوں کو کبھی مغلوب نہیں کر سکے۔ ظہور اسلام کے بعد یہاں خلافت کا تسلط قائم ہوا تاہم مرورِ وقت کے ساتھ عباسیوں کی خلافت بغداد ایرانی شیعیت کے مذہبی اثر کے تحت آ گئی۔ تصوف یا باطنیت بالطبع پابند مذہب حکومت سے انحراف کرتی ہے۔ خواہ بغاوت کے ذریعے ہو خواہ تبلیغ و دعوت سے۔ بازنطینی سلطنت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انطاکیہ، سکندریہ، یوروشلم کے مشرقی کلیسا بغاوت کر رہے ہیں اور راسخ العقیدہ قسطنطنیہ بزور شمشیر انہیں دبانا چاہتا ہے۔ جسٹی نین جیسے پابند مذہب شہنشاہوں کی مسلح فوجیں باغی راہبوں کو مشرق کی طرف بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں لیکن ان کی بغاوت کو فرو نہیں کر سکتیں۔

یہ صحیح ہے کہ سنت والجماعت مذہب کے پابند امیر تیمور نے اپنی قوت بازو سے مشرق کے سرکش ممالک کو قابو میں رکھا تھا لیکن حسین میرزا جلد مرا، یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اس کے نکمے بیٹوں کے وقت میں ازبکوں کے خراسان میں ہرات چھین لینے سے تیموری سلطنت کا آخری ٹکڑا بھی تلف ہو گیا۔

مشہد ہاتھ میں آ جانے کے بعد بالکل قدرتی بات تھی کہ شیبانی خاں کے فاتح ازبک مغرب کی ان کی کاروانی شاہراہوں پر آگے بڑھیں جو بحر خزر اور وسط ایران کے اضلاع کرمان کو جاتی تھیں۔ اس پیش قدمی پر نوواردشاہ اسمٰعیل نے باضابطہ احتجاج کیا اور لکھا کہ ازبک ان علاقوں میں گھس آئے جو موروثی حق کی بنا پر میرے ہیں۔ اس دعوے کو سن کر حقیقت پسند شیبانی بھی حیران ہوا ہوگا کہ اس نے ذرا غیر رسمی طور پر پلٹ کر پوچھا ”تمہیں کس وراثت سے یہ حق حاصل ہوا؟“ اور اس کا یہ

سوال کرنا کچھ بیجا نہ تھا۔ اسمٰعیل نام ہی اس وحشت کدے میں سخت اجنبی، پردیسی معلوم ہوتا تھا۔ اس نام کا 21 سالہ نوجوان کوہستان قاف کی بلندیوں سے اتر کر آیا اور مغربی ایران کے ملوک طوائف کو روندتا چلا جاتا تھا۔ وہ ایک امام کی اولاد میں ہونے کا دعوی دار تھا اور اس کی والدی طرابزون کی بازنطینی شہزادی تھی۔ باپ حیدر شیخ تھا۔ ''کالی بھیڑ'' (قرہ قونیلو) اور ''سفید بھیڑ'' (آق قونیلو) والے ترکمان کی خانہ جنگی میں اسمٰعیل نے کامیابی حاصل کی۔ شاید اپنے خیالی منصوبوں کی بنا پر کم از کم دشمنوں کی نظر میں وہ ناقابل فہم، نہایت سفاک اور مذہبی مجنون قسم کا آدمی تھا۔ دور دست پہاڑوں کے نو ترک قبیلے اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور نئے مذہب کے جوش نے ان میں ایسی طاقت بھر دی کہ صفوی ناقابل شکست ہو گیا۔ ان نو قبیلوں کے شہ سوار ''قزل باش'' (سرخ کلاہ) کہلاتے تھے اور ہر طرف ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اپنی ترک تازوں میں یہ مغل ایل خانوں کے سابقہ پایۂ تخت تبریز سے خلفائے عباس کے افسانوی شہر بغداد تک کھوند آئے۔ جنوب مشرق میں اصفہان پر حملہ آور ہوئے جو صفوی بادشاہوں کا پایۂ تخت بننے والا تھا۔ خانوادے کا بانی یہی اسمٰعیل تھا اور یا اس کے باپ شیخ (صفی الدین۔ مترجم) کو قرار دے سکتے تھے۔ ازبکوں کی پیش قدمی پر احتجاج کرتے وقت اسمٰعیل اصفہان ہی میں تھا اور خلاف عادت سکون سے وقت گزار رہا تھا۔ ادھر ازبکوں کے سب سے اگلے قراول جوق اصفہان سے چند روز کی مسافت پر لوٹ مار کر رہے تھے۔

ضمناً یہ بھی لائق ذکر ہے کہ یورپ کے بعض سیاست دان کچھ پہلے سے شاہ

اسمٰعیل کی جانب پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے جیسے وہ سفید بھیڑ والے ترکمان اوزان حسن کے نگران رہے۔ یورپ والوں کی اس خاص توجہ کے کئی معقول سبب تھے۔

سن 1499ء کے قریب، جب کہ اسمٰعیل نے اپنی شاہی کا اعلان کیا، وینس کے سفیر تبریز و اصفہان تک چلتے ہوئے آئے کہ اس جان بلب ''جمہوریہ سنیہ'' کی بری راستوں سے تھوڑی بہت تجارت کی صورت نکالیں۔ علیٰ ہذا پرتگالی بیڑوں نے جو ہندوستان کی مالا مال بندرگاہوں پر آنے جانے لگے، صفوی سے دوستان روابطہ کے لئے اپنے وفد بھیجے، کیونکہ فارس کا ساحل ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ پھر سلطنت عثمانیہ کے یورپی دشمن (The Sophy) کا روز افزوں عروج دیکھ کر ادھر مائل ہوئے۔ کیونکہ ترکان آل عثمان اب قسطنطنیہ کو دارالخلافہ بنا کر یورپ میں برابر آگے بڑھ رہے تھے اور ایران کے شیعی ان سنی ترکوں کے دشمن تھے۔ علاوہ ازیں یورپ کے سوداگروں کی بڑی خواہش تھی کہ صفوی اندرون ایشیا میں انہیں کوئی نیا راستہ فراہم کردے گا۔

لیکن بالفعل اسمٰعیل اپنی مملکت میں نیا انتظام قائم کرنے میں مصروف تھا اور سلطان ترکی جیسے زبردست حریف سے الجھنا نہ چاہتا تھا۔ سلطان بایزید ثانی، سلطان محمد فاتح کا فرزند، باپ کی نسبت بہت نرم خو بادشاہ تھا۔ ہرات کے صاحب ذوق بادشاہ حسین میرزا بایقرا کے ساتھ اس کی دوستان مراسلت رہی۔ اب شعلہ خو اسمٰعیل سے بھی ایسے ہی روابط رکھنے میں اسے تامل نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ

بایزید اپنے دربار کی ادبی زبان فارسی میں خط لکھتا تھا اور اسمٰعیل ایران سے اپنی مادری زبان ترکی میں جواب دیا کرتا تھا۔

ازبک فرماں روا شیبانی یورپ سے دور و منقطع تھا۔ البتہ قازان اور استرخاں کے مغل خانوں سے اس کی مراسلت تھی اور یہ خاں ابھی تک موسکو کے ''گرینڈ ڈیوک'' (امیر) پر سلطانی سیادت رکھتے تھے۔ شیبانی کے قلب ایران میں بڑھ آنے سے شاہ اسمٰعیل کے فالی شیعوں میں سینوں کی طرف سے مذہبی منافرت کی آگ بھی اور زیادہ مشتعل ہوئی اور اس نے ملک ملک میں شدید مذہبی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ 1509ء میں شیبانی اور شاہ اسمٰعیل کی لڑائی چھڑنے کے وقت ہی ایک اور نئی طاقت بھی ایشیا میں نمودار ہوئی۔ یہ پرتگیز تھے جن کے جنگی بیڑے نے دیو (گجرات) کے سامنے مسلمانوں کے ایک بیڑے کو قریب قریب فنا کر دیا۔ یہ بحری سرگرمیاں کابل سے کچھ بہت دور نہ ہوئی تھیں لیکن بابر کو ان کی کچھ خبر نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہی معرکہ تھا جس میں یورپ کی ساختہ توپ اور توڑے دار بندوقوں نے فیصلہ کن حصہ لیا۔ اس قسم کی توپیں عثمانی ترکوں کی فوج میں کارآمد ثابت ہونے لگی تھیں اور اگرچہ خودسر اسمٰعیل انہیں خاطر میں نہیں لاتا تھا، مگر آئندہ سنین میں بابر کا ان سے کام لینا مقدر تھا۔

کابل کے اتنے دور، کٹے ہوئے ہونے کی وجہ سے شیبانی اور اسمٰعیل کی جنگ عظیم کی خبریں بھی وہاں جستہ جستہ نامربوط صورت میں آئیں جنہیں افواہ عالم نے مبالغہ آمیز بنا دیا تھا۔

پہلے دونوں طرف سے تحقیر و تہدید کی باتیں ہوئی۔ شیبانی نے اسمٰعیل کے پاس ایلچی بھیجا، کاسہ گدائی اور عصا تحفے میں ارسال کئے اور یہ پیام کہ اس کے حق میں بہتر ہوگا کہ اپنے باپ کا پیشہ فقر اختیار کرے۔ کرے۔ جواب میں نوجوان صفوی نے سن رسیدہ ازبک کو چرخا اور تکلا بھیجا کہ اگر تلوار کی نوک سے جان چراتا ہے تو اپنی ماں کی سہیلیوں میں زندگی گزارے۔ کیونکہ شاہ مشہد کی درگاہ میں حاضری دینے چل پڑا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ شیبانی سے ملاقی ہوگا۔

1510ء کی گرمیوں میں ازبک سردار اپنے مفتوحہ ممالک کی بزور شمشیر حفاظت کے لئے سرحد پر ہی ڈٹا رہا۔ شمال کے نیم صحرائی علاقوں میں قزق اور جفاکش کرغز کی تاختوں نے بے اطمینانی پھیلا رکھتی تھی اور چین کی بڑی شاہراہ پر ارض مغول میں جہاں بابر کا ماموں فرماں روائی کرتا تھا، اب وہاں خان کوچک نے ازبکوں کا قلاوہ اطاعت اتار کر پھینک دیا۔ شیبانی کو شمال اور مشرق میں بڑی بڑی فوجیں بھیجنی پڑیں کہ اس کا تسلط بحال کریں۔ میرزا حیدر کا بیان ہے کہ اس کی سپاہ میں تاشقند کے بیس ہزار مغل بھی تھے۔ ان کو شیبانی نے جانے کی اجازت نہ دی کہ کہیں اپنے وطن کے قریب پہنچ کر منحرف نہ ہو جائیں۔

اسمٰعیل اور اس کے قزل باشوں کی آمد آمد پر شیبانی دریا کے کنارے شہر مرو میں ہٹ آیا اور وہیں اپنے سپہ سالاروں کی طلبی کے لئے ہرکارے روانہ کئے۔ اس وقت تک یہ ازبک تمام حریفوں کو جنگی چالوں میں نیچا دکھا چکا تھا لیکن اسمٰعیل کے سواروں کا لشکر بے خبر دریا کے پار آ گیا اور ازبک قراول سے چھیڑ چھاڑ ہونے

لگی۔ تین روز بعد قزل باشوں نے شمال کی طرف حرکت کی۔ شیبانی کے سرداروں نے عرض کی کہ جب تک عبید خاں اور تیمور سلطان کے امدادی دستے نہ آ جائیں ہمیں اپنے پڑاؤ کو چھوڑنا نہ چاہئے۔ شیبانی نے نہ مانا اور اپنی کم تعداد فوج کو لے کر ایرانیوں کے عقب میں روانہ ہو گیا۔ پھر جو لڑائی ہوئی اس کی اطلاعات بدخشاں میں میرزا خان کو ملی تھیں اس نے بذریعہ خط بابر کو کابل بھیجیں۔ کس قدر ہنگامہ خیز تھا۔ یہ خط جس میں مرو کے قریب لب دریا ازبکوں کی کامل ہزیمت، شیبانی کے زخمی ہو کر ہلاک ہونے اور اس کے سب بڑے بڑے سپہ سالاروں کے مارے جانے کی اطلاع تھی اور یہ کہ ان خوف انگیز ازبکوں کو تتر بتر کر کے شاہ اسمٰعیل مرو سے ہرات تک جھاڑو پھیرتا ہوا گیا اور بعد میں یہ بھی مشہور ہوا کہ اس نے شیبانی کے کاسہ سر کا پیالہ بنوایا اور سونے سے مرصع کر کے پینے کا کام لیا۔ نیز کھال کھنچوا کے بھس بھروایا اور اس کی عام تشہیر کرائی۔ یہ افواہ تھی، اس کی پوری صحت کا علم نہیں ہوتا۔ مزید برآں خاں میرزا نے لکھا کہ بیس ہزار جنگ آزما جو زبردستی شیبانی کے لشکر میں فتح تاشقند کے بعد بھرتی کئے گئے تھے، اس کے شکست کھاتے ہی الگ ہو کر بھاگتے ازبکوں پر پلٹ پڑے اور انہیں لوٹ لیا (اس پر بابر کو رضو رہنی اور اپنے تجربے یاد آئے ہوں گے) پھر ان مغلوں نے قندز میں خان میرزا کے پاس آ کر درخواست کی کہ بابر بادشاہ کو بلایا جائے۔ پھر حیدر میرزا لکھتا ہے کہ جونہی بادشاہ نے خط کا مضمون پڑھا، کمال عجلت کے ساتھ قندز کو چل پڑا حالانکہ یہ عین وسط سرما کا موسم تھا اور بالائی درے بند تھے۔'' مگر اس وقت تک بابر کو اپنی مملکت زیریں دروں کے راستے بھی

خوب معلوم ہو چکے تھے۔ ازبکوں کی اس مصیبت کبریٰ کو وہ سمجھا کہ سمرقند واپس لینے کا یہ خدا ساز موقع نکل آیا ہے۔

پتھر کے پل پر جنگ اور فتح

اس سفر میں بابر نے نوعمر حیدر میرزا اور سعید خاں چغتائی کو ہمراہ لے لیا تھا۔ کیونکہ ان دونوں نے ساتھ لے چلنے کی منت ساجت کی۔ یہ دونوں سخت بے سرو سامانی میں کابل آئے تھے۔ حیدر تو حسین میرزا کا بیٹا تھا جس نے بابر کے خلاف بغاوت کی۔ شیبانی کے پاس جا کر اس کی ہجو کی لیکن شیبانی ہی کے حکم سے قتل ہوا۔ چغتائی بابر کے چھوٹے ماموں کا واحد سلامت ماندہ لڑکا تھا اور اسے بھی ہلاک کرنے کا شیبانی حکم دے چکا تھا۔ بابر نے دونوں کو جس محبت سے رکھا اس خوش دلی کا وہ آئندہ عمر بھر اعتراف دے چکا تھا۔ بابر نے دونوں کو جس محبت سے رکھا اور اس خوش دلی کا وہ آئندہ عمر بھر اعتراف کرتے رہے۔ حیدر لکھتا ہے "(بادشاہ بابر نے) مجھ سے کہا ذرا غم نہ کھاؤ۔ شکر کرو کہ تم سلامت میرے پاس آ گئے۔ تمہارے باپ اور بھائی کی جگہ میں موجود ہوں...... میرے لئے سخت رنج و غم کا دن تھا۔ جب کہ میرا باپ مارا گیا لیکن اب بادشاہ نے مجھ سے وہی پدرانہ شفقت فرمائی جیسی باپ کرتا تھا۔ جب سوار ہو کر باہر جاتا تو مجھے اس کے پہلو میں چلنے کی عزت حاصل ہوتی۔ میرے درس کا وقت ختم ہو جاتا تو بادشاہ یاد کر کے کسی کو بھیجتا کہ مجھے لے آئے...... جب تک میرا قیام رہا یہی پدرانہ سلوک کرتا رہا۔" سعید خاں نے اپنی شہادت کا

اضافہ کیا ہے: ''کابل کا میرے جو دن گزرے فکر و تشویش سے خالی تھے...... سب لوگوں نے میرے تعلقات دوستانہ تھے اور وہ سب میرے ساتھ مہر و محبت سے پیش آتے تھے۔ کبھی دردِ سر کی بھی شکایت مجھے نہیں ہوئی۔ بجز اس کے زیادہ پی جانے سے سر بھاری ہو گیا ہو۔''

انہی دونوں کے بیانات سے سمرقن کے واقعات واضح ہوتے ہیں۔ قندز میں سب اہل خاندان کا اجتماع ہوا۔ اندرونی اختلافات بھی لازماً سر سراتے رہے۔ پورے مجموعے میں قوت کا توازن مغول کے ہاتھ میں تھا جو اس وقت بغیر کسی سر دھرے کے سرگرداں تھے۔ قدامت پرستی کی بنا پر یہ سخت کوش جنگجو تاشقند کے سابق والی کے بیٹے سعید خاں کے سوا اور کسی کی بادشاہی قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ ان میں خفیہ کام کرنے کا قدرتی میلان تھا چنانچہ سعید خاں سے صیغہ راز میں درخواست کی کہ اپنا موروثی منصب سنبھالے۔ قدم علم کھڑے کر کے مغلوں کی سنت کے مطابق ان کی برکت حاصل کرے اور بابر کو جو پکا مغل نہ تھا، اپنی راہ جانے دے۔ چاہے اس میں لڑائی کی نوبت آ جائے۔ سعید خاں نے یہ پیشکش منظور نہیں کی۔ اس نے کہا ''شیبانی کے سیل بے پناہ میں بابر بادشاہ نے مجھے پناہ دی اور بڑی عنایت سے پیش آیا۔ احکام الٰہی کے خلاف ہے کہ اپنے محسن سے احسان فراموشی کروں۔'' دوسری طرف بابر کو پیام کہلا بھیجا کہ ''خدا کی رحمت سے بہ کثرت لوگ آپ کی سرکار میں واپس آ رہے ہیں۔ خصوصاً مغل قوم جس کی تعداد اور قوت کسی سے کم نہیں اور جس کے دنیا کے بزرگ ترین بادشاہ ہوئے ہیں، وہ بھی آپ کی طرف رجوع ہو رہی ہے

۔ایسے وقت میں میرا آپ کے قریب رہنا دور اندیشی کے خلاف ہے۔ رفاقت لامحالہ مفارقت میں بدلنی پڑے گی اور ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا کہ آپ مجھے کسی اور جگہ بھیج دیں جہاں ہمارے تعلقات مہر اخلاص کی استواری میں فرق نہ آسکے۔''

بابر نے یقیناً چغتائی مغل بادشاہی کے وارث کا اشارہ سمجھ لیا اور اس کی شرافت ومروت کا اعتراف کیا ہوگا۔ ایسے مخلوط لشکر میں دونوں کا حکم تو چل نہ سکتا تھا۔ بابر اپنی سلطان سیادت کا دعویٰ رکھتا تھا اور ادھر بیس ہزار مغل وطن کی یاد میں بیقرار، سعید خاں کی بادشاہی کے طالب تھے۔ غرض جلد ہی فیصلہ کیا گیا کہ نوجوان اپنی ''ذاتی'' فوج لے کر نیم صحرائی حکومت ''مغلستان'' کو چلا جائے۔ رخصت کرنے سے پہلے بابر نے قدیم مغل رسم کے مطابق اس کی جانشینی کا دربار کیا اور ''سعید چغتائی (اپنے باپ، یعنی بابر کے ماموں کی بجائے) خان بنا دیا گیا۔''

بعض مغل گروہ، خصوصاً ایوب بیگ چک کی برادری جنہوں نے بابر کی ملازمت میں آنے سے پہلے خسرو شاہ کی نوکری کی تھی بابر ہی کی فوج میں رہ گئے۔ بعید شمالی علاقے میں نئے فرماں روا کی پختہ دوستی آئندہ بھی پادشاہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ مغلوں کے چلے جانے س متحدہ لشکر کا سب سے قوی جز وجدا ہو گیا ،لیکن بابر نے سمرقند کا بیتابانہ کوچ جاری رکھا اور اس شدومد سے پگھلتی برف کے راستے بڑھے جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی کم تعداد فوج میں بہت سے لوگ جو ادھر ادھر دبک رہے تھے آکر شریک ہو گئے۔ حیدر میرزا کے (مقتول) باپ کے پرانے میں رفیق بھی اسی کے پرچم تلے جمع ہوئے اور اس نے ازراہ مصلحت پانی سپاہ کی بھی

سپہ سالاری نوعمر حیدر میرزا کے تفویض کر دی حیدر نہایت مسرور ہوا اور اپنا پہلا معرکہ ازبکوں کی منتشر جمعیت سے پتھر کے پل پر دیکھا جو آمد دریا کی ایک دھار پر بنا ہوا تھا۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی اور بابر کے پہلو میں ایک ٹیکرے پر کھڑا حیرت سے ہزاروں سواروں کا ادھر سے ادھر دوڑنا، چیخ پکار کے ہنگامے اور کشت و خون کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ ایک بار جو ازبکوں نے نالہ اتر کے اوپر چڑھنا شروع کیا اور تو لکھتا ہے کہ ''پادشاہ کی نظر میرے قریب کے آدمیوں پر پڑی۔ دریافت کیا یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا ہم حیدر میرزا کی جمعیت میں ہیں۔ بادشاہ میری طرف مخاطب ہوا اور کہا تم ابھی بہت کم عمر ہو اس خطرناک کام میں حصہ نہیں لے سکتے۔ تم میرے پاس رہو۔ مولانا محمد اور چند سپاہی تمہارے پاس ٹھیریں گے باقی جوانوں کو خان میرزا کی کمک کے لئے بھیج دو۔'' اتنے میں میری جمعیت کے لوگ ایک قیدی پکڑ کر لائے۔ بادشاہ نے کہا شگون اچھا ہے۔ اس قیدی کو حیدر میرزا کے نام لکھا جائے۔''

مغرب کے قریب ازبکوں کی صفیں پراگندہ ہو گئیں۔ ان کے تین سپہ سالار اسیر کر کے لائے گئے ''پادشاہ نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شیبانی نے مغل خانوں اور چغتائی سلطانوں کے ساتھ کیا تھا۔''

بابر فتح پانے کے بعد ستانے کا قائل نہیں۔ بے سرے ازبکوں کا پوری قوت سے تعاقب جاری رکھا اور در آہن کے درے سے گزر کر کرشی کو لپیٹ میں لیتا ہوا سرخ میدانوں تک پہنچ گیا کہ کرشی میں ازبک عبید خاں نے محافظ فوج جمع کر لی تھی۔

مگر بخارا پہنچے تو وہ ''سپاہیوں سے خالی، احمقوں سے بھرا ہوا تھا۔'' پھر فاتحانہ سمرقند پر بڑھنے تو ازبک بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس علاقے اور اوپر صحرائی علاقوں کو بھاگ رہی تھیں۔

نو سال کے بعد 1511ء میں بابر امیر تمیور کے شہر میں دوبارہ وارد ہوا: ''ساری نواح کے باشندے، کیا امیر کیا کسان، اہل حرفہ، اعیان وعمائد سبھی پادشاہ کی آمد پر شادمانی کا اظہار کرنے گھروں سے نکل آئے۔ امرا نے اسے گھیر لیا۔ غریب غربا اپنے گھروں کی آرائش میں مصروف ہوئے۔ گلی کوچے بازار، بادلے اور زری سے سجائے گئے۔ جگہ جگہ قطعات اور تصویریں لٹکائی گئیں۔

یہ کسی جن کا کرشمہ نظر آتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے وہ سب مانوس مقامات جہاں بابر گشت لگاتا تھا اور خانوادہ تیموری کے ممالک کے ممالک ایک مرتبہ پھر بابر کے زیر نگیں آ گئے۔ اس کا بھائی کابل وغزنیں میں اس کی طرف سے حاکم تھا۔ قندزا ور بدخشاں نئے والی خان میرزا کے اطاعت گزار تھے۔ اندجان سے تاشقند تک ہر شہر کے دروازے کھل گئے تھے اور نیم صحرا کی مغل ولایت میں اس کا حلیف سعید خاں فرماں روا ہو کر آ گیا تھا۔ پہلی مرتبہ معلوم ہوتا تھا کہ بابر واقعی پادشاہ (یا شہنشاہ) کے لقب کا سزاوار ہو گیا ہے۔

لیکن یہ ظاہری احوال حقیقت سے دور تھا۔ شیبانی کے سدھائے ہوئے سپہ سالاروں کی قیادت میں خوفناک ازبک اگرچہ شمال میں پسپا ہوئے ...... اور وہ بھی شاہ اسمٰعیل کی قوت سے، لیکن پوری طرح مغلوب نہیں کئے گئے تھے۔ پھر مشترکہ

دشمن شیبانی کے دفع ہونے کے بعد، بابر کو اس متعصب ایرانی سے مصالحت کی کوئی صورت نکالنی تھی۔ اور یہی وہ کوشش تھی جس نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا، اس بار سمرقند میں اس کی حکومت صرف آٹھ مہینے رہی۔

وقت ضرورت

ہمارے شیر اور شاہ اسمٰعیل کے درمیان جو مراسلت ہوئی وہ معما ہو کے رہ گئی ہے۔ بابر کی تزک سے ان سنین کے اوراق تلف ہو گئے لہذا اس کا اپنا بیان بھی مفقود ہو گیا۔ دوسرے اہل قلم جیسے حیدر میرزا اور مورخ خواند میر کے بیانات بہت تشنہ اور متضاد ہیں۔ جنبہ داری، مذہبی تعصبات اور بعد کے سیاسی مصالح نے انہیں متاثر کر دیا ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسی ہنری نوار اور شاہ فرانس کی ''کیتھولک ہیوگنو'' (فرانس کا احتجاجی فرقہ) مجادلتہ کے قصے جو بعد کی افواہوں پر مبنی تھے۔ ہمیں رغبت تو ہوتی ہے کہ بابر کی نسبت کہیں کہ وہ سمرقند کو طریق سنت کے عوض خریدنے پر مائل تھا لیکن یہ پوری سچی بات نہ ہوگی۔ ہر چند ہمیں ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ اس کے محرکات کیا تھے لیکن جو کچھ عمل کیا وہ پوری طرح واضح ہے اور یہی عمل اس کے افکار و استدلال ذہنی کی خبر دیتا ہے جسے حیدر میرزا نے ''اس کے وقت ضرورت'' سے تعبیر کیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ صفوی نے اس کی بڑی بہن خانزادہ بیگم کو جنگ مرو کے بعد شیبانی کی لشکر گاہ میں پایا تو عزت حرمت کے ساتھ بدرقہ دے کر بابر کے پاس بھیج دیا۔ یہ بلند حوصلہ جوڑ تو ڑ والی شہزادی شیبانی کے نکاح میں رہی اور اس سے ایک بیٹا

بھی پیدا ہوا، لیکن شیبانی نے اپنے دشمن بابر کی طرف داری میں اس کے ساز باز سے مشتبہ ہو کر طلاق دے دی اور ایک بڑے ازبک سردار سے اسے بیاہ دیا۔ یہ سردار اور شیبانی دونوں مرو میں ہلاک ہوئے تھے۔ ظاہر خانزادہ کی بھائی سے دلی محبت میں فرق نہ آیا تھا۔ اور بہر حال وہ ازبک دربار کے جملہ کوائف بابر کے پاس لائی تھی۔

پراسرار صفوی کا یہ فعل مروت وشائستگی کا آئینہ دار تھا۔ بابر نے بھی اس کے شکریے میں اپنے سفیر ہرات روانہ کئے۔ اسمعیل کی عنایت کا اعتراف کرنے کے علاوہ یہ بھی دریافت کرنا مقصود تھا کہ آئندہ روابط کی کیا شرطیں ہوں گی۔ پھر دوسرے کاموں سے فرصت ملتے ہی خان میرزا کو سفارت کا سربراہ بنا کر صفوی دربار میں بھیجا۔

واضح رہے کہ خانزادہ بیگم کو لے کر جو قزلباش محافظ آئے تھے، ان کے سرداروں نے بابر کو سمرقند پر جھپٹے میں بھی عملی حصہ لیا اور تیمور کے تاریخی تخت پر متمکن ہونے کے بعد بابر نے معقول تحفے تحائف دے کر انہیں رخصت کیا تھا۔ غرض یہ کہ اسمعیل کی طرف سے جو شرائط پیش ہوئیں وہ پتھر کے پل اور سمرقند پر بابر کے فتح پانے کے بعد ہی مرتب کی گئی تھیں۔ انہیں خان میرزا بابر کے پاس لایا اور اگرچہ اختلافی بیانات نے انہیں مبہم کر دیا ہے لیکن حقیقت میں وہ درشتی سے خالی نہ تھیں۔ شاہ اسمعیل نے تیموری وارث کو تخت سمرقند پر قائم رہنے میں مدد کا وعدہ کیا تھا بشرطیکہ بابر اس ایرانی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لے۔ مزید برآں وہ شرطیں جن کو مناقشے کے غبار نے دھندلا کر دیا ہے، یہ تھیں کہ آئندہ سکے پر شاہ اسمعیل اور (بہ مترجم) دو ازدہ اماموں کے نام کندہ کرائے جائیں جو اس کی شہنشاہی کا علانیہ باضابطہ اعتراف

ہوں اور اسی طرح خطبے میں (اپنی بجائے) شاہ کا نام پڑھوایا جائے۔

اسمٰعیل نہایت متعصب نوجوان تھا۔ بابر کے مزاج میں روا داری تھی۔ تین برس کی عمر میں اٹھارہ سال جنگ وجدال میں گزارے۔ عزت نفس رکھنے میں کسی سے کم نہ تھا۔ اسی زمانے میں خانزادہ بیگم نے ازبکوں کی قوت اور منصوبوں کی خوف انگیز تفصیلات سنیں اور قرینہ غالب یہی ہے کہ وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ سمرقند جو محض خدائے تعالیٰ کی کریمی سے دوبارہ ہاتھ آیا، ایرانی فاتح خراسان کی مدد کے بغیر وہ اس پر قبضہ نہ رکھ سکے گا پھر بابر کے قطعے میں خاص خاص صوفیہ، چھپے ہوئے، ایشان'' عالم خیال میں پرواز کرنے والے درویش اور سب سے بڑھ کر حضرت جامیؒ کی (جو راسخ العقیدہ سنی ہونے کے ساتھ صوفی بھی تھے۔) یاد باقی تھی۔ اس کے ذہن میں عقیدے کی یہ الجھن صاف نہ ہوئی تھی کہ خدا کو محیط کل (ہر جگہ ہر طرف موجود) کے مانا جائے یا سنی مذہب کے مطابق انسان سے بالکل جداگانہ ہستی جس کی حسب احکام رسمی عبادت فرض ہے۔ صفوی بادشاہ اول الذکر اعتقاد رکھتا تھا۔ (51) مرحوم شیبانی طریق آخر کا پابند تھا۔ یہ تقریباً یقینی ہے کہ اس زمانے میں بابر کے دل میں شیعی عقائد کی بھی وہی حرمت تھی۔ جیسی طریق سنت کی۔ یہ شہادت بھی موجود ہے کہ اس نے اسمٰعیل کی شرط کے مطابق بعض سکوں پر امام کا نام ضرب کرایا۔ اسی سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ بخارا اور سمرقند کے منبروں سے خطبے میں شاہ اسمٰعیل کا نام پڑھوایا گیا ہوگا۔ اہل ملک میں اس سے بڑھ کر نا گواری کی بات نہ ہو سکتی تھی۔ بخارا بزرگان اولیا کے مقابر سے گھرا ہوا تھا۔ وہ سب سنی اہل علم وعرفان

تھے اور شہر (''قبتہ الاسلام''یعنی) عقاید سنت والجماعت کا مرکز کہلاتا تھا کم وبیش ایسا ہی سمرقند تھا۔ یہاں والوں نے کمال شادمانی سے بابر کا خیر مقدم کیا تھا، کیا وہ اس لئے تھا کہ بابر ایک ملحد شیعہ کا خود کو باج گزار بنا لے گا۔ ایسے بے دین شاہ کا جس کے ہاتھ ان شہیدوں کے خون سے آلودہ تھے جنہوں نے ہرات میں سچے دین سے منحرف ہونا منظور نہیں کیا (حقیقت میں مسلمانوں کے معزز شیوخ سے شاہ اسمٰعیل کے روبرو جرح کی گئی اور بے گناہ قتل کر دیئے گئے تھے) میرزا حیدر لکھتا ہے کہ '' سب لوگ، خصوصاً اہل سمرقند توقع کرتے تھے کہ گو ضرورت کے وقت پادشاہ نے قزل باشوں کا لباس زیب تن کرلیا ہو، سمرقند توقع کرتے تھے کہ گو ضرورت کے وقت پادشاہ نے قزل باشوں کا لباس زیب تن کرلیا ہو، سمرقند کے تخت پر، جو خاص سنت پیغمبر علیہ الصلواۃ والسلام کا تخت تھا، قدم دھرنے کے بعد وہ اسمٰعیل کی شاہی سے تبری کرے گا جس کی مذہب کی نوعیت الحاد، اور نشان گدھے کی دم ہے۔'' بچارے حیدر میرزا کے دل میں لڑکپن کے باوجود اپنے محسن بابر کی عقیدت مندی میں سخت تزلزل آ گیا۔ کیونکہ وہ پرجوش سنی تھا۔ اب اس نے پادشاہ کے پہلو میں سوار ہونا چھوڑ دیا اور بیماری کے عذر پر جو واقعی تھی یا اعتقادی، اپنے کمرے ہی میں وقت گزارتا تھا۔ اس کا قول کہ بابر نے قزل باشوں کا لباس زیب تن کیا، فاری زبان کا استعارہ ہے بعض مصنفوں نے اسے غلطی سے بیان واقعہ سمجھ لیا۔ بابر نے قزل باشوں کی چونچ والی نمدے کی سرخ کلاہ جس سے مسلمان نفرت کرتے تھے اور ان کا سرخ پچھائے کا کپڑا کبھی نہیں پہنا۔ البتہ اس لباس میں ایرانی عہدہ دار ہر جگہ اس

کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔

ادھر معلوم ہوتا ہے ان ایرانی عہدہ داروں نے شاہ کو اطلاع دی کہ بابر کا برتاؤ باج گزاروں کا سا نہیں، بلکہ نخوت آمیز ہے۔ 1511-12ء کے جاڑوں میں شیر اپنی سیاسی ضروت اور اہل ملک کے مذہبی جذبات کے درمیان پھنس گیا۔ سمرقند والوں کو راسخ العقیدہ سنی شیبانی کے عہد حکومت کی شدت سے یاد ستانے لگی۔ اس فرماں روا نے شیطان اور یزداں کے درمیان بہت امتیاز کیا اور اس میں کوئی ابہام نہ آنے دیا تھا۔ اس کی سنگ دلی صرف سیاسی خطا کاروں کا خون بہاتی تھی بخلاف وحشی اسمٰعیل کے جس نے اہل علم و عرفان کو شہید کیا اور وہ سوال کرتے تھے کہ کیا شیبانی خود شہید نہیں تھا۔

اسی جاڑے میں بابر نے شراب پینی شروع کی اور جب پیتا تو بے تحاشا پیے چلے جاتا تھا۔

1512ء میں برف پگھلنے کے بعد موسم بہار کے ہم قدم عبید خاں اور ازبک لشکر از سر نو منظم ہو کر شمال سے اترا۔ بابر اپنی مغل جمعیت اور کابل کے آزمودہ کار سپاہیوں کو لے کر لڑنے نکلا۔ بظاہر سمرقند میں کوئی بھرتی نہیں ہوئی اور یہاں والے اس کے ساتھ نہیں گئے۔ ایک مقام حوض شاہی کے قریب اس کی مختصر فوج کو شکست ہوئی اور پیچھے دھکیل دی گئی۔ اس کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ سمرقند کی مدافعت کے لئے کافی ہوتی اور وہ تلخ تجربہ یاد تھا جب کہ یہاں کی بڑی فصیلوں کو معدودے چند محافظوں سے پہرہ دلوانے کی مصیبت اٹھانی پڑی تھی۔

دوبارہ اسے سلامتی کی راہ وہی جنوب کی طرف کوہستان سیاہ سے گزرنے میں نظر آئی جہاں ایک سرحد قلعے حصار میں ٹک گیا۔ اہل و عیال جس میں اب بہن خانزادہ اور دوسرے بیٹے کامران کا اضافہ ہو گیا تھا، ہمراہ تھے۔ بے غیرت بن کر صفوی شاہ سے مدد دینے کی درخواست کی۔

حیدر میرزا اپنے سرپرست کے ہمراہ نہیں گیا۔ افسردہ وملول سمرقند ہی میں پڑا تھا کہ آئندہ چند ماہ میں تقدیر کا پہیہ پھرنے کی خبر سنی۔ یعنی یہ کہ مغرور صفوی نے اپنے گیارہ ہزار ''ترکمان'' شمشیرزن، شکست خوردہ بابر کی مدد کے لئے بھیجے۔ ان کا سپہ سالار نجم ثانی بھی اپنے شاہ کی طرح غرور کے نشے میں مست تھا۔ پھر کس طرح ان بے دینوں نے بابر کو لے کر در آہن کی طرح غرور کے نشے میں مست تھا۔ پھر کس طرح ان بے دینوں نے بابر کو لے کر در آہن کے قریب قلعہ کرشی کا محاصرہ کیا جہاں عبید خاں کے کچھ گھر والے اس وقت تک مقیم تھے۔ پھر کس طرح بابر کی رائے کے خلاف اور بغیر اس کی فوج کے خود یورش کر کے قلعہ فتح کیا اور وہاں کے تمام باشندوں، حتیٰ کہ دودھ پیتے بچوں اور معذور بوڑھوں تک کو ذبح کر ڈالا۔ بے خانماں شاعر بنائی بھی قزل باشوں کے اسی قتل عام میں جان سے گیا۔ او یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کرشی کی خونریزی نے اتحادیوں کے صلاح مشورے میں خرابی ڈالی۔ یوں بھی یہ اتحاد پہلے سے قابل اطمینان نہیں تھا۔ بابر کو کرشی کے سانحے نے تذبذب میں ڈال دیا۔ شیبانی خاں نے کبھی اپنی فوج کو اجازت نہ دی تھی کہ عام شہریوں کا خون بہائیں۔ بخلاف اس کے نجم ثانی ان مسلمانوں کو جنہیں وہ کافر سمجھتا تھا، قتل کر کے فخر

وشادمانی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ بابر پر نکتہ چینی کرتا اور اس کے طرز عمل سے مشتبہ ہو گیا تھا۔ باہمی مشاورۃ میں اسی ایرانی کا فیصلہ چلتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ فوج میں نا اتفاقی اور ناگواری پھیلی ہوئی تھی جب کہ نجم ثانی حریف پر چڑھ دوڑا اور منہ کے بل گرا۔ کوتل غج پر بخارا کے راستے میں عبید خاں نے دام بچھا رکھا تھا۔ یہاں، حیدر میرزا اپنے پورے خطیبانہ انداز میں بیان کرتا ہے کہ ''اسلام کی تلوار نے الحاد اور بے دینی کے ہاتھ قطع کر دیئے۔ اسلام کی ہوائے نصرت و اقبال نے روافض کے پرچم الٹ دیئے۔ ترکمانوں کو کامل ہزیمت ہوئی اور میدان میں کھیت رہے۔ کرشی کے زخم تیر انتقام کے بخیے سے سئے گئے۔ امیر نجم اور جملہ ترکمان سرداروں کو (ازبکوں نے) جہنم واصل کیا۔ بابر پادشاہ شکست خوردہ سرنگوں حصار کو پسپا ہوا۔

آئندہ پشت میں بھی بابر اور اس کی مغل فوج پر ایرانی الزام لگاتے تھے کہ انہوں نے غج کے معرکے میں نجم کے قزلباشوں کو مدد نہ دی اور پیچھے ٹھٹک رہے حالانکہ اسی موقع کے لئے انہیں ردیف میں رکھا گیا تھا۔ ایسی لڑائیوں کے بعد اس طرح کے اعتراض و الزام ایک دوسرے پر وارد کیے ہی جایا کرتے ہیں لیکن کیا ان الزامات کی کوئی اصلیت نہ تھی؟ بابر نے کرشی اور بخارا پر حملہ کرنے کے خلاف رائے دی تھی، ممکن تو ہے کہ اسی رائے کے مطابق اس نے اپنی فوج کو ان حملوں میں حصہ لینے سے روکا ہو۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ اسے بخارا جیسے مقدس شہرت کے شہر پر وہی کچھ پر وہی کچھ گزرنے کا اندیشہ ہو جو کرشی پر ترکمانوں کے ہاتھ سے گزری تھی؟ بابر نے اس بارے میں کوئی صراحت نہیں کی۔

حصار واپس جاتے میں اس کی جان بال بال بچی۔ قزل باشوں کی ہزیمت کے بعد مغل امیروں نے خود فائدہ اٹھانا اور بابر ہی کو گرفتار کر لینا چاہا تھا۔ عین وقت پر اسے سوتے سے اٹھایا گیا۔ اور وہ گھوڑے پر چڑھ کر تن تنہا لشکر سے نکل گیا۔ تب مغلوں نے دیہات لوٹنے شروع کیے۔ برسوں بعد ان کے سردار ایوب بیگ چک نے جب کہ وہ اپنے وطن اور سعید خاں کی لشکر گاہ میں قریب مرگ تھا اقرار کیا کہ اس رات بابر سے جو غداری میں نے کی تھی، وہ آج میرا جگہ چھیلتی ہے۔ اسی سعید خاں کی پناہ میں حیدر میرزا، سمرقند کے سفا کانہ کشت و خون سے بیزار ملول ہو کر بعید شمال میں چلا آیا تھا۔

اس اثنا میں مغرب کی جانب جو واقعات پیش آئے ان کی وجہ سے شاہ اسمعیل کو اپنے لاؤ لشکر سمیت واپس جانا پڑا کہ ایک اور خوفناک سنی دشمن، عثمان لی سلطان سلیم (فاتح) سے مقابلہ کرے۔

جاڑوں میں اتنی برف گری اور سامان خوردنی کا ایسا قحط ہوا کہ حصار کے چھوٹے سے قلعے میں لوگ اسے خدا کا قہر سمجھے جو آپس میں مسلمانوں کا خون بہانے کے باعث نازل ہوا۔ بابر نے بدخشاں کی حکومت بدستور اپنے خالہ زاد بھائی خان میرزا کے ہاتھ میں رہنے دی اور خود ہٹیلے پن سے پھر جنوبی وادی آمو میں آ گیا۔ آئندہ پانچ سال (1513ء تا 1518ء) میں اس کے حالات کا بہت کم علم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ زیادہ تر بلخ و قند کے درمیان سرحدوں سے چپکا رہا تا آنکہ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ قدیم سلطنت کے کسی قطعے پر بھی قبضہ رکھنے کی امید نہیں کی جا سکتی

۔تب آخری مرتبہ اس نے سمرقند کے محلات اور ہرات کے باغوں کو خیر باد کہی اور کابل کو واپس روانہ ہو گیا۔ یہ راستہ معروف پہاڑی دروں اور بستیوں سے اس نے طے کیا۔ سفر میں شراب ممنوعہ کے بارہا قدحے کے قدحے چڑھاتا رہا۔ ان سنین میں اس کا تیسرا بیٹا ہوا جس کا عرف ''عسکری'' (یعنی لشکر والا) رکھا گیا۔

شہر کابل کے دروازے پر چھوٹے اور مریل بھائی ناصر میرزا نے تپاک کے لئے محفوظ رکھا۔ بابر کو بھی اس جنگلی وطن میں یہ خیر مقدم دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن چند ہی روز گزرے تھے۔ کہ ناصر کثرت سے نوشی سے بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔

کابل میں اس مراجعت کے وقت خود بابر بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب وہ مفلس قلاش لاابالی شہزادہ نہ تھا جس کا دس برس پہلے اس شہر میں داخلہ ہوا تھا کہ بے نوائی کے باوجود ہمت بلند اور منصوبے بڑے بڑے تھے۔ مراجعت کے وقت نازو نخوت کی گردن ٹوٹ چکی تھی اور حال و مستقبل کی کچھ فکر نہیں رہی تھی۔ لطف شراب میں افیون و بھنگ کا اضافہ کر لیا تھا اور آشفتہ مزاجی کی گھڑیوں میں خطا کاروں کو سخت عذاب دے کر قتل کرنے کے حکم نافذ کر دیتا تھا۔ شکار جو پہلے بڑی تفریح کا مشغلہ تھا، اب محض جان داروں کو مار ڈالنے کا جذبہ رہ گیا تھا۔

بابر کی طبیعت میں اس تبدیلی کی تاویل میں بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ اس کے موروثی ''مغل'' خون کا ظہور تھا۔ لیکن اول تو اس کی رگوں میں ''مغل'' خون کی آمیزش بہت کم تھی، دوسرے اپنے فرغانہ کے عہد میں اس پر یہ بے رحمی کے دورے کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے۔

کابل کے ان افسردہ سنین میں خانزادہ بیگم اچھے دنوں کی یاد دلایا کرتی تھی۔ اس نے علی یزدی کی کتاب ''ظفر نامہ'' جسے پہلے بھی پڑھا کرتا تھا، پھر پڑھی۔ امیر تیمور کی فتوحات کی پر تکلف فارسی میں مدح و ثنا پڑھ کر اسے اپنی ناکامی اور بھی نمایاں نظر آئی ہوگی۔ جنگ میں شکست، سمرقند میں خود اپنے اہل ملک کا انحراف اور طعنے کہ بے دین صفوی کی جوتیاں چاٹتا ہے، زیر پرورش حیدر دوغلات کا اسے چھوڑ دینا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عمر بھر کے دشمن شیبانی کی شبیہ کا مرنے کے بعد بھی اس پر غالب آجانا...... یہ سب باتیں بابر کو اپنی زندگی سے نفرت دلاتی تھیں۔ اپنے آپ کو'' پادشاہ ذ' کے لقب سے تو ملقب کیا۔ لیکن قوت کا مدار، چند دانش مند مشیروں کے سوا تھا تو ان مغل شمشیر زنوں پر جن کی وفاداری پر کوئی بھروسہ نہ ہوسکتا تھا۔ حکومت، وادی کے ایک قلعے پر۔ اور حالت یہ کہ غلے کے لئے افغانی قبائل پر تاختیں کرنی پڑتی تھیں۔ ادھر شراب خوری کی معصیت میں روز بروز اور زیادہ مبتلا ہوا جاتا تھا۔'' پادشاہ اسلام' ایک طرف کیا کسی مسلمان فرماں روا کی صورت یہ ہوسکتی تھی؟

مغل سپاہ نے حسب معمول پھر جو غدر کیا، تو بابر نے وحشیانہ سفاکی سے انہیں کچلا اور اسی قسم کی بے رحمی قدیم افغانی باشندوں کی مورچہ بند بستیوں کو تاراج کرنے میں دکھائی۔

بایں ہمہ یہ پختہ عمر بابر تو ہم کی قید سے چھوٹ گیا تھا۔ کسی حلیف و مددگار کی اسے تلاش نہ رہی تھی اور سن رسیدہ قاسم بیگ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کو اپنی رائے پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اسے صرف اپنی ذات پر بھروسہ تھا

اور وقتی ترنگ میں آ کر فتوحات حاصل کرنے کی امیدیں باندھنی بھی اس نے چھوڑ دی تھیں۔ اس نے پہلی مرتبہ بعید افقوں پر حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالی۔ اس کی قدیم میراث ازبک اور ایرانیوں میں بٹ گئی تھی اور اسے واپس لینے کا کوئی امکان نہ تھا۔ البتہ بدخشاں کی مستور وادی باقی تھی اور بابر نے پوری استقامت سے اس کے پہاڑی راستے کھلے رکھے۔ یہ ہندوکش کے دشوار گزار بلند دروں سے گزر کر بدخشاں کے محفوظ حصار تک جاتے تھے۔ یہ ولایت اس نے اپنے رشتہ دار خان میرزا کے سپرد کی اور برابر اس کا خبر گیراں رہا۔ بعض اہل الرائے باور کرتے ہیں کہ اسے قبضے میں رکھنے کی سخت کوشش کا مقصد یہ تھا کہ سمرقند کی بازیابی کے لئے بدخشاں سے معبر کا کام لیا جائے۔ لیکن ایک اور قرینہ یہ ہے کہ وہ اسے محفوظ رکھنے کا اس لئے خواہاں تھا کہ اگر کابل سے نکلنا پڑے تو وہاں پناہ لی جا سکے۔ پہلے بھی ایک نازک وقت میں وہ اور قاسم بیگ بحث کر چکے تھے کہ ان کے سامنے دو ہی مامن ہیں: بدخشاں یا ہندوستان کا میدانی علاقہ۔

ان اندھیرے دنوں میں بابر کا خیال پھر سندھ پار کے زرخیز میدانوں کی طرف منعطف ہوا۔ معمولی تاخت ہی سے مواشی، پارچہ، اموال منقولہ کی معقول مقدار وہاں سے ہاتھ آ گئی۔ لڑکپن میں اس نے سمرقند کی ان تصاویر کو غور سے دیکھا تھا جن میں تیمور کے ہندوستان پر حملے کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ اس بڑی یورش کی تفصیلات، اسی پر تکلف انشا پردازی میں ظفر نامے کے اوراق میں مطالعہ کی تھیں۔ اپنی سرکش رعایا یعنی افغانی قبائل پر بار بار چڑھائیاں کرنے سے کہیں زیادہ

نفع کا سودا اور یقیناً معقول بات یہ تھی کہ اپنی باقی ماندہ فوج کو لے کر خیبر کے پار جائے اور ہندوستان کے مال غنیمت سے اپنا خزانہ معمور کرے۔

لیکن خیبر کا راستہ ہو یا سوات کے بلند پہاڑ، یا درہ قرم، جملہ گزرگاہوں پر پٹھانوں کا پہرا تھا۔ دریائے سندھ اور اس کے درمیان یہ قبائلی پٹی حائل تھی اور بابر کو یہ بھی معلوم تھا کہ کسی بے پروا سپہ سالار یا شکست خوردہ فوج کے ساتھ یہ عیسیٰ خیل، یوسف زئی اور آفریدی کس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ لہذا ہندوستان کے دولت کدوں تک پہنچنے سے پہلے ضروری تھا کہ ان پہاڑ کے خدائی فوجداروں کو یا کاملاً مرعوب کر دیا جائے یا دوست دار بنا لیا جائے۔ سارے افغانوں کو مغلوب و محکوم کرنے کا خیال اس نے اب چھوڑ دیا تھا۔

☆..........☆..........☆

باب ششم:::ہندوستان کا راستہ

افغان بی بی کی ضمنی نقل

پراتم چینیوں کی ایک کہاوت ہے کہ " سڑکیں بدل جائیں، پہاڑ کبھی نہیں بدلتے۔" پھر مرور زمانہ سے شوارع ہی نہیں بدلتے ان کے آس پاس رہنے والے بھی کچھ نقل مکانی سے کچھ دخیل تہذیبوں کے میل سے بدل جایا کرتے ہیں۔نشیبی ممالک میں سلطنتیں تک بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔لیکن اونچے پہاڑوں کے بسنے والے بالکل نہیں بدلتے اوریا اتنی خفیف تدریج سے بدلتے ہیں کہ ہم کو فرق کا پتا نہیں چلتا۔سرحد ہسپانیہ کے پہاڑی باسک سب سے الگ تھلگ ہونے میں قاف کے گرجیوں کی مثل ہیں اور مدتوں تبت والوں کے مشابہ رہے،سوائے زمانہ حاضرہ کے۔

عجیب بات ہے کہ افغانستان کی پہاڑی قومیں، اپنی نامتغیر بلند چراگاہوں میں،سکندر یونانی کے زمانے میں بھی ویسی ہی تھیں۔جیسی بابر کے عہد میں اور آج بھی ان کے نام تک قریب قریب وہی چلے آتے ہیں مزید برآں انہوں نے تاریخی انقلابات تماشائیوں کی طرح الگ رہ کے دیکھے اور بڑے بڑے واقعات عوامی حافظے میں لگائے رکھے۔انہوں نے ان واقعات کو خود اپنے ہاں کی کہانیاں بنالیا جو ان کی میں اس طرح معروف ہیں جیسے مقامی مزارات، گو ہمارے لئے بڑے بڑے

پتھروں کے یہ سر راہ مقبرے نامعلوم اولیا کے ہیں اور ان کی مذکورہ بالا قسم کی کہانیاں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ مثلاً سفید کوہ کے برفانی خط کے کنارے جو کرد قبائل آباد ہیں انہوں نے سکندر یونانی کا خود حصہ بنایا اور اسے تحریر بھی کر لیا ہے اس سکندر نامے میں یہ مشہور فاتح عجیب عجیب کارنامے انجام دیتا ہے۔ اتھاہ سمندروں کی تہوں تک کھنگال ڈالتا اور فرشتے عزرائیل کے ساتھ مل کر سد سکندری تعمیر کرتا ہے کہ یاجوج ماجوج دیواس میں بند رہیں......اور یہ یاجوج ماجوج چنگیز خاں کے لشکر ہیں۔

بابر کے میں یوسف زئی پٹھانوں نے اس کی آمد کا خود ہی افسانہ گھڑا اور اس میں عشق و محبت کی چاشنی دے دی ہے۔ اسے ایسے لطائف سے رنگا ہے کہ صداقت کا پابند مورخ تو سن کر کانپ جائے گا۔ بایں ہمہ یہ بابر کی ایک تصویر ہے جسے قبائلی حافظے سے اتارا گیا تھا۔

افغان بیگم کی اس نقل کا خلاصہ یہ ہے:

بابر جب کابل میں حکومت کرنے آیا تو شروع میں وہ شوسف زئیوں پر مہربان تھا لیکن ان کے جانی دشمن دلزاکوں کی باتوں نے اسے یوسف زائی سے سخت بدظن کر دیا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ ملک احمد ان کے سردار کو جب وہ کابل آئے تو قتل کرا دے۔ دلزاکوں نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ فوراً قتل کرانا ضروری ہے۔ ورنہ وہ ایسا چالاک ہے کہ بولنے کا موقع مل گیا تو کسی نہ کسی طرح بادشاہ سے جان بخشی کرا لے گا۔

ملک احمد کی آمد پر بابر نے بڑا دربار لگایا۔ شہ نشین کے تخت پر متمکن

ہوا۔ احمد نے آداب بجالانے کے بعد فوراً اپنے گلے کی گھنڈیاں کھول دیں۔ بابر نے پوچھا یہ کیا کرتا ہے؟ وہ چپ رہا۔ آخری تیسری دفعہ سوال کرنے پر جواب دیا: ''میں نے سنا ہے حضور مجھے اپنے ہاتھ سے تیر مار کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خیال ہوا اتنے بھرے دربار میں جب کہ سب کی نگاہیں ادھر لگی ہوئی ہیں، ایسا نہ ہو کہ حضور کا وار خالی جائے۔ اسی سے اپنا بھاری، گدے دار گلا ہٹائے دیتا ہوں کہ تیر پوری طرح کارگر ہو۔''

یہ بات سن کر بابر خوش ہوگیا اور اس سے کئی سوال کیے۔ ایک یہ تھا کہ سکندر کس قسم کا آدمی تھا؟

احمد نے کہا: ''خلعت عطا کرنے والا۔''

پوچھا: ''اور بابر؟''

احمد نے کہا: ''وہ زندگی عطا کرنے والا ہے، کیونکہ میری جان مجھے واپس دے گا۔''

بابر نے کہا: ''بے شک ایسا ہی ہوگا۔''

پھر تو بادشاہ ایسا مہربان ہوا کہ ہاتھ پکڑ کر تخلیے میں احمد کو لے گیا اور وہاں انہوں نے تین دفعہ شراب پی۔ پہلے بابر تھوڑی سی پیتا پھر وہی جام احمد کو دے دیتا تھا۔ شراب کا نشہ چڑھا تو بابر مست ہو کر ناچنے لگا۔ **ملک** احمد کے سازندے ساز بجاتے رہے اور خود **ملک** احمد جو فارسی خوب جانتا تھا۔ ساز پر بہت عمدہ گانے گاتا

رہا۔بابر ناچتے ناچتے گیا تو ہاتھ بڑھا کر کہا ''میں تمہارا رقاص ہوں (52)، لاؤ میرا انعام۔'' اس نے تین دفعہ مانگا اور ہر دفعہ ملک احمد نے ایک اشرفی اس کے ہاتھ میں رکھ دی۔اس طرح احمد بخیر و سلامت اپنی قوم میں واپس آیا۔

لیکن پھر بابر ان کے علاقے میں فوج لے کر آیا۔ان کی زمینیں پامال کر ڈالیں مگر ان کا سنگو (قلعہ) نہیں فتح ہوا۔تب بابر نے، جیسی اس کی عادت تھی، قلندر کا بھیس بھرا اور قلعے کے استحکام دیکھنے دیارن کے پڑاؤ سے ماہورہ پہاڑی پر گیا جہاں قلع واقع تھا۔اس وقت (بہ تصحیح مترجم) عید قربان کا تہوار منایا جا رہا تھا اور ماہورہ پہاڑی کے عقب میں ملک احمد کے چھوٹے بھائی شاہ منصور کے ہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔آج کے دن تک یہ جگہ ''شاہ منصور کا تخت'' کہلاتی ہے۔بابر بھیس بدلے ہوئے مکان کے پیچھے گیا اور صحن میں جہاں بھیڑ بکری تھی، کھڑا رہا۔اس نے آنے جانے والے نوکروں سے معلوم کر لیا کہ شاہ منصور کے بال بچے اور ایک لڑکی بی بی مبارکہ نام ہے جو اس وقت دوسری عورتوں کے ساتھ ایک خیمے میں بیٹھی تھی۔بی بی کی نظر قلندر پر پڑی تو اس نے روٹیوں میں سالن گوشت لپیٹ کر ایک نوکرانی کے ہاتھ اسے بھیجا۔بابر نے پوچھا یہ کس نے بھیجا ہے۔نوکرانی کے بتانے پر کہ بی بی مبارک نے'' دریافت کیا وہ کہاں ہے؟ نوکر نے کہا ''وہ تمہارے سامنے والے خیمے میں۔'' پادشاہ نے جو اسے دیکھا تو خوبصورتی دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔اس نے نوکرانی سے بی بی کی عمر اور مزاج کا پوچھا اور یہ کہ اس کی کہیں منگنی تو نہیں ہوئی ہے۔نوکرانی نے سنتے ہی کہا کہ جیسی وہ خوب صورت ہے ویسی ہی خدا نے اسے

ایک نیک سیرت عطا کی ہے۔عفت و حیا میں نظیر نہیں رکھتی اور نہایت متین اور خاموشی پسند ہے۔تب بابر وہاں سے واپس ہوا،مگر آتے میں روٹی سالن وہیں ایک پتھر کے پیچھے چھپا آیا۔

لشکر گاہ میں واپس آ کر اسے بہت اضطراب رہا کہ اب کیا کیا جائے۔قلعہ فتح نہ کر سکا تھا اور خالی ہاتھ کابل جانے سے شرم آتی تھی،مزید بر آں عشق کے جال میں پھنس گیا۔آخر ملک احمد کو خط لکھا اور شاہ منصور کی بیٹی مانگی۔احمد کو سخت اعتراض تھا، وہ اس کا سبب یہ بتاتا تھا کہ بابر کے چچا الغ بیگ اور خان میرزا اغری سے بھی یوسف زئی بیٹیاں بیاہی گئی تھیں،نتیجہ قوم کی خرابی کے سوا کچھ نہ نکلا۔دوسرے اس نے یہ بھی کہا کہ کوئی لڑکی شادی کے لائق موجود نہیں۔جواب میں بابر نے بہت پر شکوہ شاہانہ مراسلہ بھیجا۔جس میں اپنے بھیس بدل کر شاہ منصور کے گھر جانے اور بی بی مبارکہ کو ایک نظر دیکھ لینے کا ذکر اور ثبوت میں گوشت روٹی پتھر کے پیچھے چھپا کر آنے کی شہادت لکھی تھی۔

احمد اور منصور پھر بھی تیار نہ ہوتے تھے۔لیکن قبیلے کے جرگے میں لوگوں نے اصرار کیا کہ پہلے بیٹیاں دی جا چکی ہیں تو اب بی بی مبارکہ کو دینے سے انکار کرنا اور پادشاہ کو قبیلے کا دشمن بنانا درست نہ ہوگا۔ملکوں نے کہا ''اگر قبیلے کی اس میں بھلائی ہے تو بہت اچھا یونہی سہی۔''

بابر کو رضامندی کی خبر پہنچی تو خوشی کے نقارے بجنے لگے۔جشن برپا ہوا۔دلہن کے لئے بیش بہا تحائف بھیجے گئے جس میں ایک تلوار بھی تھی۔ادھر سے دونوں ملک

بیٹی کو لے کر موضع تلش کے باہر تک آئے جہاں شاہی محافظ پیشوائی کو آئے تھے۔ منصور آئے تھے۔ منصور کے گھر کی پرانی دایہ رونہ اور بہت سے نوکر چاکر بی بی مبارکہ کے ہمراہ شاہی لشکر گاہ میں گئے۔ اس کے عین وسط میں بہت بڑا خیمہ نصب تھا۔ دلہن کو بڑے اعزاز اکرام سے اس میں اتارا گیا۔ اس رات کو دوسرے دن امرائے کابل کی بیویاں ملنے کے لئے آتی رہیں۔ بی بی نے ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی اوران کی رائے ہوئی کہ ''بے شک دلہن بہت خوبصورت ہے لیکن ہمارے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آئی، اس میں دیکھ لینا کچھ بھید کی بات ہے۔''

بی بی مبارکہ نے اپنی نوکرانیوں سے کہہ دیا تھا کہ پادشاہ کے آنے کی خبر رکھیں۔ ملک احمد نے جس طرح بتا دیا تھا، وہ اسی کے مطابق بادشاہ کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔ نوکروں نے اس سے کہا ''باہر بہت گہما گہمی اس لئے ہو رہی ہے کہ پادشاہ نماز پڑھنے جامع مسجد میں جانے والے ہیں۔'' پھر اسی روز بعد نماز انہوں نے خبر دی کہ ''بادشاہ تمہارے خیمے کی طرف آ رہے ہیں۔'' بی بی مبارکہ فوراً تخت سے اتر کے قالین پر دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ اس کی خوبصورتی نے فرش کو چار چاند لگا دیئے مگر پادشاہ اندر آئے اور وہ بہت جھک کر آداب بجا لائی تو بھی اپنے چہرے سے نقاب نہ ہٹائی۔ پادشاہ دیر تک اسے تکتا رہا، پھر تخت پر بیٹھ کر بولا۔ ''میری افغانی بیگم، آؤ میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' اس نے پھر جھک کر آداب کیا لیکن آگے نہیں بڑھی۔ دوبارہ بادشاہ نے بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ کسی قدر بڑھ کر قدم بوس ہوئی۔ بادشاہ نے بیقرار ہو کر کہا ''اجی آؤ، آؤ، بیٹھ جاؤ اس نے چہرے سے نقاب ہٹائی اور اپنا دامن

بھی اوپر اٹھایا۔ بادشاہ دیکھ کر کھل گیا۔ بی بی نے کہا کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟" بادشاہ نے کمال عنایت سے کہا "کہو کیا کہنا ہے۔" تب بی بی نے کہا "سمجھ لیجئے کہ ساری یوسف زئی قوم میرے دامن میں اکٹھی ہے۔ میری خاطر ان کے قصور معاف کر دیجئے۔ بابر نے جواب دیا "میں نے یوسف زئی کے سب قصور معاف کئے تمہارے سامنے ان کو تمہارے دامن میں ڈال دیا۔ اب میرے دل میں یوسف زئی سے کوئی کدورت نہیں رہی۔"

وہ پھر جھک کر آداب بجالائی۔ پادشاہ ہاتھ پکڑ کر اسے تخت پر لے گیا۔

جب نماز عصر کا وقت ہوا، پادشاہ تخت سے اٹھا تو بی بی مبارکہ جلدی سے کودی اور اس کی جوتیاں لاکے رکھیں۔ پادشاہ نے جوتی پاؤں میں ڈالی۔ خوش ہو کر کہا۔ "میں تم سے بہت خوش ہوا۔ تمہاری خاطر ساری قوم کی خطائیں بخش دیں۔" پھر مسکرا کر کہا "یہ بات ضرور ملک احمد نے تم کو سکھائی ہوگی۔" وہ نماز کے لئے گیا۔ بی بی مبارکہ نے اپنے خیمے میں نماز کی تیاری کی۔

مضبوط اور بڑے قلعے کی تسخیر

اس پٹھانی لاف وگزاف کی دستان عشق میں، حقیقت کا اچھا خاصا جزو موجود ہے۔ بی بی مبارکہ واقعی کابل کی حرم سرا میں داخل تھی اگر چہ تیموری نہ ہونے اور محض قبائلی بیٹی، نیز کم عمر ہونے کے باعث دوسری بگمانت سے کچھ الگ الگ رہتی تھی۔ بابر سے کوئی اولاد اس کے ہاں نہ ہوئی تاہم معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے مشوروں

میں حصہ لیتی اور پٹھانوں کے بے تکے مزاج کے متعلق سمجھاتی رہتی تھی۔مع ہذا اپنی قوم یوسف زئی کی حمایت کرتی، جس طرح قدیم ایرانی بادشاہ زرکسیز (زریر) کے روبرو ملکہ استر سفارش کیا کرتی تھی۔محل سرا میں اور لوگ اسے ''افغانی بیگم'' موسوم کرتے تھے۔

بابر کی تزک دوبارہ 925ھ (19۔1518ء) کی سردیوں سے شروع ہوتی ہے۔اتنی مدت کے خلا کے بعد تحریر زیادہ دوٹوک اور بارک نگاہ ہو گئی ہے۔اس میں یوسف زئی سے قول وقرار اور بی بی کو حبالہ عقد میں لانا اس کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ان جاڑوں میں بڑی جمعیت لے کر وہ بالائی سندھ پر تاخت کرنے چلا تھا۔

''جمعہ کو یوسف زئی افغانوں پر حملہ کرنے کی غرض سے سواد (سوات) کی جانب کوچ ہوا......شاہ منصور یوسف زئی خوش ذائقہ، نہایت نشہ آور مٹھائی تحفتہً لے کر آیا۔ایک حصہ میں نے کھایا۔ایک طغائی کو، تیسرا عبداللہ کتاب دار کو دیا۔اس میں ایسی منشیات ملی تھیں کہ مغرب کے بعد امرا مشورے کے لئے جمع ہوئے تو میں خیمے سے باہر نہ جا سکتا تھا۔عجیب ہی نشہ تھا۔ایک زمانے بعد تو اگر میں تینوں حصے کھا لیتا تو بھی مجھے اتنا نشہ نہ ہوتا......اسی علاقے میں تھے جب یہاں ٹخنوں ٹخنوں برف پڑی۔ایسا شاذونادر ہوتا ہوگا، کیونکہ مقامی لوگ بہت حیران ہوئے۔سلطان (بہ تصحیح مترجم) اولیس سوادی کے مشورے سے یہاں والوں سے چار ہزار خروار چاول لشکر کے واسطے لینے تجویز ہوئے۔سلطان اولیس ہی لانے کے لئے بھیجا۔ان جنگلی پہاڑیوں نے اتنا محصول کبھی نہیں بھرا تھا......یوسف زئی قوم کی خاطر میں نے اپنے

خیر خواہ **ملک** شاہ منصور کی بیٹی کی خواستگاری کی تھی جب کہ وہ اپنی قوم کا وکیل بن کے آیا تھا......ہم اسی پڑاؤ پر تھے کہ اس لڑکی کے یوسف زئیوں کے خراج کے ساتھ آنے کی اطلاع ہوئی۔ شام کو شراب نوشی کا جلسہ ہوا جس میں سلطان سواد کو شریک کیا اور خلوت خاص دی گئی۔ کوچ کرتے ہوئے آگے چلے تو شاہ منصور کا بھائی طاؤس خاں اپنی بھتیجی کو اگلے پڑاؤ پر لایا......

امرا اور دلزاک (دلہ زاک) سرداروں سے مشاورت ہوئی اور یہ رائے قرار پائی کہ سال ہلالی ختم ہو رہا ہے۔ برج حوت کے دو دن رہ گئے ہیں۔ کاشتکار فصلیں اٹھا کر لے جا چکے ہیں۔ اب سواد کی سواری میں بڑھے چلے گئے تو غلہ میسر نہ آنے سے لشکر کم رہ جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ سوا ندی سے پار ہو کر ان یوسف زئیوں پر تاخت کی جائے جو اپنے قلعے ماہورہ کے نیچے میدانوں میں ہیں (مگر سردیوں میں یہ حملہ نہ ہو) آئندہ کسی برس کچھ پہلے آ کر فصلوں کے تیار ہونے کے وقت ان کی خبر لی جائے۔''

ان یادداشتوں میں افغانی افسانے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں:۔

یوسف زئی وکیل کے سامنے بابر کا نشے میں متوالا ہونا۔ بی بی مبارکہ کا اپنے قبیلے کے خراج کے ساتھ آنا۔ پھر اس قبیلے پر حملے کا ملتوی کر دیا جانا۔ وغیرہ۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بابر نے پھر کبھی یوسف زئیوں کی چراگاہوں یا مزروعہ اراضی پر حملہ نہیں کیا اور عجب نہیں کہ اس گھومنے والے بادشاہ اور اس طاقتور قبیلے میں (جو وادی سوات کی پہاڑی بلندیوں پر بسے ہوئے تھے اور سندھ کو جانے کا ایک راستہ ان کی زد

میں تھا) مفاہمت کا بڑا سبب بی بی مبارکہ کی کوشش ہوئی ہو۔

وفادار قاسم بیگ کی ایک آخری کارگزاری یہ بھی تھی کہ اس نے اپنے بادشاہ اور ان سرکش قبائل میں ایک قسم کا عہدہ و پیان کرا دیا۔ وہ قبیلے جو ہندوکش کی ڈھلانوں پر بستے تھے، اپنی خانہ بدوشی کی اس عادت کو بھی کسی طرح چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ کہ موسم سرما کی الگ الگ چراگاہوں میں آتے جاتے ہیں۔ پہاڑوں پہاڑوں میں ان کے گشت لگانے سے بڑی ناگواری ہوتی تھی اور بابر نے شروع میں کوشش کی تھی کہ وہ جانب کابل اپنی سرمائی وادیوں میں سکونت گزیں رہیں اور مجبور کرنا چاہا تھا کہ مستقل زراعت کے غلہ پیدا کیا کریں۔ مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی اور مایوس ہو کر لکھتا ہے کہ جنگلی علاقوں کے ایمق اور ترک اپنے خوشی سے کابل کے قریب بسنے پر تیار نہیں ہوئے۔ بلکہ قاسم بیگ کے پاس پہنچے اور اس کی منت سماجت کی کہ ہمیں دوسرے علاقوں میں آنے جانے کی اجازت دلوائی جائے۔ قاسم بیگ نے بار بار سعی سفارش کی اور آخر میں نے اجازت دے دی کہ وہ قندز تک ایسی آمد و رفت رکھ سکتے ہیں۔''

جاڑوں میں ان پہاڑوں سے گزرنا خالی کوچ نہ تھا۔ ہر منزل پر دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ ایک خبر لانے والے کا ذکر لکھا ہے کہ اسے کوئی اکیلا پٹھان ملا، اس نے سر کاٹ لیا لیکن لاتے میں کہیں گر گیا۔ بابر مزاحاً لکھتا ہے کہ ''بس یہی خبر تھی جو اس نے آ کر ہمیں سنا دی'' خود بابر بھی ان خوبصورت، ویران پہاڑوں کے راستے میں جلا دیاں کرتا جاتا تھا حالانکہ ابتدائی عمر اور اپنی وطنی وادیوں میں کبھی ایسا نہیں کیا

تھا۔لکھتا ہے:۔

''(مقام نامی موضع میں) ایک ملحد قلندر کا مقبرہ تھا جس نے ایک دو پشت پہلے یہاں آ کر بہت سے یوسف زئی اور دلے زاکوں کے عقیدے خراب کئے تھے۔ یہ کوہ مقام کی ڈھلانوں پر ایک فراخ جگہ نہایت بلندی پر بنا ہوا تھا۔ میں نے سوچا ایک ملحد قلندر کا مقبرہ ایسی پر فضا، صاف جگہ نہ ہونا چاہئے۔ حکم دیا توتوڑ کر زمین کے برابر کر دو...... جگہ ایسی روشن اور ہوادار تھی کہ میں وہاں دیر تک بیٹھا رہا اور معجون (بھنگ کا میٹھا مرکب) کھائی۔

مزاج کی اسی کواہٹ کا خمیازہ پہاڑی قصبے بجور (باجوڑ) کو بھگتنا پڑا۔اس کے گرد مضبوط سنگین فصیل تھی۔بابر کے بقول یہاں کے باشندے صحیح العقیدہ مسلمان نہ تھے بلکہ ''جاہلی'' مذہب کے لوگ تھے۔ان کے ''سلطان'' کے پاس ایک دلہ زاک پیامی کو بھیجا کہ دروازے کھول دے اور پادشاہ کی اطاعت قبول کریں۔اس نے ''واہی تباہی'' جواب دیئے اور انکار کیا۔تب بابر نے اپنی مختصر فوج کا یہیں پڑاؤ کرایا اور لوہے کے جال کی ڈھالیں، چھتریاں، سیڑھیاں اور آلات قلعہ گیری تیار کئے۔جن میں پہلی دفعہ اس کی کتاب میں آتشیں اسلحہ کا ذکر آیا ہے:۔

''جمعرات کو حکم دیا گیا کہ فوج والے زرہ اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سوار ہو جائیں۔میسرے کو قلعے کے بالائی رخ پر ندی پار کر کے شمال میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔قول (قلب لشکر) کو ندی اترے بغیر شمال مغرب کے ناہموار میدان میں، اور میمنے کو دروازہ قلعہ کے مغرب میں گھوڑوں سے اترنا تھا۔جب دولت بیگ اور میسرے

کے سردار مذکورہ بالا جگہ پر پہنچے تو سو ڈیڑھ سو آدمیوں نے قلعے سے نکل کر حملہ کیا اور تیروں کی بوچھاڑ کی۔ میرے سپاہیوں نے جواب میں تیر چلائے اور قلعہ والوں کو دھس تک پیچھے ہٹا دیا۔ عبدالملک (بہ تصحیح مترجم) خوستی دیوانہ وار گھوڑا دوڑاتا ہوا فصیل کے نیچے تک پہنچ گیا۔ اگر سیڑھیاں تیار ہوتیں تو ہم قلعے کے اندر داخل ہو جاتے...... بجور والوں نے بندوقیں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ان سے نہیں ڈرے بلکہ بندوق دغنے کی آواز سن کر بھی سامنے کھڑے بیہودہ حرکتیں کرتے رہے۔ اس روز استاد علی قلی نے اپنی توڑے دار بندوق سے پانچ آدمیوں کو نشانہ بنایا۔ دوسرے تفنگ اندازوں نے بھی اچھا کام کیا۔ ان کی گولیاں زرہوں تک کو توڑ گئیں۔ ڈھالوں اور چمڑے کے پردوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ شام ہوتے آٹھ دس بجوری مارے گئے اور پھر انہوں نے ڈر کے مارے دھسوں کے اوپر سر نہیں نکالا۔ رات ہوتے میں نے حکم دیا کہ آلات قلعہ گیری تیار کیے جائیں۔

جمعے کو صبح ہوتے ہی جنگی طبل بجوا دیئے اور سب عسکری اپنی اپنی مقررہ جگہ، زریں پہن، زینے لے کر پہنچ گئے...... اس دن بھی استاد علی قلی نے خوب کام کیا اور دو دفعہ آتش فرنگ (بندوق) چلائی...... محمد علی دنگ دنگ اور اس کے چھوٹے بھائی نے زینوں سے چڑھ کر برچھوں کے جواب میں تلواریں ماریں۔ بابا یساول فصیل پر چڑھ گیا اور تبر مار مار کر اس کو توڑتا رہا...... پھر اور سپاہیوں نے ہجوم کیا مگر فصیل کے اندر سب سے پہلے یہی داخل ہوئے...... چاشت کا وقت تھا جب کہ شمال مشرقی برج کو دولت بیگ کی جمعیت نے گرا لیا اور اندر گھس گئی۔ دشمن کو مار بھگایا اور عنایت الٰہی

سے ایسا مضبوط، زبردست قلعہ دو تین ساعت نجومی کے اندر لے لیا گیا۔

اہل بجور باغی بے دین تھے کہ اسلام کا نام تک اپنی قوم سے اڑا دیا تھا۔ لہذا انہیں قتل کیا اور بال بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ قیاساً کوئی تین ہزار مرد مارے گئے۔ تھوڑے سے قلعے کے مشرقی پہلو سے بچ کے نکل گئے۔ پھر میں قلعے کے معائنے کے واسطے داخل ہوا۔ فصیلوں، گلیوں، مکانوں میں مقتول پڑے تھے۔ چلنے والے لاشوں پر سے گزرتے تھے۔ سلطان بجور کے محل میں میرا قیام ہوا۔ یہ ولایت خواجہ کلاں کے تفویض کی گئی۔ نماز مغرب کے وقت میں اپنی لشکر گاہ میں واپس آ گیا۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجور والوں کا قلعہ نہ بہت بڑا تھا نہ مستحکم۔ انہوں نے آتشیں اسلحہ نہیں دیکھے تھے اور نہ کسی باقاعدہ فوج کے حملے کا سامنا کیا تھا۔ کرشی میں ایرانیوں کے قتل عام کرنے سے بابر کو بہت رنج ہوا تھا مگر یہ قلق بھی خود اسے شکست خوردہ پہاڑیوں کو بے تحاشا قتل کرانے سے باز نہ رکھ سکا۔

قلعے پر اس تیز و تند یورش کا حال پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دس برس کے عرصے میں بابر کی فوج کس قدر بدل گئی تھی۔ تربیت یافتہ سردار اپنا کام خوب جان گئے تھے۔ او خود شریک ہوئے بغیر وہ انہیں اپنے آپ کام انجام دینے کی اجازت دیتا تھا۔ دوست بیگ کے سوائے سرداروں کے نام بھی نئے نئے سننے میں آتے ہیں۔ غالباً یہ شمالی محاربات سے بچ کر آنے والے لوگ تھے۔ وہ اب ساز باز یا بھاگ جانے کی تدبیریں نہیں کرتے۔ ناخواندہ مگر جاں نثار قاسم بیگ کی جگہ خواجہ کلاں لیتا ہے جو ذی علم، سیاست داں اور عمر شیخ میرزا کے ایک وزیر فرغانہ کا فرزند

تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بابر کسی نہ کسی طرح یورپی اسلحہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان میں توڑے دار بندوقیں اور دو ایک توپیں بھی تھیں۔ یہ آتشیں اسلحہ اس کے پاس کس طرح پہنچے، یہ کیفیت تزک کے گزشتہ سالہ اوراق کے ساتھ گم ہوگئی۔ توپ و تفنگ چلانے والوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عثمانی ترک تھے جو دو تین پشت سے توپ خانے، حتیٰ کہ بڑی قلعہ شکن توپوں سے بخوبی آشنا ہو گئے تھے۔ البتہ کسی ترک کا ایرانیوں میں سے گزر کر جو ترکوں کے جانی دشمن تھے، اپنی فنی مہارت کے ساتھ کابل پہنچ جانا حیرت میں ڈالتا ہے۔ بہر حال یہاں اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ یہ کارگر ہتھیار اس وقت بحر خزر کے مشرق میں صرف بابر کے قبضے میں تھے۔ اسے ان کا بڑا شوق تھا اور وہ آئندہ برابر ان سے مفید کام لیتا رہا۔

سپاہیوں کی بہادری پر بدستور اس کی نظر رہتی تھی اور ان کی جانبازی کا دل کھول کر انعام دیتا تھا۔ وہ اس پر بھروسہ رکھتے تھے۔ اور اسی سے وہ وفاداری آئی جو مختلف اقوام کے افراد پر اس کی بادشاہی کی پختہ بنیاد بنی۔ اتنا ضرور ہے کہ قاسم بیگ کے بغیر بابر کی سنگدلی خونریزی کی روش بناتی چلی گئی۔

اپنے اہل خدمت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح بے تکلف ہونے کا ڈھنگ اسے خوب آتا تھا۔ وہ ان کے روزانہ مشاغل کی خبریں رکھتا۔ ایک دن لکھتا ہے کہ درہ خیبر سے ہم واپس آئے تو دوست بیگ کو بہت تیز بخار ہوگیا۔ ایک اور دن کی یادداشت میں ہے کہ "آج میری سب سے اچھی بہیر کھوئی گئی۔ میر شکار نے اسے لق لق اور قاز کو بڑی خوبی سے مارنا سکھایا تھا۔ وہ پہلے بھی دو تین دفعہ اڑ گئی تھی۔ شکار پر اس طرح

بے خطا جھپٹا مارتی تھی کہ مجھ جیسا اناڑی آدمی بھی نہایت کامیاب شکاری ہو گیا تھا۔ شکار میں اپنے آدمیوں کی کارگزاری دیکھنے میں بابر اسی قدر توجہ رکھتا تھا جیسی میدان جنگ میں۔ بڑے شکار کی خاطر اس کے عسکری کوچ ملتوی کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر لکھتا ہے: ''آج علی الصباح جنگل سے شیر کے دہاڑے کی آوازیں آئیں۔ دیر نہ گزری تھی کہ وہ باہر نکل آیا۔ ہمارے گھوڑے بے قابو ہو کر ایک دم ڈھالانوں، کھڈوں کی طرف بھاگے۔ شیر جنگل میں واپس چلا گیا۔ میں نے حکم دیا، جھاڑیوں کے پاس بھینسا لا کر باندھو کہ شیر پھر باہر آئے۔ وہ پھر دوڑتا ہوا نکلا۔ ہر طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی میں نے بھی ایک تیر مارا۔ خواجہ پیادہ نے بڑھ کر برچھا مارا تو اس نے بل کھا کے پھل کو منہ میں لے کر چپا ڈالا۔ تیروں کے بہت سے زخم کھا کے وہ پھر گھسٹتا ہوا جھاڑیوں میں جا گھسا۔ بابا یساول تلوار کھینچ کے پیچھے پیچھے گھسا اور اس کے جست لگانے سے پہلے سر پر تلوار ماری۔ ایک اور تلوار علی سیستانی کی کولھے پر پڑی۔ شیر (بھاگ کر) قریبی ندی میں کودا، وہاں اسے لوگوں نے مار ڈالا اور باہر کھینچ لائے۔ میں نے حکم دیا کہ اس کی کھال اتار کر الگ رکھو۔''

وادی سندھ میں تاخت کر کے گرمیوں کے آخری میں فوج واپس آ رہی تھی جب کہ درہ خیبر کے قریب جلسہ شراب نوشی کے لئے قیام ہوا۔ کسی مقام رئیس نے باریاب ہو کر تجویز کی کہ آفریدیوں پر حملہ کیا جائے۔ وہ درے کے نواہ میں فصل اٹھانے کے لئے بال بچوں سمیت مقیم تھے۔ بابر نے قبول نہ کیا اور کہا کہ مجھے اس وقت یوسف زئی کی فکر ہے۔ خواجہ کلاں کو سفر کی مختصر کیفیت لکھی تو خط کے حاشیے پر یہ

شعر خود گھسیٹ دیا

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را

کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہ مارا

اس کی مخاطب بی بی مبارکہ تھی (53) جسے حفاظت کی خاطر خواجہ کلاں کے پاس بجور چھوڑ گیا تھا۔

ہل ہل کی میخواری

بابر کوئی چیز معلوم کرنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ بجور میں بھورے بال، سفید چہرے کے بندر نظر آئے بڑی دیر تک ان کی حرکتیں دیکھتا رہا۔ معلوم ہوا مداری انہیں سدھا کر طرح طرح کے تماشے کرنے سکھاتے ہیں۔ کابل میں کسی عورت کو مے نوشی کرتے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خیال آیا کہ اس نادر چیز کا تجربہ کیا جائے ایک روز جمعے کی شام کوش راب کے مزے لے رہا تھا اور بارہ سالہ بیٹے ہمایوں کو مرغابیاں شکار کرتے دیکھ رہا تھا۔ آدھی رات تک نیند نہ آئی تو نوکروں کو چھوڑ کر چار باغ سے بازاروں کا گشت لگاتا ہوا چلا اور صبح ہوتے تردی بیگ کا کاریز پر پہنچا۔ تردی بیگ پستہ قامت ترک تھا جس نے فقیری چھوڑ کر سپہ گری اختیار کی اور فوج کا بہت اچھا سردار بنا تھا۔ ''وہ میرے آنے کی خبر سن کر چھوٹی چھوٹی ٹانگوں ہی سے دوڑا ہوا آیا۔ مجھے (بہ تصحیح مترجم) اس کی مفلسی کا حال معلوم تھا کہ اور کوئی ایک سو شاہرخیاں (سکے) ساتھ لے گیا تھا وہ اسے دیئے کہ شراب خرید لائے اور ایک بے تکلف جلسے

کا انتظام کرے۔ وہ بہزادی گاؤں کو شراب لانے گیا اس کا غلام میرا گھوڑا اینچے درے میں لے گیا۔ میں کاریز کے پیچھے ایک ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ کوئی ایک پہر میں تر دی بیگ شراب کی ایک ٹھلیا ایک ہم نے باری باری پینی شروع کی۔ تر دی کے پیچھے پیچھے قاسم برلاس اور شاہزادہ بھی آئے۔ ٹھلیا لاتے دیکھ کر انہیں شبہ ہوا اور تر دی بیگ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ میری ان کو خبر نہ تھی۔ غرض میں نے انہیں بھی بلا کر شریک صحبت کیا۔ تر دی بیگ نے کہا ہل ہل آنگہ (54) بھی آپ کے ساتھ شراب پینا چاہتی ہے۔ میں نے کہا "آج تک میں نے کسی عورت کو شراب پیتے نہیں دیکھا۔ اسے بلا لو۔"

اتنے میں ایک قلندر وہاں آ نکلا ہم نے اسے اور کاریز کے ایک نوکر کو بھی بلا لیا۔ جس نے عود بجایا۔ شام تک یہ جلسہ ٹیلے پر جما رہا۔ پھر ہم تر دی بیگ کے مکان میں گئے اور چراغ کی روشنی میں عشاء تک دور چلا بڑ مزے کی بے تکلف صحبت رہی۔ میں ذرا لیٹ رہا۔ دوسرے لوگ ایک اور مکان میں اٹھ گئے۔ آدھی رات کو ہل ہل آئی اور مجھے بہت دق کرنے لگی۔ میں نے نشے میں مدہوش گر جانے کا بہانہ کر کے اس سے پیچھا چھڑایا۔

عورت کا قصہ طے ہونے کے بعد اور دو دن تک باغوں کی سیر ہوتی رہی۔ موسم خزاں میں، صبح کے وقت یہ نہایت دلاویز ہوتے تھے۔ ان میں بابر انگور کھاتا اور مناظر قدرت کا لطف اٹھاتا رہا۔ ایک خزاں رسیدہ سیب کا درخت دیکھ کر خاص طور پر وجد کرتا ہے کہ "اس کے خزانی پتے اتنے حسین تھے کہ کسی مصور کا موقلم ایسے

نہیں بنا سکتا۔''

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شیر جسمانی تندرستی اور دماغ کی بیداری ایسی غیر معمولی رکھتا تھا کہ نشہ شراب سے مغلوب نہ ہو سکتا تھا۔ مگر اس حالت کو پہنچنے کے لئے وہ کبھی کبھی شراب میں دو آتشہ، سہ آتشہ 'عرق' ملا لیا کرتا تھا۔ پنجاب پر حملے کے دوران میں ایک دن پی کر دریا پر کشتی میں سوار ہوا۔ وہاں بھی عشا کے وقت تک ہم عرق پیتے رہے۔ جب اندھیرا بڑھا تو کنارے پر کشتی لگا کر گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ مشعلیں ہاتھ میں تھیں۔ گھوڑے دوڑاتے میں کبھی ایک طرف لڑھکتے کبھی دوسری طرف۔ میں نشے میں حیوان لایعقل ہو رہا تھا۔ دوسرے دن لوگوں نے بتایا کہ میں بگ ٹٹ گھوڑا دوڑاتا، مشعل گھماتا ہوا لشکر گاہ میں داخل ہوا تو یہ بات مجھے مطلق یاد نہ تھی۔''

بابر تنہا کبھی نہ پیتا تھا۔ شراب کشی کے جلسوں میں موسیقی اور گپ شپ ہوتی رہتی۔ تاہم شراب کے ساتھ معجون کھا کھا کر بھی جب لوگ متوالے ہو جاتے تو وہ ان کی خبر رکھتا تھا۔ لکھتا ہے کہ (بہ تصحیح مترجم) شرابی اور معجونی کی کبھی نہیں بنتی۔ ایک بار کشتی میں یاروں کے ساتھ شراب کی محفل جمی۔ آسمان پر قوس قزح بہار دکھا رہی تھی۔ کشتی میں عرق کا دور چل رہا تھا۔ عرق پیتے پیتے اکتا گئے تو ہم نے بھنگ پینی شروع کی۔ کشتی کے گوشتے والوں کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ وہ شرابیں پیتے رہے۔ نماز عشا کے وقت کشتی سے اتر کے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کافی دیر سے ڈیروں میں پہنچے۔ محمد (بیگ) اور گدائی یہ سمجھ کر کہ میں صرف عرق پی رہا ہوں، شراب کی ایک گھڑیا، کارگزاری دکھانے کو لائے۔ باری باری گھوڑوں پر اسے رکھ لیتے تھے۔ نشے

میں مگن اور مست ہو رہے تھے۔ کہنے لگے ''اس اندھیرے میں آپ کے لئے ہم یہ گھڑا بھر شراب لاد کر لائے ہیں۔ باری باری سے اٹھا کر چلتے رہے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ میں کچھ اور نشہ کر رہا ہوں۔ بھنگ نوش اور شراب خواروں کا مذاق مختلف ہوتا ہے۔ قریب تھا کہ آپس میں جھگڑا ہو جائے۔ میں نے کہا ''صحبت کا مزامت خراب کرو۔ جس کا جی چاہے شراب پئے اور جو چاہے بھنگ'' (معجون)...... چنانچہ اسی کے مطابق الگ الگ شغل ہونے لگا۔ بابا جان ''قابوس'' (ساز) نواز نے شاہی خیمے میں عرق پینا پسند کیا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھنگ نوشوں پر پھبتیاں کسنے لگے۔ بابا جان نشے میں دھت ہو کر واہی تباہی بکنے لگا۔ یہ لوگ تردی بیگ کو جام پر جام بھر کر پلاتے رہے کہ وہ بھی نشے میں بے سدھ ہو گیا پھر جو دھاندلی مچی، میرے سنبھالے نہ سنبھلی۔ ہنگامے اور دہشت نے مزا کرکرا کر دیا۔ اسی بے لطفی میں جلسہ برخاست ہوا۔''

بابر کا غوری اپنی حالت پر

شراب خواری کے ان بے محابا جلسوں میں، بلکہ دھینگا مشتیوں میں بھی اوقات نماز کا بار بار ذکر آتا ہے۔ یہ ازراہ تمسخر نہ تھا۔ فجر۔ دوپہر، سہ پہر، مغرب اور عشا کی اذان دن کے چند حصوں کی واضح نشانی تھی۔ بابر، وقت کا جسے اب ہم گھنٹوں میں شمار کرتے ہیں، اندازہ لگانے کا خاص مادہ رکھتا تھا (اس کے سامان میں گھڑی گھنٹے شامل نہ تھے اور نہ اس وقت تک یورپ میں بنتے تھے۔ بجز کچھ انگھڑ آلات کے۔

تاہم اس کے تعلیم یافتہ ترک اور ایرانی مصاحب ہیات کا علم ضرورت کے مطابق رکھتے تھے۔ ان کے تعلیم یافتہ ترک اور ایرانی مصاحب ہیات کا علم ضرورت کے مطابق رکھتے تھے۔ ان کے پاس برنجی تختیوں پر بڑے بڑے شہروں کے نام اور عرض بلد کھدے ہوئے ہوتے اور ایک ایک سوئی تاریخی قوس پر سایہ ڈال کر وقت کا اندازہ بتاتی تھی۔ سوئی کا رخ قطب شمالی کی طرف رکھا جاتا تھا۔ یہ ایک قسم کی ''ساعت نجومی'' یا گھڑی ہوتی جس کا بابر کی تحریر میں اکثر ذکر آتا ہے۔ دن کا آغاز غروب آفتاب سے کرتے اور سال قمری ہوتا تھا)۔

بابر کے ہم نشین مخمور ہونے کے متعین مقصد سے شراب پیتے تھے۔ (فرنگیوں کی طرح) کھانا کھاتے میں چسکی لگانا ان کے نزدیک فضول حماقت کی بات تھی۔ بابر کے اجداد خانہ بدوشی کے زمانے سے چھک کر پینے کے عادی تھے اگرچہ بعض لوگ نہیں بھی پیتے تھے۔ اس کے آخری چچا حسین بایقیرا کے ہاں یہ میخواری کے جلسے صرف سر شام یا سر شب جما کرتے تھے۔ عمر شیخ میرزا آگے چل کر آٹھ آٹھ دن رنگ رلیوں میں مست رہتا اور دونوں کا مزاج آخر میں، نشے میں یا بغیر نشہ بھی، غیر متوازن ہو گیا تھا۔ بابر بھی تیزی سے انہی کے قدم بہ قدم جا رہا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی تو زیادہ تر اسی کثرت شراب خواری سے جوانی میں مر گئے تھے۔ بابر سخت معرکوں کے وقت، کبھی کبھی پینی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ وہ اس عادت بد کی خرابیوں سے بے خبر نہ تھا۔ لکھتا ہے ''میں اپنے ہاتھوں زندگی بگاڑی ہے اور سوائے اس کے کہ خدا رحم فرمائے میرا شمار بھی دوزخیوں میں ہوگا'' اس کے تاثرات طرح طرح کے عجیب

ہوتے تھے جنہیں وہ اپنی خواہش کا نتیجہ سمجھتا ہے ارادہ کیا تھا کہ چالیس برس کی عمر میں شراب چھوڑ دے گا۔ اب جو یہ سال قریب آتا چلا تو اس نے اور زیادہ پینی شروع کر دی نئے باغوں میں انگور کی کثرت دیکھ کر اس سے رہا نہ جاتا اور سبزہ و گل کی سیر میں لطف مے کشی کا اضافہ کرنے چلتے چلتے گھوڑے سے اتر پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ پیچش اور تیز بخار میں خون بھی آنے لگا تو اسے اپنے اعمال، خصوصاً ہزل نویسی، پر پشیمانی ہوئی کہ جس قلم سے حضرت جامی کی تقلید میں اسمائے حسنہ لکھے جائیں، وہی قلم ہزل سے آلودہ ہو۔ نیت کر لی کہ آئندہ ایسی شاعری نہ کرے گا اور قلم توڑ ڈالے گا۔ پھر افاقہ ہوا تو کابل میں ایک دل پسند پہاڑی شراب کا چھوٹا سا حوض سرخ رنگ ساق سے بنوایا۔ یہاں گرمی کی راتوں میں رنڈیوں کے ناچ اور مطربوں کا گانا ہوتا۔ حوض کے کناروں پر اتنا شعر کھدوایا تھا جسے لافانی شاعری تو نہیں کہہ سکتے مگر افکار وہی تھے جو کبھی استادِ حیات حکیم عمر خیام، بلکہ خود حضرت جامی کے ذہن میں خلش پیدا کرتے ہوں گے:۔

”نوروز و نو بہار و مے و دلبرے خوش ایست
بر بہ عیش کوش کہ عالم دوبار نیست“

بابر ترنگ میں آ کر شعر کہا کرتا تھا، خواہ ناصحانہ ہوں یا رندانہ۔ تیموری دور میں اعلیٰ قابلیت کی نشانی یہی تھی کہ مضمون کے مناسب بندش الفاظ میں آدمی استادی دکھائے۔ اگرچہ ترکی شعر لکھنے میں بابر کو علی شیر نواحی سے سبقت لے جانا کبھی نصیب نہ ہوا۔ تاہم اس کے کلام میں گہرائی زیادہ ہے وہ متین خیالات کو نغمے کی زبان میں

ادا کرنے کا قدرتی میلان رکھتا ہے اس پر انابت کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ خواجہ احرار کے ارشادات کو ترکی میں نظم کرتا کہ عام لوگ بھی استفادہ کر سکیں۔ ضلع جگت میں اسے بہت لطف آتا اور بلاغت و بیان پر اس نے ایک مضمون لکھا تھا۔ ایک نیا رسم الخط ''بابری'' بھی ایجاد کیا تھا۔ شاعر پیشہ اشخاص سے مسابقت کرنے میں اسے باک نہ تھا مگر تعجب ہے کہ موسیقی کے معاملے میں احتیاط سے کام لیتا اور انوکھی، من مانی قسم کی راگنیاں نکالنے کے سوا، شاذونادر ہی کوئی ساز بجاتا ہوگا۔ ہاں دوسروں کے ساز بجانے پر اچھی یا بری رائے لگانے سے باز نہ رہتا تھا۔

سالہا سال وہ خود ایک بڑی مثنوی ''مبین'' لکھنے میں مصروف رہا۔ یہ اپنے بیٹوں ہمایوں اور کامران کو اس کی نصائح ہیں۔ ترکی زبان میں عقائد و اعمال کے سوا حکمرانوں کے مالی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثنوی کی طرز مولانا رومیؒ اور صوفی شعرا سے لی ہے۔ فلسفیانہ افکار اور عملی نصیحتوں کو گویا نظم لطیف کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ممکن ہے اپنے بیٹوں کو اسے پڑھنے میں ترغیب کے لئے یہ پیرایہ اختیار کیا ہو اور یا یہ کہ اپنے ذوق کی تسکین مقصود ہو۔ یہ مثنوی جزءً روسی میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا بابر کی ان تجاویز کا پتا ہے جو سرزمین افاغنہ سے اخذ محصول کے بارے میں اس نے سوچی تھیں۔ چونکہ آئندہ وارث ہونے والے بیٹوں کے واسطے لکی ہیں۔ لہذا انہیں اس کی آخری رائے سمجھنا چاہئے کہ وہ اس مفلس ملک کے مستقل کاشتکاروں اور قبائلی لوگوں سے کس طرح مالیہ وصول کرنا مناسب سمجھتا تھا۔ اسے پڑھ کر منکشف ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس مملکت میں تیموریوں کا وہ

جاگیرداری نظام جو سمرقند میں رائج تھا کہ بڑی بڑی جاگیریں امرا کو دے دی جاتی تھیں اور وہ بٹائی کے اصول پر مالیہ لے کر حکومت کو مقررہ محصول ادا کرتے تھے، چلانے سے دستکش ہو گیا تھا اور اس کی بجائے اراضی، گلے اور تجارت پر راہ رات محصول عاید کرنا چاہتا تھا۔ زمین کا مالیہ بہت کم رکھا تھا اور پیداوار کا لحاظ کیے بغیر پیائش پر شرح مقرر کر دی تھی کہ مزارعین کو زیادہ سے زیادہ کاشت کرنے کی ترغیب ہو۔ پھل کے درختوں پر خواہ کاشت کیے گئے ہوں یا خودرو، سالانہ پیداوار کا ایک عشر لگایا تھا۔ بھیڑ بکری کے گلوں پر فی صد ایک راس لی جاتی تھی۔ گائے بیل میں تیس پر ایک، گھوڑوں میں چالیس پر ایک جانور، اور اونٹوں پر پانچ پر کس سے ایک بھیڑ مقرر تھی۔ گلے والوں کو اختیار تھا کہ جنس کے بجائے اس کی قیمت سکے میں ادا کردیں۔ مقامی تاجر نیز آنے والے کاروانی تاجروں سے تہ بازاری یا درآمد کا محصول لیتے تھے اور غیر مسلم یعنی ہندو اور یہودی مال کا بیسواں حصہ ادا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کابل کے خزانے میں زیادہ تر اجنات جمع کی جاتی تھیں۔ اور ان کا بڑا حصہ بازار کے دکانداروں اور گلہ بانوں سے وصول ہوتا تھا۔ بابر کو ہمیشہ ٹوہ رہتی تھی کہ کوئی خرابی پیدا ہو تو خود تفتیش کرے۔ نئے نئے تجربوں کا شوق رج بہے (کاریزیں) بنوانے اور باغ لگانے سے پورا کرتا تھا۔ اور جگہ جگہ پھر کر باغ لگوانے کی بدولت ''باغبان بادشاہ'' (یا باغ ساز) کہلانے لگا تھا۔

گلبدن بیگم کے وقائع

بابر کے سرگزشتہ میں تیسری دفعہ پھر ایک خلا آتا ہے۔ یہ 1520ء کے اوائل میں جاڑے کے ایک دن سے شروع ہوا جس میں وخوشی خوشی قرآن مجید کی ایک سورۃ تلاوت کرتا ہے، پھر کابل آتے میں وہ ایک ندیوں کو پایاب عبور کرتا ہے اور مغرب کے قریب آرام لیتا ہے کہ گھوڑے جو (دانہ چارہ) کھالیں۔ یہاں سے تزک منقطع ہونے کے بعد پھر 1524ء میں وہاں سے شروع ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے جا رہا ہے۔ ان چھوٹے ہوئے سنین کے واقعات کا حوالہ کہیں کہیں آگے آیا ہے لیکن دوسری شہادتیں بہت کم میسر آتی ہیں۔ حیدر میرزا دوغلات ان دنوں سعید خاں سے منسلک تھا، جو کاشغر میں حکومت کر رہا تھا اور بلند پہاڑوں کے پار کے حالات سے اس کا قریب قریب کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ مورخ خواند میر صفوی دربار میں رک گیا اور کابل کے پہاڑی گوشہ گمنول کی خیر خبر لیے کے بجائے، بزرگ تر واقعات کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ بایں ہمہ قرآئن موجود ہیں کابل کی حالت اچھی تھی ذرائع آب پاشی کی بدولت فصلوں کی پیداوار بڑھ گئی اور باہر سے منگائی ہوئی قلمیں درخت بن کر پھل لانے لگی تھیں۔ سب سے بڑھ کر فلاح وخیر کا قرینہ یہ کہ دور دور کے خطوں سے جنگ وجدال کا بازار گرم تھا۔ عمال وعمائد پادشاہ کی مملکت میں نقل مکانی کر کے آرہے تھے۔ کہ امن وسلامتی کے علاوہ تھوڑی بہت خوش حالی سے بہرہ مند ہوسکیں۔ جھلے اور جنگ جو افغان قبائل آپس میں کشت وخون کرتے رہیں بابر کے انتظامات میں خلل ڈالنے کی اب جرات نہ کر سکتے تھے۔ وہ

ان پر پوری نگرانی رکھتا تھا۔شمال میں ازبکوں کی حکومت تھی۔وہ بھی افغانی ملکوں کی طرح گزر بسر کر رہے تھے۔

لیکن ان سنین کے بارے میں بلاتوقع ہمیں ایک نوجوان عورت کی شہادت ملنی شروع ہوتی ہے۔یہ بابر کی سن کہولت کی بیٹی گلبدن بیگم ہے جس نے ایک مدت بعد اپنے بھتیجے اکبر بادشاہ کی درخواست پر، خاندان کے بعض مردوں کی طرح، حالات زندگی قلم بند کئے تھے۔وہ بچوں کی اس نئی پود میں تھی، جن کی مائیں تیموری خاندان کی نہ تھیں اور جو مصائب گزشتہ کی پریشانی اور سمرقند کی عظمت رفتہ کے ملال واندوہ کی بجائے دربار کابل کی خوش دلی کی فضا میں پلے تھے۔گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ اس کے باپ کو سابقہ وطن کی یاد نہیں رہی تھی۔کم سے کم بابر اپنے چھوٹے بچوں سے سمرقند واندرجان کی باتیں نہیں کرتا تھا۔اور تقدیر کی کارستانی سمجھئے کہ اس کی تیموری نژاد تینوں بیویاں، کابل میں سکونت کرنے سے پہلے ہی اسے چھوڑ چکی یا فوت ہو چکی تھیں۔محل سرا میں ان غمناک واقعات کے ضرور تذکرے ہوتے ہوں گے۔جنہیں جنہیں گلبدن سنتی ہوگی۔ورنہ ثلث صدی میں یہی ایسا زمانہ تھا کہ اس خاندان کو محفوظ مامن کی تلاش میں رخت سفر باندھا نہیں پڑا۔نرسلوں والی، بل کھاتی ندی کے کنارے ٹیکرے پر قصر شاہی اور بالائی مرغزار میں چار باغ ان کے مستقل ٹھکانے بن گئے تھے۔شروع میں سن رسیدہ قاسم بیگ بیگمات میں مجمعے میں عہد رفتہ کی یادگار کے طور پر بزرگ ومشیر کی خدمت انجام دیتا تھا۔قلعے کے دروازوں کو کسی ہتھیار بند دشمن کی آمد کا خوف نہ تھا۔گلبدنگ بیگم لکھتی ہے کہ بابر کا کابل میں آنا اس

کے حق میں فال نیک ثابت ہوا ورنہ پہلے اس کے جتنے بچے ہوئے سب ضائع ہو گئے۔ کابل آ کر ایک نہ دو اٹھارہ بچے ہوئے اس سے بڑھ کر نیک فالی کا ثبوت اور کیا ہو گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ گلبدن بیگم توہم پرست نہ تھی بلکہ صحیح معنی میں مذہبی خاتون تھی۔ ان دونوں میں فرق کرنا چاہئے۔ سب سے بڑا بھائی ہمایوں پورا توہم پرست تھا۔ اپنے خوابوں کی تعبیروں اور دن کے شگونوں کی تلاش میں رہتا۔ دس برس کی عمر تھی کہ صبح باہر جانے تک اس کا اس نے شگون لیا۔ جس کا محل سرا میں مذکور ہوا۔ وہ سڑک پر راہ چلتوں کے نام دریافت کرتا کہ پہلا کون تھا، دوسرا، تیسرا کون، پھر تینوں نام لکھ کر مستقبل کا شگون لیتا۔ پرانے مصاحبوں نے سمجھایا کہ فال کے لئے ایک ہی نام کافی ہے۔ تین تین کو جمع کرنے سے الجھن پیدا ہو گی۔ مگر کمسن شہزادہ نہ مانا اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ تفاؤل میں جن تین کے نام آئے ان کے معنی: مطلوب، سلامت، فتح تھے۔ ہمایوں کو یقین ہو گا کہ یہ خدا کی طرف سے بشارت ہے کہ اس کی خوش حالی کی آرزوئیں پوری طرح بر آئیں گی۔ بابر کو رمالوں وغیرہ کا مدت سے اعتبار نہیں رہا تھا۔ لیکن افسردہ مزاج اور تنہائی پسند ہمایوں کی باتوں پر تحمل کرتا تھا۔ خان میرزا کا انتقال ہوا تو بدخشاں کی حکومت 13 سالہ ہمایوں کے تفویض کی اور اس کی ماں ماہم سمیت اس ولایت کی سرحد تک بیٹے کو پہنچانے آیا۔ کئی دن ٹھہر کر چیدہ چیدہ مشیر اس کے پاس چھوڑے کہ ہمہ وقت حال کے نگران رہے۔ دور رہنے کی یہ تجویز بھی غالباً ہمایوں کی خواہش کے مطابق بابر نے قبول کی تھی اور اسے برابر خط

لکھتا رہتا تھا۔ اگر چہ شکایت کرتا ہے کہ ہمایوں بہت کم اور مختصر جواب دیتا ہے۔

ہمایوں کے بدخشاں چلے جانے اور بابر کے باہر گشت لگاتے رہنے کی وجہ سے گلبدن کو بچپن میں بڑے بھائی، اور باپ کی معیت کا بہت کم موقع ملا۔ جب ذرا ہوش سنبھالا اور پہلی دفعہ سندھ کے پار باپ کے پاس آئی تو بہت ڈرتے ڈرتے پادشاہ کے سامنے گئی۔ محل سرا کی اکثر خواتین کی طرح وہ بھی نہایت دین دار لڑکی تھی اور اہل خاندان کے حق میں خدا سے رحمت وکرم کی دعائیں کرتی رہتی تھی لیکن باطنی علم واعمال سے واسطہ نہ رکھتی تھی۔

کابل کی چھوٹی سی سرکار میں، شاہی خاندان ''ایام بےتاج'' کے زمانے سے اب تک بہت کچھ بدل چکا تھا۔ محل سرا میں ایسان دولت جیسے ہٹیلے مزاج کی کوئی خاتون ''تاتاری مادر شاہ'' کی حاکمانہ شان سے حکم چلانے والی نہیں رہی تھی۔ ولی عہد (ہمایوں) ماں ماہم محل کے اندر گوشہ نشینی پر قانع تھی اور زیر نظر زمانے میں بیرونی معاملات کی طرف آنکھ اٹھا کے نہ دیکھتی تھی اگر چہ اس کا شوہر بار بار جاتا اور تماشا کرنے والے بندروں سے لے کر پشاور کی منڈی کے نفیس ریشم تک طرح طرح کے تحفے بیویوں، بچوں کو لا کر دیتا رہتا تھا۔ مگر نقد روپے کا انعام وہ صرف اپنے دو بیٹے کو عنایت کرتا تھا۔ افغان بی بی (مارکہ) کبھی کبھی اس کے سفر میں ہمراہ جاتی تھی۔ حیرت ہے کہ کابل کی حرم سرا میں وہ بہت ہر دلعزیز تھی جس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ وہ بے اولاد رہی۔ بہر حال کابل کے گوشہ سلامتی میں سبھی بیویاں خوش رہتی تھیں۔ بابر کی ہر بار مراجعت پر ان کا خوشی منانا اور ضیافتیں کرنا اسی خوش دلی کی

صریح دلیل ہے۔ ایک مرتبہ اس کے دل میں آئی کہ اپنی آمد کو چھپائے رکھا اور جب شہر کی ندی پر پہنچ گیا تب کہیں لوگوں نے اسے دیکھا۔ ایک دم سارے شہر میں گڑ بڑ مچ گئی۔ دونوں بڑے بیٹے پیشوائی کے لئے دوڑے۔ انہیں اتنا وقت نہیں ملا کہ (بہ تصحیح مترجم) گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے آدمیوں کی معیت میں قاعدے کے شہر کے باہر آ کے ملتے۔ شہر اور ارک کے درمیان پل پر ملے۔ بابر کو ان کی گھبراہٹ دیکھ کر بہت لطف آیا۔

اس کا کنبہ کچھ نئی طرح سے بڑھا۔ بہت سے پناہ گزین اس میں آ ملے۔ خانزادہ بیگم جس کا گلبدن پر بڑا رعب تھا، بچوں کو چارو ناچار ازبکوں میں چھوڑ آئی تھی۔ اسے گلبدن صحرائی بیگم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ایک علاتی بہن اپنے لڑکے سمیت شال سے فرار ہو کر آئی۔ خان میرزا متوفی کا بیٹا سلیمان، بابر کی پرورش میں دیا گیا تھا۔ اس نے اسی کو والئ بدخشاں نامزد کیا اور ہمایوں قائم مقام شاہ (یا والی) کر دیا گیا۔ کئی لڑکیاں اور بابر کا چھوٹا لڑکا عسکری محل سرا میں تعلیم و تربیت پاتے تھے۔ سلیمان بھی اسی زمرے میں داخل کیا گیا۔ ہرات، بلخ، بخارا سے اہل علم و ہنر بھاگ بھاگ کر کابل آتے تھے۔ خطاطی، دینیات، تاریخ، شعر شاعری اور ضروری السنہ سکھانے پر مامور تھے۔ اسی تعلیم و تربیت کی بدولت گلبدن فارسی قریب قریب اسی طرح بے تکلف لکھتی ہے جیسے اس کا باپ ترکی لکھتا تھا۔ اس نے اسے اپنی تزک کا نام نہیں دیا بلکہ "ہمایوں نامہ" موسوم کیا لیکن حقیقت میں وہ سارے خاندان ہی کی سرگزشت ہے جو اب ہندوستان پر حکومت کرنے کو ابھر رہا تھا۔

ممکن ہے ماہم امیر خاندان سے نہ ہو۔ اس کا ٹھیک حال اور خود لفظ کے معنی معلوم نہیں۔ گلبدن بیگم اسے ''آقم'' یعنی میری آقا لکھتی ہے۔ بہر حال وہ ولی عہد کی ماں اور محل سرا میں حاکم کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے چار بچے تھوڑے دن ہی جی کر ضائع ہوئے۔ جب چوتھا مرا تو اس نے ایک من مانی فرمائش کی اور بابر نے اس کی خاطر منظور کر لی۔ وہ ان دنوں بجور پر فوج لے جا رہا تھا۔ اگر چہ یہ تحریر کچھ دن بعد کی ہے کہ ''ہمایوں کی ماں کے کئی بچے ہوئے اور گزر گئے تھے۔ ہندال ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہم اسی نواح میں تھے جب ماہم کا خط آیا کہ اب جو بچہ ہو، خواہ بیٹا یا بیٹی، آپ مجھے دیں۔ میری قسمت سے جیتا رہے تو میں اسے پالوں گی۔'' میں نے جمعے کو یوسف علی (بہ تصحیح مترجم) رکابدار کو ڈاک دے کر کابل روانہ کیا۔ اسی میں ایک خط ماہم کو لکھ کر بچہ ہندال جو ابھی پیدا نہیں ہوا تھا، اسے دے دیا'' حاملہ ماں دلدار بیگم تھی۔ اسی کے ہاں آئندہ گلبدن پیدا ہوئی۔ وہ ماہم سے عمر میں چھوٹی تھی۔ پھر بھی شاہی بیگمات کبھی کبھی جو کسی کا بچہ گود میں لے کر پالتی تھیں وہ عموماً ادنی درجہ کی مائیں ہوتی تھیں اور پادشاہ (بابر) کے محل میں ایسا ہوا بھی نہ تھا۔ عجب نہیں بڑھاپا آتے دیکھ کر ماہم کو کسی اور کا بچہ پالنے کی ہڑک اٹھی ہو اور یا جب اپنے پیٹ کا بچہ زندہ نہیں رہا تو کسی اور بیوی سے پادشاہ کا فرزند پالنے کی خواہش ہوئی ہو۔ دلدار کو یہ بات ناگوار تھی مگر بادشاہ کا حکم مانے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

ماہم نے یہ درخواست بھی کی کہ پادشاہ خود فال لے کر بتائیں، بیٹا ہو گا یا بیٹی۔ بابر نے مضحکہ کیا کہ یہ سب عورتوں کے اوہام ہیں۔ تاہم بیوی کی خوشی پوری کرنے

کے لئے ایک بڑی بوڑھی عورت کو بلا کر دو نام باریک کاغذ پر لکھ کر الگ الگ چکنی مٹی کے اندر لپیٹ کر (یہ غلے) پانی کے پیالے میں ڈلوائے کہ ان میں سے جو پہلے گھل جائے اور اندر سے کاغذ نکل آئے اسی کے مطابق واقع ہوگا۔ اس موقع پر بابر لکھتا ہے کہ بیٹا ہونے کی فال نکلی۔ دو چار مہینے بعد دلدار کے ہاں بیٹا ہوا اور ماہم زور اقتدار سے دوسرے ہی دن بچے کو اپنے محل میں لے آئی۔ دلدار بیگم کو صبر سے انتظار کرنا پڑا کہ جب مناسب موقع ہاتھ آئے تو اپنے بچے کو واپس حاصل کرے۔ ("ہندال" یعنی ہندوالا، اس کا آگے چل کر عرف رکھا گیا تھا) مگر ماہم کو اسی پر سیری نہیں ہوئی اور چونکہ اپنا کوئی بچہ نہ رہا تھا (ہمایوں بھی باہر چلا گیا تھا) لہذا اس نے تیئس برس بعد پیدا ہونے والی گلبدن کو بھی طلب کر لیا۔ چنانچہ یہ لڑکی بھی اس وقت سے متلون مزاج ماہم کی نگرانی میں لے لی گئی، جب کہ کچھ سمجھ بوجھ آ گئی تھی۔ پھر بھی سب سے اہم شخصیت یعنی باپ کے آنے جانے کی اس مشکل ہی سے خبر ہوتی تھی۔ البتہ قلعے سے اس کی سواری کو نیچے ندی کی سڑک پر گزرتے دیکھا کرتی ہوگی جہاں انبوہ کثیر لہراتے جھنڈے لئے اس کے جلو میں حرکت کرتا اور آہستہ پیراستہ گھوڑے اچھی سے اچھی چال دکھاتے نظر آتے تھے۔

یہ 1525ء کی سردیوں کا ذکر ہے جب کہ سخت پالا پڑ رہا تھا۔ لیکن گلبدن بیگم نے بڑی ہو کر کتاب لکھی تو اس گزشتہ تاریخی واقعے کی نسبت صرف اتنا لکھا کہ "آفتاب برج قوس میں تھا جب پادشاہ ہندوستان کے لئے منزل بہ منزل روانہ ہوا۔"

اس کوچ میں چند منزل بعد ہمایوں کے بدخشاں سے امدادی فوج لے کر آنے

کا دو ہفتے انتظار کرنا پڑا۔ زمانہ قیام میں بابر ایک دیہاتی باغ میں ہر ہفتہ چار دن شراب نوشی کے جلسے کر کے دل بہلاتا رہا۔ چالیسویں سالگرہ سے شراب چھوڑنے کی نیت کی تھی۔ اس توبہ پر تو عمل نہ کر سکا مگر ہفتہ میں چار دن (ہفتہ، اتوار، پیر، منگل) شراب نوشی کے قرار دیئے۔ باقی دنوں میں معجون کا نشہ کرتا تھا۔ آخر سست قدم بیٹا لشکر میں پہنچا۔ بابر نے فوجی سرداروں کے روبرو سخت سست کہا۔ معلوم ہوا۔ کابل میں ماہم نے منت سماجت کر کے ہفتہ بھر تک ٹھیرائے رکھا تھا۔ آگے کوچ میں بھی ہمایوں برداشتہ دل ہی رہا۔ وہ اسے بھی ایک اور احمقانہ تاخت سمجھتا تھا۔ لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ اس مرتبہ بابر واپس کابل آنے والا نہ تھا۔

حملہ ہندوستان کی چیستان

بابر توضیح کرتا ہے کہ ''جس وقت سے میں نے ملک کابل فتح کیا، برابر ہندوستان کو زیرنگیں لانے کا منصوبہ سوچتا رہا۔ مگر میرے امرا کبھی تو فتنہ وفساد اٹھاتے، کبھی میرے بھائیوں سے مل کر سازشیں کرتے تھے، ان وجوہ سے میں اپنے ارادے پر عمل نہیں کر سکا۔ بارے یہ موانع راستے سے دور ہوئے اور اب اعلیٰ، ادنیٰ، عاقل یا احمق کوئی شخص (دربار میں) ایسا نہیں رہا جو اس لشکر کشی کی مخالفت کا دم بھرتا...... قلعہ بجور کو یورش کر لینے (1519ء) کے بعد سے میں خاص طور پر ہندوستان کے معاملات پر ہی متوجہ رہا۔''

مگر یہ وقوعے کے بہت بعد کی تحریر ہے جس ''زیب داستان'' کے لئے خیال

کرنا چاہئے کیونکہ سالہا سال جب شیبانی کے آگے سے سمرقند چھوڑ کر فرار ہوا تو کابل پر حملہ کرنے کی تفصیل سے کیفیت لکھی ہے، وہاں ہندوستان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ کہنا مشکل سے صحیح ہوگا کہ وہ سالہا سال سے اس حملے کا منصوبہ بنا رہا تھا یا اسے شمالی ہندوستان پر اپنے جدامجد تیمور کی فتوحات کے باعث کوئی دعویٰ پیدا ہو گیا تھا۔ سو برس پہلے تیمور کی یورش مال و دولت کی تلاش میں، قابل حیرت ایک جھپٹا تھا جو شہر دہلی کی الم ناک تباہی پر منتج ہوا اور حملہ آور نوے چھینے ہوئے ہاتھیوں کی قطار پر اموال غنیمت لاد کر سمرقند لے گیا۔ اس ایک صدی سے زیادہ مدت قبل کے حالات بابر نے تیموری محاربات کے سلسلے میں بار بار مطالعہ کئے اور وہ ان کی نوعیت سمجھتا تھا۔ دریائے سندھ کے پار کا قبل ازیں کوئی دعویٰ اس کو نہ تھا اور ادھر جو تاختیں کیں ان کی نسبت حیدر میرزا نے بھی اپنی تاریخ میں دور بیٹھ کر یہی مشاہدہ کیا کہ وہ ہندوستان میں کئی مرتبہ تاخت کر کے واپس ہوا۔'' دوسرے لفظوں میں یہ خانہ بدوشوں کے سے حملے تھے کہ جب تک کابل کا انتظام درست ہو، رسد حاصل کرنے کی غرض سے سرحد پار تک کئے گئے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ''سرحد پر پہنچ کر ہمیں خیال ہوا کہ بھیرہ نزدیک ہے۔ اگر ہم بھاری سامان چھوڑ کر آگے بڑھ چلیں تو عجب نہیں کچھ غنیمت اہل فوج کے ہاتھ آجائے۔'' صحیح ہے کہ 1519ء کی بجور کی مہم میں جب وہ سندھ پار کر کے اترا تو جیسا کہ بیان کرتا ہے، اس نے لوٹ مار کی ممانعت کی اور اس کی بجائے باشندوں سے باقاعدہ محصول لینے کا حکم دیا تھا۔ بلکہ کہیں کہیں رسمی طور پر محافظ دستے بھی متعین کر دیئے تھے لیکن اسے پلٹتے دیر نہ ہوئی تھی کہ یہ مٹھی بھر آدمی

نکال دیئے گئے۔ خود اس کا پورا لشکر اس مہم میں دو ہزار جنگ آزماؤں سے زیادہ پر مشتمل نہ تھا اور حقیقت میں بوسوں تک اس کی جمعیت اتنی نہیں ہونے پائی تھی کہ سندھ پار کی بے حساب آبادی کو زیرنگیں لانے کا خیال دل میں لاتا۔

البتہ 1525ء تک اس نے گھر کا انتظام درست کرلیا تھا۔ اور بے شبہ اتنی مدت میں سرزمین کابل کی مخلوط آبادی پر نہ صرف بادشاہ بننے بلکہ حکمرانی کرنے کا گر سیکھ لیا تھا اور یہ قابلیت بڑے صبروتحمل اور غوروفکر کی بدولت حاصل کی تھی۔ اپنے آخری حریف شاہ بیگ ارغون سے قندھار بھی چھڑ لے لیا تھا۔ ارغون جنوب کی طرف سندھ کی گرم سرزمین میں ہٹ گیا تھا۔ مغرب کی جانب بھی بادشاہ کی عملداری ایران کے ایسے ہی گرم ریگستان تک وسیع تھی۔ شاہ بیگ ارغون بدسگالی سے کہا تھا کہ بابر کی بڑھتی ہوئی فوج کو زیادہ زمین درکار ہو رہی ہے۔ لیکن اب اس کا انتقال ہو چکا تھا اور ادھر گھنے شاہ اسمعیل صفوی کو عثمان لی ترکوں نے بہ مقام چلدران 1514ھ میں ایسی قیامت کی شکست دی کہ حواس جاتے رہے اور پھر اس نے مشرقی اقطاع کو پریشان کرنے کی کبھی جرات نہ کی۔

قندھار بابر نے اپنے دوسرے فرزند کامران کو تفویض کیا اور خود کابل کے باغوں سے نہایت مایوس ہو گیا تھا۔ بیس برس تک مشقت جھیلنے کے بعد اب وہ اس ملک کو اپنا ملک اور یہاں کے باشندوں کو اپنی رعایا کہہ سکتا تھا۔ لکھتا ہے کہ ''ہماری آنکھیں اسی زمین اور یہاں والوں پر لگی ہوئی ہیں۔'' سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یکایک اسے کیا سوجھی کہ جو کچھ قدر قلیل حاصل کرلیا تھا، اس سب کی بازی شمالی

ہندوستان کی فتح کے لئے لگا دے؟ بابر نے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب کبھی نہیں دیا۔ اس کاروا داری میں لکھ دینا کہ سال ہا سال سے یہ منصوبہ باندھ رہا تھا، یا یہ کہ وہ ان ممالک پر جہاں بڑے بڑے ترک سلاطین اور خصوصاً امیر تیمور کی فرماں روائی رہی، کوئی حق وراثت رکھتا ہے۔ محض نمائشی باتیں ہیں اور آئندہ قرون میں اکثر تاریخ نویسوں نے انہیں صحیح سمجھ لیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر کابل سے ان سردیوں میں چلتے وقت تک وہ کوئی منصوبہ ایسے کام کرنے کا سوچتا جیسا کہ آئندہ دو سال میں فی الواقع اس نے انجام دے لئے، تو اس کی حالت کچھ ایسی مانی جاتی جیسی ایک بار اس نے تردی بیگ کی تحریر کی کہ وہ ''نشے میں پاگل'' ہو گیا تھا۔ اس کی فوجی تعداد پر نظر کیجئے کہ کوچ شروع ہوا اور ہمایوں کچھ تاخیر سے آ کر شریک ہوا تو باقاعدہ جائزہ لئے جانے پر لڑنے والے سپاہیوں کا شمار سات ہزار قلم بند ہو۔ بھیر میں خدمت گار، بار برداری وغیرہ کاموں کے جملہ آدمی پانچ ہزار تھے۔ اس برائے نام لشکر سے ہندوستان کی عظیم افواج کا مقابلہ کرنے کے لئے چل پڑنا کسی طرح خیال میں نہیں آتا۔ سکندر مقدونوی بابر سے زیادہ بے باک جرات رکھتا تھا اور اپنے آگے کے مشرقی ممالک کا بھی اسے نہایت مبہم تصور کیا تھا بلکہ ہندوستان کے دریاؤں کے پار قریب میں ایشیائی سمندر کے موجود ہونے کا یقین تھا، پھر بھی جب سرحد کے دروں سے نکل کر بڑھا تو کہیں بڑی فوج زیر علم تھی۔ بخلاف اس کے بابر بخوبی جانتا تھا کہ آگے کتنا وسیع ملک ہے۔ فی الواقع نے ان امور پر اچھی طرح غور و خوض کیا تھا۔

گمان غالب یہ ہے کہ اس مہم تقدیر آزمائی کا محرک بعض ذاتی مصلحتیں تھیں

جن کو تزک میں اس نے تحریر نہیں کیا۔ اس کی عمر بیالیس برس کے قریب ہو گئی تھی اور تیس برس ٹھکانا ڈھونڈ نے کی جدو جہد نے لازماً صحت پر اثر ڈالا تھا۔ جوانی میں اس کی قوت کا یہ حال تھا کہ ایک بار دونوں بغلوں میں ایک ایک آدمی کو دبائے ہوئے فصیل پر دوڑ لگائی اور ہر چند ابھی تک خاصی توانائی باقی تھی پھر بھی اکثر رشتہ داروں کا اپنے سامنے گزر جانا دیکھ کر اسے یہ ناگزیر خاتمہ ضرور یاد آتا ہوگا اور اسی کے ساتھ یہ خیال کہ پھر اس کے متعلقین پر کیا گزرے گی؟ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہی کا بوجھ اٹھائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اہل وعیال کے علاوہ ان آخری سنین میں بہت سے پناہ گزین کابل پہنچے اور اس نے ان کی خبر گیری بھی اپنے ذمے لے لی تھی۔ پھر قدم الخدمت امرا تقریباً سبھی صاحب اہل وعیال تھے اور انہیں حصے لگانے کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔

خود اپنے گھرانے کے بارے میں بابر کی تشویش کے اسباب کچھ خلاف معمول تھے۔ ان دنوں بابر کی عمر کے بادشاہوں کے عموماً کئی سیانے بیٹے ہوتے جو کبھی باپ کی خدمت و اطاعت میں اور کبھی اس کے خلاف ساز باز میں مصروف رہتے۔ بابر کے ابتدائی عمر میں بچے نہیں ہوئے۔ سب سے بڑا ایک ہمایوں تھا کہ سترہ سال کا ہو جانے کے باوجود نگرانی کا محتاج تھا۔ عسکری اور ہندال ہنوز بہت چھوٹے اور محل سرا میں پرورش پا رہے تھے۔ وہ گلبدن اور دوسری بہنوں یا ماؤں اور خاندان کی سن رسیدہ مستورات کی طرح خود کچھ کرنے کے لائق نہ تھے۔ بابر کو سلیمان سمیت ان بچوں اور بیبیوں کی کفالت کا خیال تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لڑکے جوان ہوں گے تو انہیں

کونسی ولایت یا جاگیر گزارے کے لئے دی جائے گی؟ خودساز ''پادشاہ'' کی دنیا سے رحلت کے بعد یہ پادشاہزادے اور کنبے کی بہت سی خواتین شاہی توقیر کے ساتھ کہاں رہیں گی اور کس طرح گزراوقات ہوگی؟ اس بات کو محض اتفاق نہیں کہہ سکتے کہ نئے مولود کا عرف ہندال ''ہندوالا) تجویز کیا گیا تھا۔

تنگنائے کابل کے مقابلے میں اپنی شمالی میراث کا حال بھی شیر کو پیچ و تاب میں لاتا ہوگا۔ آج وہاں کے تمام نامی گرامی بلاد پر ازبک خاں کی بادشاہی تھی۔ تاشقند، سمرقند، بخارا، کرشی وغیرہ اس کے باج گزاروں میں بٹے ہوئے تھے۔ مغلوں کے قدیم قانون ''یسا'' کا نفاذ ہو رہا تھا جس سے بابر کو سخت نفرت تھی۔ چچ ندی کی مہلک جنگ کے بعد تیموری سلطنت کی باقی اراضی جنگلی ازبک سرداروں میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ پھر تھوڑے دن کے لئے جو قزل باشوں نے اسے سمرقند میں شاہ شطرنج بنائے رکھا اس ذلت کی خلش بھی شیر کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔

تزک میں چند مرتبہ اس نیقدم یونانی متقنن سولن کا قول (جانے بغیر) اپنے لفظوں میں دہرایا ہے کہ آدمی کی زندگی کا اصلی صلہ وہ شہرت اور نیک نامی ہے جو مرنے کے بعد اسے حاصل ہو۔ امیر تیمور کے اس وارث کی نسبت جو عمر کے لئے سمرقند چھوڑ کر بھاگا، آئندہ نسل کے شاعر کیا لکھیں گے؟ بابر خود جو یہ شعر کہنے میں مشاق تھا، وہ آسانی سے تصور کر سکتا تھا کہ یہ نظمیں کیسی کیسی طعن آمیز ہوں گی؟ یہاں پھر ہمیں خیال آتا ہے کہ یہ محض اتفاقی بات نہ تھی کہ ہندوستان پر حملہ کرتے وقت اس نے لکھا کہ میں تیموریوں کی گزشتہ میراث واپس لینے چلا ہوں۔

غج ندی کی شکست نے اسے بہت مفید سبق دیا تھا۔ خود اس کا بیان تزک کے مفقود اوراق میں گم ہو گیا لیکن حیدر میرزا بتاتا ہے کہ ایرانی رسالہ جس کی وقت بے پناہ مانی جاتی تھی، اس کے غرور کی گردن کیسی عجیب طرح ٹوٹی۔ اس کا قول ہے کہ قزل باش سواروں کے دیوانہ وار حملوں کو عبید خاں کی اس جنگی تدبیر نے خاک میں ملا دیا کہ اس نے بخارا کے باغوں اور نہروں کے کنارے پیادہ تیر انداز لگا دئے تھے۔ جو ایرانی رسالے پر باڑیں مار رہے تھے۔ ان علاقوں میں پیادہ تیر انداز پہلے کبھی میدان میں نہ آئے تھے۔ اس مشاہدے کے علاوہ بابر کو یہ اطلاعات بھی ضرور پہنچی ہوں گی کہ مہیب سلطان سلیم (فاتح) نے تھوڑی مدت بعد چلدران کے معرکے میں ینی چری برقندازوں سے کیسا کام لیا۔ فوج آڑ لے کر پیدل لڑی اور اسمعیل صفوی کے سوار لشکروں کے پرخچے اڑا دیے۔ بابر نے خود بھی زرہ پوش پیادہ صفوں کو لڑانے کا تجربہ کیا اور اب اس کے قبضے میں یہ کرشمہ خیز آتشیں اسلحہ اور ان کے چلانے والے ترک استاد بھی آ گئے تھے۔ وہ جزئیات پر گہری نظر رکھتا تھا اور ضرور سمجھ گیا ہو گا کہ عجب نہیں نیزہ بردار سواروں کا دور ختم اور مورچہ بند پیادوں کا زمانہ آ گیا ہو۔ بہر حال جب وہ آمد سرما میں خیبر سے نکل کر چلا تو توڑے دار بندوقچیوں کی چیدہ جمعیت اور توپوں کی اچھی خاصی تعداد اس کے جلو میں تھی۔

بابر حملے کا ایک پہلو صرف عہد جدید والوں کے ذہن میں چیستان بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لشکر کابل کو نہ کوئی ملکی سرحد عبور کرنی پڑی نہ قدرتی۔ افسانہ نویسوں کو یہ بیان کرنے میں بہت مزہ آتا ہے کہ ازمنہ قدیم سے نیم وحشی حملہ آور

ہندوستان کے دروازوں یعنی درہائے خیبر وغیرہ سے آباد و مزروعہ ممالک ہند پر قبضہ جمانے کے لئے گھس آتے تھے۔ وہ قدیم آریوں، پھر سکندر یونانی اور آگے چل کر چنگیزوں و تیموری اور آخر میں بابر اور اس کے ترکوں کی آمد کا یہی نقشہ دکھاتے ہیں۔ کہانی بہت صاف اور ولولہ انگیز ہے لیکن صداقت سے بہت دور ہے۔ کوہ سلیمان اور ہندوکش کے جھرمٹوں سے قدرتی پہاڑی سرحد کا موہوم خیال دراصل انگریزوں کے زمانہ دراز تک ہندوستان خاص پر حکومت کرنے سے پیدا ہوا جب کہ انہوں نے شمال مغربی سرحد پر اپنی فوجی چوکیوں کا سلسلہ ان غضب آلود پہاڑوں کے دامن میں قائم کیا، جن پر کپلنگ کے زمانے میں پہاڑی قبیلے آباد تھے۔ جس دن یہ انگریزی چوکیاں اٹھائی گئیں وہ حد فاصل و حائل بھی باقی نہیں رہی۔ دریائے سندھ کے مشرقی طاس میں آج بھی پٹھان بستے ہیں۔ جیسے بابر کے عہد میں بستے تھے۔ کہانیوں کا خیبر آمد و رفت کے اور راستوں کے منجملہ ایک شارع عام ہے جو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ تاریخ کا صحت سے مطالعہ کیا جائے تو پہاڑی بلندیوں کے کنارے کنارے جاتی ہوئی کوئی حد فاصل نہیں ملے گی۔ حملہ آور آریوں سے پیشتر وادی سندھ کی تہذیب مغرب میں ہڑپہ (کنار راوی) اور پہاڑوں میں دبر کوٹ کے آگے تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر سکندر یونانی دریا کے راستے ساحل بحر تک جا کے رخصت ہوا تو اشوک راجہ عملداری میں وہ اقطاع شامل تھے جو کابل و قندھار کہلیت رہے صحرائی (چنگیزی) مغول جو خوارزمیوں کو شکستیں دیتے ہوئے بڑھے، سو وہ بھی بلا روک پہاڑوں کو طے کر کے دریائے گیر (سندھ) تک پہنچ گئے تھے اور

محض ہندوستان کے میدانوں کی گرمی کی تاب نہ لا کر واپس ہوئے۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی کی سلطنت کو ان پہاڑوں کے کے سلسلوں نے میدانی علاقوں میں دور تک پھیلنے سے نہیں روکا۔

اگر کوئی قدرتی سرحد تھی تو وہ عریض اور طغیان آور سندھ دریا جو پہاڑی دروں سے پچاس تا سو میل آگے بہتا ہے۔ بابر نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو یہ بھی مشاہدہ کیا کہ دریا کے دوسری طرف زمین کی ہیات بدل جاتی ہے۔ پھر کابل کے صاف مطلع کی بجائے ہندوستان کا ابر آلودہ آسمان چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ کسانوں کے گاؤں اور پالتو جانوروں کے گلے تک،شہری،تمدن، کھلے میدانوں کی تجارتی سرگرمی ،نیز بارانی زراعت کے اثرات سے بدلے ہوئے ملتے ہیں۔ انتہا یہ کہ پرندے اور جنگلی جانور بھی مختلف ہیں۔

دین اسلام ،مشرق میں جہاں سلاطین دہلی کی حکومت رہی ، بہت آگے تک نفوذ کر چکا تھا۔ بعید گنگا کی ایک بڑی معاون (جمنا) کے کنارے گرمی باری دلی اور سندھ دریا کے مابین پانچ ندیوں کی زرخیز زمین پنجاب واقع تھی جسے بالائی سندھ اور اگلی ندیاں قطع کرتی ہوئی گزرتی تھیں۔ سرسبز پنجاب کے جنوب میں تھل کا بھیانک ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ آثار قدیمہ کی شہادتیں بتاتی ہیں کہ ہند کے عظیم جزیرہ نما کا یہ گوشہ کبھی الگ الگ ٹکڑوں میں حد بند نہیں رہا بلکہ صدیوں سے مختلف اقوام و ملل، کاروانوں، تاجروں کی عام گزرگاہ تھا۔ یہیں ٹیکسلا کا قدیم شہر آباد تھا جہاں چین و ایران کی بعض صناعیوں کا اتصال ہوا۔ گندھارا کے مندروں میں وہ بت تراشے گئے

جنہیں یونان کے تربیت یافتہ ہاتھوں نے بنایا تھا۔ یہاں کی شاہراہوں سے بیش سے بیش بہا اجناس کے وہ قافلے گزرا کرتے تھے جن کی کبھی کبھی مال سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطاروں کی صورت میں بابر نے اندجان میں جھلک دیکھی۔

القصہ بابر کابل ندی کے کنارے کنارے خیبر کی سرخی مائل پہاڑوں کے درے سے نکل کر آیا تو وہ کسی جدا گانہ معاشرے کو چھوڑ کر کسی دوسری نئی قوم پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے کافی مدت پہلے 1519ء میں بھی پنجاب کے دورے دریا (چناب) تک دیکھ بھال کر گیا تھا۔ اپنے محرکات کی تو اس نے صراحت نہیں کی کہ آج چار سو برس بعد ہم محض قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں لیکن اس کی منزل مقصود خاصی طرح واضح تھی۔ وہ مانوس، سایہ دار پشاور سے چل کر بالائی سندھ کو قلعہ پر عبور کرنا، پھر نمک کے پہاڑوں سے گزر کر ملک پنجاب پر چھا جانا چاہتا تھا۔ دلکش راوی کے کنارے پنجاب کے صدر مقام لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب پر اپنا تسلط مضبوطی سے قائم اور اسے سلطنت کابل میں شامل کرنا مقصود تھا۔ مفتوحہ ملک کی قدرتی سرحدیں جنوب میں تھر اور شمال میں ہمالیہ، ہندوکش کے کوہستان ہوتے۔ وہ اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ پنجاب کو زیر نگیں لانے میں، ایک منزل آگے دہلی کے طاقتور بادشاہ سے اسے کوئی نہ کوئی تصفیہ کرنا ضروری ہوگا۔ مدتوں پہلے وہ دیکھ چکا تھا کہ جب تک سمرقند پر قبضہ نہ ہو فرغانہ کی چوڑی پٹی ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔ یہاں ضروری تھا کہ دہلی کو مصالحت سے یا بزور معطل بنا دیا جائے۔ کیونکہ ٹھان لی تھی کہ پنجاب کا خطہ فراخ اپنا، اور لاہور کو دوسرا کابل بناؤں گا تاکہ گنگا کی بالائی وادی سے

آمو کی بالائی وادی بدخشاں تک میرا حکم چلے۔ نیچے تپتے ریگستان اور اوپر وسط ایشیا کے بلند کوہستان ان کے پاسبان رہیں۔

وہ راز کی بات جس کی بابر نے اپنے سپہ سالاروں اور فرزند ہمایوں کو بھی خبر نہ کی، یہ تھی کہ جب تک اس کی فتوحات پکی نہ ہو جائیں وہ سندھ کے پار ہی ٹھیرا رہے گا۔ اسے آئندہ پناہ گزین بننا منظور نہ تھا۔ اور اب کے اس ارادے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابر پلٹ کر پھر کبھی کابل نہ آیا۔

باب ہفتم ::پانی پت اور کنواہہ

کابل سے حتمی کوچ!

1525ء کے ناخوش گوار دسمبر میں جو لشکر خیبر کے نلے سے نکل رہا تھا اس کی رہنمائی کاملاً بابر پر منحصر تھی۔ تنہا اسی کی ذات خیل وسپاہ کی تقویم کا باعث تھی اور خود اسے اپنا عزم فقط اس امید پر دھکیلے لئے جا رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اقبال اس کا یاور ومددگار ہو جائے گا۔

مگر بابر تقدیر کی نیرنگوں سے ناواقف نہ تھا۔ سفر میں دوبارہ پیچش ہوئی اور سینے سے خون آیا۔ اور ایک سال قبل تقدیر ہی نے (یا اس کی اپنی بے تدبیری نے) لاہور سے اس کی فوجوں کی واپسی پر مجبور کیا تھا جب کہ وہی حلیف جنہوں نے اسے پنجاب آنے کی دعوت دی، پلٹ گئے اور اس کی مٹھی بھر فوجوں کو اکیلا چھوڑ دیا جو بادشاہ دہلی کا کسی طرح مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ تاہم بعض محافظ دستے وفادار سرداروں کے ماتحت، قلعوں میں ڈٹے رہے۔ یہ قلعے پنجاب کے دوآبوں میں واقع تھے اور بابر کا انہیں گھیرے سے نکالنا لازم تھا۔ اپنے بخار اور خون آور کھانسی کو اس نے اپنی توبہ شکنی کے گناہ کی سزا خیال کیا۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق:

(''جس نے اپنا عہد توڑا، سو اپنی ہی جان پر توڑا، اور جس نے پورا کیا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے تو اسے وہ جلد اجر عظیم دے گا۔'')

لکھتا ہے کہ ''میں نے بار دگر توبہ اور ضبط نفس کا ارادہ کیا کہ آئندہ غیر مشروع خیالات دل میں نہ لاؤں گا نہ زبان سے ان کا اظہار کروں گا۔ اپنا قلم میں نے توڑ دیا...... اس شام کوچ کر کے علی مسجد میں ٹھہرا (خیبر کے دہانے کا قلعہ) یہاں گھاٹی تنگ ہوگئی ہے۔ میں ہمیشہ ایک ٹیکری پر اپنے خیمے نصب کراتا ہوں۔ رات کو نیچے لشکر گاہ میں الاؤ جلائے گئے تو خوب روشنی اور عجیب طرح کا چراغاں کا لطف آیا اسی لئے میں اس منزل میں شراب پیا کرتا ہوں۔ اس مرتبہ بھی پی...... سحر سے پہلے معجون کھائی اور دن کو روزہ رکھا۔ دوسرے دن لشکر گاہ سے گینڈوں کی جھاڑیوں کی طرف چلے۔ بگرام (پشاور) کے قریب رود سیاہ کو عبور کیا اور بہاؤ کے رخ حلقہ بنا کے چلے۔ اتنے میں کسی نے خبر دی کہ قریب کی جھاڑیوں میں ایک گینڈا ہے۔ سواروں نے درختوں کے اس جھنڈ کو گھیر لیا۔ ہم باگ ڈھیلی چھوڑ کر حلقے میں شامل ہوئے۔ غل شور مچانے سے گینڈا جھاڑیوں کے اندر سے نکل آیا۔ ہمایوں اور پہاڑ سے آنے والوں نے کبھی گینڈا نہ دیکھا تھا انہیں اچھا تماشا ہاتھ آیا۔ کوئی کوس بھر تک تیر مارتے ہوئے پیچھا کرتے گئے۔ گینڈے نے کسی آدمی یا جانور پر حربہ نہیں کیا اور وہ اور دو اور گینڈے گرائے گئے۔ بہت دن سے میرے دل میں تھا کہ ہاتھی اور گینڈے کا مقابلہ کرا کے دیکھا جائے۔ اس شکار میں مہاوت ہاتھی کو لائے۔ گینڈا ہاتھیوں کی جانب جھپٹا مگر جب ایک مہاوت نے ہاتھی کو آگے بڑھایا تو وہ سامنے نہ ٹھہر سکا، بلکہ دوسری طرف دوڑ گیا۔

اس دن بگرام آ کر میں نے چند (کل 6 یا 7) سرداروں اور تخشیوں کو مقرر کیا

کہ دریا کے معبر پر کشتیوں کا انتظام کریں اور سب اہل لشکر کا جو دریا اتریں نام لکھے جائیں۔ اس رات مجھے اسہال اور کھانسی میں خون آیا۔ بہت فکر ہوئی، لیکن خدا کی رحمت سے دو تین روز میں آرام ہو گیا۔ ہم بگرام سے چلے تو بارش ہونے لگی۔ اگلی منزل کابل ندی پر کی۔

یہاں خبر ملی کہ دولت خاں اور غازی خاں نے (جو پہلے بابر کے حلیف تھے اور اب حریف تھے) بیس تیس ہزار آدمی جمع کر لئے اور کلانور فتح کر کے اب لاہور پر چڑھائی کرنے والے ہیں (جہاں بابر کا محافظ دستہ متعین تھا) فوراً ایک قاصد سرپٹ دوڑایا گیا کہ ہمارے آدمیوں کو خبر دے کر "ہم منزل بہ منزل آ رہے ہیں۔ ہمارے آنے تک لڑائی نہ کریں۔"

ہفتے کو آب سندھ سے عبور کیا اور دوسرے کنارے پر اترے، جن سرداروں کے سپرد کشتیوں کا انتظام تھا انہوں نے خبر دی کہ فوج میں اچھے برے، چھوٹے بڑے، سپاہی اور نوکر سب ملا کر بارہ ہزار لکھے گئے۔

امسال میدانوں میں بارش بہت کم ہوئی لیکن دامن کوہ میں اچھی ہوئی اور مزروعہ اراضی کو سیراب کر گئی۔ اسی لئے میں نے پہاڑوں کے نیچے نیچے سیالکوٹ کا راستہ اختیار کیا۔ ککھڑوں کا علاقہ طے کرتے ہیں ایک ندی ملی جس کے بیٹے میں جگہ جگہ چھتر (چھوٹے جوہڑ) بن گئے تھے اور ان سب میں پانی کوئی ہاتھ ہاتھ بھر منجمد ہو گیا تھا۔ اتنی برف ہندوستان میں شاذونادر پڑتی ہے۔ آئندہ جتنے سال میں ہندوستان میں رہا میں نے اس طرح کی یخ کبھی نہیں دیکھی۔

سندھ سے پانچ منزلیں چل کر چھٹے پڑاؤ میں ایک دن اور ٹھیر گیا کہ لوگ سامان رسد حاصل کرلیں۔ اس روز ہم نے عرق پیا۔ ملا پرغری نے طرح طرح کی کہانیاں سنائیں۔ اسے اتنا بولتے نہیں دیکھا تھا۔ ملا شمس بھی آپے سے باہر ہو گیا۔ پینے پر آیا تو رات گئے تک بس نہیں کی۔ ہر قسم کے اہل لشکر جو غلہ لینے گئے تھے، کھیتوں کو چھوڑ دور تک جنگلوں پہاڑیوں کے اندر گھس گئے کہ شاید کوئی قید پکڑ لائیں۔ اس بے احتیاطی کی بدولت خود اپنے کئی آدمی ضائع کروا آئے۔

اگلے روز جہلم کو پایاب جگہ سے عبور کیا اور کناروں پر منزل ہوئی۔ ولی (بہ تصحیح مترجم) قزلی نے حاضر ہو کر سیالکوٹ کو (جو اس کی تحویل میں دیا گیا تھا) چھوڑنے کی مجبوری بیان کی۔ میں نے کہا تم سیالکوٹ میں نہ رہ سکے تھے تو دوسرے امرا کے پاس لاہور کیوں نہیں چلے گئے؟ اس کا معقول جواب نہ دے سکا لیکن فوج کشی کا موقع تھا، اسے سزا نہیں دی۔ اسی پڑاؤ سے سید طوفان اور سید لاچین کو ایک ایک کوتل گھوڑا دے کر روانہ کیا کہ سرعت سے لاہور جا کر سرداروں سے کہیں کہ وہاں لڑائی نہ لڑیں بلکہ ہم سے سیالکوٹ یا پسرور آ کر ملیں۔'' افواہ سنا تھا کہ غازی خاں نے چالیس ہزار فوج فراہم کر لی ہے اور دولت خاں نے دو دو تلواریں کمر سے باندھی ہیں اور جنگ پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے مثل یاد آئی کہ ''نو سے دس اچھے'' اور دل میں کہا کہ جب تک لاہور کے سردار آ کر شریک نہ ہو جائیں، جنگ کرنا ٹھیک نہ ہو گا۔ ان کا انتظار کرو۔'' قاصد بھیج کر ہم چناب کی طرف چلے اور اسے اتر کر دوسرے کنارے پڑاؤ لگایا۔ میں کنارے کنارے سیر کرتا ہوا ایک پہاڑی تک گیا

جہاں دریا کی گہری شاخ کے اوپر قلعہ بنا ہوا ہے ۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی ۔ ارادہ کیا کہ سیالکوٹ والوں کو یہاں لا کر بسایا جائے (سیالکوٹ میں پانی کے خراب ہونے کی وجہ سے) خدا نے موقع دیا تو ایسا کیا جائے گا۔ پھر کشتی میں بیٹھ کر لشکر گاہ کو واپس آیا۔ کشتی میں مے کشی کا جلسہ جما۔ بعض نے عرق ،بعض نے ہلکی جو کی شراب ('' بوزہ'') پی۔ بعض نے معجون کھائی۔ نماز عشا کے وقت میں کشتی سے اترا ۔ میرے خیمے میں آ کر بھی کچھ شراب پی گئی۔ گھوڑوں کو آرام دینے کے لئے ہم یہاں ایک روز اور ٹھیرے ۔

جمعے (29 دسمبر) کے دن سیالکوٹ میں اترے ۔ ہر دفعہ جب ہندوستان آیا، جاٹ گوجر اپنے پہاڑی جنگلوں سے نیچے اتر کر گائے بھینسیں لوٹ لے جاتے تھے ۔ یہ منحوس لوگ اس ملک کے لئے بلائے جان ہیں۔ اس مرتبہ ہم نے ملک اپنے زیر نگیں لیا ہے مگر یہ موذی پھر لوٹ مار کرنے اترے ۔ جب سیالکوٹ میں لشکر پڑا تھا تو بستی سے پڑاؤ آنے جانے والوں پر بھی انہوں نے دست درازی کی اور ہنگامہ مچایا ۔ اچھے بھلے آدمیوں کے کپڑے اتروا لئے ۔ میں نے چوروں کو ڈھنڈوا کر پکڑا اور دو تین کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیئے ۔

سیالکوٹ سے ایک سردار کے بھائی شاہم کو سرپٹ لاہور بھیجا کہ لاہور کے حکام سے دشمن کی صحیح خبر لائے کہ وہ کہاں ہے اور ہم کس طرح مقابلہ کریں گے ۔ تاکید کر دی کہ قابل اعتماد آدمی کو بھیج کر معلوم کریں اور ہم اطلاع دیں ۔

پڑاؤ پر ایک سوداگر نے خبر سنائی کہ ''عالم خاں نے سلطان ابراہیم سے شکست

کھائی۔"

پھر وہ سب سازش کرنے لگے

شیر کا یہ کوچ جس میں وہ دو دو تین تین منزلیں مارتا ہوا پنجاب کی ندیاں عبور کرتا ہوا چلا، اپنے آزمودہ کار ترک سرداروں کو گھیرے سے نکالنے کی غرض سے تھا۔ ان سرداروں کو لاہور میں ڈٹے رہنا کا حکم تھا اور وہ سازباز بغاوت، بدعودی کے اس طوفان میں جو ہندی مسلمانوں میں آیا ہوا تھا، اپنی مفوضہ خدمت بڑی ہنرمندی سے انجام دیتے رہے۔ ہندوستان میں دغا اور بے وفائی کا یہ ساز غالبا سلطان ابراہیم لودھی کے مزاج کے وجہ سے جنبش میں آیا کہ وہ ایک لائق باپ کا تنگ دل حریص بیٹا تھا۔ 1518ء میں اس کے باپ (سکندر لودھی) نے تقریباً سالم "ہندوستان" ترکے میں چھوڑا تھا جس کی حدود گنگا سے سندھ تک وسیع تھیں اور کئی طاقت وررا جپوت ریاستیں اس میں شامل کر لی گئی تھیں۔ لیکن ابراہیم نیب ادشاہ ہو کر اپنے اکثر بڑے بڑے امرا کو دشمن بنالیا جو نسلاً افغان اور طبعاً سرکش تھے۔ سن رسید عالم خاں، ابراہیم نے جبرا بادشاہی چھین لینے کی تگ و دود میں سندھ پار کابل گیا کہ بابر ہی ایک بیرونی بادشاہ مدد دینے کے قابل نظر آتا تھا۔ عالم خاں کا بھتیجا دولت خاں ابراہیم کی طرف سے پنجاب کا صوبہ دار تھا، اس نے اپنے لئے الگ یہی درخواست کی تھی۔ امرئے ہند کی اس دہری غداری ہی سے بابر کو ترغیب ہوئی اور گزشتہ سال وہ لاہور تک تاخت لایا تھا۔ اس کی فوج تعداد میں کم، لیکن ایک ہی

پیوستہ، باقاعدہ جمعیت تھی جو ایک خاص مقصد لے کے **ملک** میں داخل ہوئی اور مزاحمتوں کو بلا دقت ہٹاتی ہوئی دلکش راوی کے کنارے لاہور پہنچ گئی۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ بڈھا دولت خاں سارا پنجاب خود لینے کی امید لگا رہا ہے، حالانکہ یہی وہ صوبہ تھا جسے بابر اپنی سلطنت کابل سے الحاق کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ ابھی تک دہلی یا وہاں کی حکومت پر کسی حملہ کرنے کا خیال اسے نہ آیا تھا۔

اسی سال جب بابر واپس کابل گیا کہ بلخ کی طرف جو فتنہ فساد ازبکوں نے برپا کیا تھا، اسے فرو کرنے کے لئے ہمایوں کی مدد سے تازہ افغانی فوج بھرتی کرے، تو یہاں دولت خاں اور اس کے بھتیجے غازی خاں نے اپنی فوجیں تیار کرنی شروع کیں کہ پنجاب میں متعین کابلی جمعیتوں کو نکال باہر کریں۔ انہوں نے بابر کی سپاہ کو دو حصوں میں بانٹ دینے کی بھی تدبیر کی تھی اور اگر اسے دولت خاں کا بیٹا دلاور خاں بروقت ان کے فریب کی اطلاع نہ دے تو عجب نہیں بابر کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا۔ پھر گزشتہ گرمیوں میں سن رسیدہ عالم خاں دوبارہ دربار کابل میں ایک نئی یہ تجویز لے کر آیا کہ بابر، دولت اور غازی خاں کی سرکوبی کے علاوہ، قابل نفرت مگر طاقتور ابراہیم لودھی کو دہلی سے دفع کرے کہ عالم خاں کا تخت و تاج پر قبضہ ہو جائے اور پھر اپنا مرغوب خاطر صوبہ پنجاب وہ شوق سے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یہ قرارداد کر کے عالم خاں اس پیرانہ سالی میں افتاں وخیزاں پھر سندھ کے پار واپس گیا۔ لیکن اب جو اصل مقام معرکہ میں بابر آیا تو رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ عالم دولت خاں اور جو لاہور کی محافظ فوج کے نام بابر کے خط لایا تھا باغیوں کے صدر گروہوں، یعنی دولت خاں اور

غازی خاں سے خود مل گیا اور ان میں یہ نئی سازش کی کھچڑی لگائی گئی کہ تینوں مل کر ابراہیم سے دہلی چھین لیا اور ادھر بابر کے لاہوری دستے کا قلع قمع کر کے اسے بڑھنے سے روکے رکھیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ بابر کے پاس جنگ آزما سپاہیوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔ چنانچہ بابر پریشان ہو کر جلد سے جلد لاہور آ رہا تھا اور اپنے دشمنوں کے ٹھیک ٹھیک مقام، ارادوں اور لشکروں کی صحیح خبروں کا جویا تھا۔

سازشوں کا دھواں اس کے گرد چھایا ہوا تھا۔ لیکن اصلی طاقت ور حریف دھوئیں کے عقب میں ابراہیم لودھی ہندوستان خاص کا فرماں روا تھا جس کی فوجیں دہلی و آگرہ میں پڑی تھیں اور دوسرا، راجپوت ریاستوں کا وہ جتھا جو مسلمانوں کے خلاف آگے جنوب میں گٹھ جوڑ کر رہا تھا۔ اس طرف سے پہلی اطلاع بابر کو جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ ملی کہ عالم خاں نے ابراہیم لودھی سے شکست کھائی۔ اس کی تفصیل بابر نے اس طرح تحریر کی ہے: '' کابل میں مجھ سے رخصت ہو کر عام خاں، سخت گرمی اور ساتھیوں کو تکلیف ہونے کے باوجود دو دو منزلیں روزانہ طے کرتا ہوا، لاہور گیا۔ انہی ایام میں ازبک سرداروں نے بلخ پر پیش قدمی تھی لہذا میں فوراً ادھر چل پڑا۔ عالم خاں نے لاہور میں میرے سرداروں سے اصرار کیا کہ ہمیں غازی خاں سے مل کر دہلی آگرے پر فوج کشی کرنی چاہئے۔ یہی پادشاہ کا حکم ہے۔ میرے سرداروں نے جواب دیا۔ ہم غازی خاں پر کیونکر بھروسہ کریں۔ ہمیں بادشاہ حکم دے چکا ہے کہ جب تک دربار کابل یا لاہور وہ یرغمال نہ بھیجے، اس کے ساتھ میل نہ کیا جائے۔ تمہیں وہ شکست دے چکا ہے۔ تم کس برتے پر اس سے اتحاد کرتے ہو۔ اور اس اتحاد کا فائدہ بھی کیا ہو گا؟ یہ کہہ کر

انہوں نے انکار کر دیا۔ عالم خاں نے اپنے بیٹے شیر خاں کو دولت خاں اور غازی خاں کے پاس بھیجا اور پھر سب نے مل کر یہ سازش پکائی کہ دولت اور غازی تو ادھر (پنجاب) کے سب قلعوں کو سنبھالیں اور عام خاں دوسرے امراء کو ہمراہ لے کر دہلی اور آگرے پر قبضہ جمائے...... چنانچہ وہ منزل دہلی دروانہ ہوئے۔ اسے گھیرے میں تو لے لیا۔ لیکن نہ وہاں کی فوج کی ناکہ بندی کر سکے نہ یورش کر کے شہر فتح کر سکے۔ ان کی سپاہ شمار میں کم و بیش تیس ہزار ہو گی۔ سلطان ابراہیم کو ان کے مقابلے میں آنے کی خبر ہوئی تو فوراً سوار فوج تیار کر کے لڑنے آیا۔ اہل سازش اپنی لشکر گاہ سے اس کا سامنا کرنے چلے مگر آپس میں بحث کر کے طے کر لیا کہ ''دن کے وقت لڑائی ہوئی تو بد دل افغاں جو ابراہیم کے لشکر میں ہیں، بدنامی کے ڈر سے اسے چھوڑ کر ہمارے پاس نہیں آئیں گے، لیکن رات کے وقت حملہ کیا جائے جب کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا تو ہر کوئی اپنا اپنا راستہ لے گا۔''

''دو ان دن سہ پہر کے بعد وہ کوئی چھ کوس کے فاصلے سے چلے اور دونوں دن فیصلہ نہ کر سکے کہ شب خون ماریں یا واپس پلٹ جائیں۔ رات کے دو دو پہر گھوڑوں پر چڑھے بیٹھے رہے۔ آخر تیسری رات کو وہ بھی پچھلے پہر کے ختم ہوتے، انہوں نے چند ڈیروں اور چھپروں پر حملہ کیا۔ غل شور مچا کر ان میں آگ لگا دی۔

سلطان ابراہیم صبح کی پہلی نوبت بجنے تک اپنے سراچے سے اٹھ کر نہ آیا۔ عالم خاں کے آدمی ان ڈیروں کا سامان لوٹنے اور دوسرے خیمے تاکنے میں مصروف تھے جب کہ دن نکل آنے پر ابراہیم کے اہل لشکر نے دیکھا کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔

وہ ایک ہاتھی لے کر لڑنے نکلے۔ عالم خاں کے آدمی ہاتھی کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور بھاگ پڑے۔ عالم خاں (بہ تصحیح مترجم) میان دوآب کے علاقے سے فرار ہوتا ہوا، نواح پانی پت میں آیا...... سرہند سے گزرتے ہوئے اسے ہماری پیش قدمی کی خبر ملی۔ اس کا بیٹا دلاور خاں جو ہمیشہ میری خیر خواہی کرتا رہا اور اس کی وجہ سے دو تین مہینے قید میں ڈالا گیا، باپ کے ہمراہ تھا مگر اب اسے چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے پاس سلطان پور چلا گیا اور چند روز بعد میرے پاس حاضر ہوا۔ عالم خاں اور اس کے باقی ماندہ رفیق ستلج عبور کر کے دامن کوہ کے ایک قلعے میں چلے گئے۔

افواہوں کی وبا سی پھیلی ہوئی تھی مگر بابر نے کوچ جاری رکھا۔ ہر منزل پر بکھرے ہوئے مغل دستے، آزمودہ کار سردار جیسے محمد علی دنگ دنگ (55) آتے اور شریک لشکر ہوتے۔ دشمن کی ایک بڑی جمعیت (جانب لاہور) راوی کے کنارے سنی گئی۔ بابر سیدھا ان کے خلاف چڑھا اور دوبارہ حریف کہ اس موقع پر دولت اور غازی خان تھے، قوت آزمائی کی جرات کیے بغیر عزم مصمم کے سامنے سے بھاگتے نظر آئے۔ غیر منظم دشمنوں کا الگ الگ منتشر ہونا عین بابر کے حسب مراد تھا۔ اس نے اپنے لاہوری سرداروں کے ماتحت جو علاقے سے وقاف تھے، تعاقب میں ایک فوج روانہ کی اور تاکید کی کہ خاص طور پر غازی خاں کی تلاش کی جائے جو اچھا لڑنے والا تھا۔ ضعیف العمر عالم خاں کو اس کے چند روزہ حلیف چھوڑ گئے تھے۔ وہ ایک پہاڑی قلعے میں خطرناک نہیں رہا تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ ''افغان اور ہزارہ قبائل کا ایک میر لشکر اس قلعے کے نزدیک سے گزرا اور قریب تھا کہ قلعے کو حملہ کر کے چھین لے

لیکن رات ہو گئی۔ ادھر قلعہ والے اندھیرے میں نکل جانا چاہتے تھے۔ ان کے گھوڑے دروازہ قلعہ میں ایسے پھنسے کہ نکل نہ سکے۔ وہاں کچھ ہاتھی بھی ہوں گے جنہوں نے کئی گھوڑے روند کر ہلاک کر دیئے۔ عالم خاں گھوڑے پر سوار ہو کر نہ نکل سکا تو اندھیرے میں پیدل بھاگ نکلا اور سخت تکلیفیں اٹھاتا ہوا کسی نہ کسی طرح غازی خاں کے پاس پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ مگر وہاں اس کے کچھ آؤ بھگت نہیں ہوئی آخر ہار کر میرے پاس حاضر ہونا پڑا۔"

اس کے آنے سے قبل خود بابر راوی اتر کر (2۔جنوری) اپنے ہراول دستے کے پیچھے پیچھے ملوت کو چلا جہاں نشیبی پہاڑیوں کے اس قلعے میں دولت خاں نے پناہ لی تھی۔ پورے لشکر نے جمع ہو کر قلعہ گھیر لیا۔ پنجاب کا یہ سابق صوبہ دار اب اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا، اس کا ایک نوعمر پوتا قلعے کے باہر آیا کہ بادشاہ سے قبول اطاعت کی شرائط کا پتہ چلائے۔ وہ یہ وعدہ لے کر واپس گیا کہ ہتھیار ڈال دیئے تو عفو و درگزر کا سلوک ہو گا، مقابلہ کیا تو بزور مغلوب کیا جائے گا۔ اگلے دن بابر سوار ہو کر قلعے کی دیکھ بھال کو نکلا کہ اندر والے محصور بھی اسے دیکھ لیں۔

"اب دولت خاں نے پیام بھیجا کہ غازی خاں پہاڑوں میں نکل گیا مجھے معافی مل جائے تو قلعہ حوالے اور خود خدمت کرنے کو حاضر ہوں۔ میں نے خواجہ میر میراں کو بھیجا کہ اس کے دل سے خوف دور کرے اور اپنے ہمراہ باہر لے آئے۔ وہ اپنے ساتھ بیٹے کو بھی لایا۔ میں نے حکم دیا کہ دونوں تلواریں جو مجھ سے لڑنے کو باندھتا تھا، اب گردن میں ڈال کر سامنے لایا جائے۔ یہاں تک نوبت آنے پر بھی

اس کی اکڑ نہیں گئی۔ خیرہ چشمی سے حیلے کرتا تھا۔ سامنے آ کر جھکنے میں بھی تامل کیا۔ میں نے نوکروں سے کہا پاؤں کھینچ کر تعظیم کراؤ اور میرے روبرو بٹھا دو۔ پھر ایک ہندوستانی زبان جاننے والے سے کہا کہ میں جو کچھ کہوں لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے اسے سناؤ۔ میں نے کہا ''اس سے کہو کہ میں تجھے باپ کے لفظ سے یاد کرتا تھا اور تیری توقع سے بڑھ کر عزت و تکریم کرتا رہا۔ تجھے اور تیرے لڑکوں کو دربدر پناہ لیتے پھرنے سے بچایا۔ تیری حرم اور اہل و عیال کو ابراہیم کی قید میں نہیں جانے دیا۔ تیرے باپ کا تین کروڑ کا ملک تجھے دیا۔ بتا تو سہی میں نے تیرے ساتھ کونسی برائی کی تھی کہ تو نے مجھ سے لڑنے کے لئے دو دو تلواریں کمر سے باندھیں؟ اور فوج لے کر میرے مملوکہ اقطاع پر چلا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔''

بڈھے سے کوئی جواب نہ بن پڑا، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اور حقیقت میں جواب دے بھی کیا سکتا تھا۔ خواجہ میر میران کے پاس اسے رکھے جانے کا حکم دیا۔ ہفتے کو میں خود قلعے کے دروازے پر گیا اور گھوڑے سے اتر کر ایک ٹیکرے پر کھڑے ہو گیا کہ ان کے سب کنبے اور زنان خانہ کے لوگ حفاظت سے روانہ کر دیئے جائیں...... اگرچہ غازی خاں کی نسبت گمان تھا کہ جا چکا ہے لیکن بعض لوگ کہتے تھے ہم نے اسے قلعے کو اندر دیکھا ہے اسی واسطے اپنے ذاتی نوکر اور معتمد علیہ دروازے کی پاسبانی کے لئے مقرر کیے کہ وہ دھوکہ دے کے نکلنے نہ پائے اور زر و جواہر چوری سے لے جاتے دیکھیں تو ضبط کریں۔ رات کو بھی میرا قیام ٹیکرے پر رہا پھر قلعے کے اندر سیر کرنے گیا۔ غازی خاں معمولی سا شاعر اور مطالعے کا بڑا شوقین تھا، میں خاص

طور پر اس کا کتب خانہ دیکھنے گیا۔ متعدد کتابیں بہت اچھی تھیں۔ چند ہمایوں کو دیں اور چند کامران کو (قندھار) بھیجیں۔ علمی مسائل کی اور بھی بہت سی کتابیں تھیں مگر اتنی بیش قیمت نہ نکلیں جیسی اول امید تھی..... قلعہ ملوت محمد علی (جنگ جنگ) کے، جس نے اس کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی، تفویض کیا گیا اور دو سو (یوسف زئی) افغان سپاہی پاسبانی کے لئے اسے دیئے۔ خواجہ کلاں کئی اونٹوں پر غزنیں کی شرابیں لایا تھا، لہذا اسی کے ڈیرے میں جہاں سے قلعہ اور لشکر گاہ نظر آتی تھی، ہم نے جلسہ لگایا۔ بعضوں نے عرق پیا۔ کسی نے شراب، ملا جلا جلسہ تھا۔"

عزم وہمت کی رکاب میں پاؤں ڈالتا ہوں

جنگی مصروفیات کے ہنگام میں بھی ہمارا شیر اپنے چڑے ہوئے حریفوں پر حرف زنی کئے بغیر نہیں رہا۔ لکھتا ہے کہ دولت خاں سلطان پور جا کر، جسے اپنے عہد اقتدار میں بنایا تھا، مر گیا اور غازی خاں کو جو پہاڑیوں میں چھپتا پھرتا تھا، نام دھرتا ہے کہ وہ بے شرم باپ، بھائی بہنوں کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اور سعدیؒ کا قطعہ نقل کرتا ہے کہ

به بیں آں بے حمیت را کہ ہرگز نخواہد دید روئے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را زن و فرزند بگذارد بہ سختی

ذاتی ننگ و ناموس کا ہندوستان کے سپاہی پیشہ مسلمانوں میں بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ یہاں والے یہ مشاہدہ کئے بغیر نہیں رہے کہ اگر چہ بادشاہ ترک و مغل اور افغان غارتگروں کی فوج لے کر چڑھ آیا ہے اور اپنے دشمنوں سے سختی اور تنگ دلی

میں کمی نہیں کرتا، تاہم اسے عزت نفس کا پاس ہے، بات کا سچا ہے اور اپنے اسیروں کے ساتھ غیر معمولی عفو و درگزر سے پیش آتا ہے۔ راوی عبور کرنے کے بعد بابر کی یلغار کی تیزی کم ہوگئی تھی اور اس کے پاس ہندوستان کے عمائد درؤسا کے دوستانہ خطوط، اور ان میں سے بعض اصالتاً بھی آنے لگے تھے۔ ایسے ملک میں جہاں ہر ٹیکری پر گاؤں اور بلدی پر مضبوط گڑھ بنے دیکھے تھے، بابر نے لوگوں کو اپنی طرف یہ میلان اقبال مندی خیال کیا۔ جنگل جھاڑیوں تک بندروں اور موروں سے معمور تھیں۔ اثناء سفر میں بوڑھا عالم خاں ایک قلعے سے نکل کر تنہا پیادہ پا قبول اطاعت کے لئے حاضر ہوا۔ بابر نے اس کی آمد سن کر گھوڑے اور پیشوائی کے لئے سردار بھیجے کہ توقیر و عزت سے لے کر آئیں۔ سلاطین دہلی کے خاندان کے ایک ایسے بزرگ فرد کا ہاتھ آ جانا عین مفید مطلب تھا۔ مفت کے یرغمال حلیف کے ساتھ سیاسی مصالح کے مطابق عزت و حرمت کا برتاؤ کیا گیا۔ اس کا بیٹا دلاور خاں پہلے بھی بابر کی خیر خواہی کا دم بھرتا تھا، اب دوبارہ معافی کا خوستگار بن کر حاضر ہوا۔ قیدی امیروں کے فدیے یا معافی کے بارے میں (بہ تصحیح مترجم) اسے شریک کیا گیا۔

موسم بہار کی ابتدائی گرمی میں برف پوش ہمالیہ کے دامن میں سفر کرنا پر لطف تھا۔ اسی میں بڑے بڑے زرخیز اقطاع جو لڑنے والے دشمنوں سے چھینے تھے، جاں نثار سرداروں کو عطا کئے گئے ہندوستان کے رؤسا کو بھی نظر آ گیا کہ پادشاہ کے خلاف لڑنے کی بجائے اس کی سلک ملازمت میں منسلک ہو جانا زیادہ نفع کا سودا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بابر ابھی سے ملک پر فرماں روائی کے اصول وضوابط اپنے

ذہن میں مرتب کر رہا تھا۔

سرہند کے قریب ایک گستاخ سا ہندوستانی امیر لشکر میں آیا اور کہا مجھے سلطان ابراہیم نے سفیر بنا کر بھیجا ہے، بابر بھی اپنا سفیر جواباً شہنشاہ دہلی کے دربار میں روانہ کرے۔ بابر کو ترنگ سوجھی۔ دو پہرہ داروں کو حکم دیا کہ وہ سفیر بن کر سلطان ابراہیم لودھی کے پاس جائیں۔ ''لودھی نے ان بیچاروں کو قید میں ڈال دیا تھا، لیکن عین (پانی پت کی) جنگ کے وقت وہ چھوٹ کر نکل آئے۔''

اسی سلسلے میں پادشاہ نپولین کی طرح آغاز جنگ کے قریب قلم کی جولانی دکھاتا ہے:

''اب میں نے ہمت کی رکاب میں پاؤں رکھا اور توکل علی اللہ کی باگ ہاتھ میں لے کر ابراہیم لودھی خلف سلطان سکندر لودھی افغان سے لڑنے چلا جو مما لک ہند کا حاکم اور پائے تخت دہلی میں مقیم تھا۔ اس کا لشکر شمار میں ایک لاکھ اور اس کے اور تحت سرداروں کے جنگلی ہاتھی ایک ہزار بتائے جاتے تھے...... ایک رات ہم ایک سوکھی ندی کے کنارے اترے۔ دیکھ بھال کرتے گھوڑوں پر چلے تو چند کوس آگے ایک اور آب رواں کی ندی ملی جس کا بہاؤ چار پانچ پون چکیوں کو چلانے کی قوت رکھتا تھا۔ مقام خوش منظر، ہوا لطیف تھی۔ اس کے بالائی گھاٹ پر جہاں سے پانی پہاڑوں سے نکل کر نیچے آتا ہے میں نے ''چار باغ'' بنانے کا حکم دیا...... اس مقام پر خبر ملی کہ سلطان ابراہیم دہلی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ اور اسی طرح حمید حاکم حصار (شمال مغرب دہلی) سے دس پندرہ کوس آگے بڑھ آیا ہے۔ ابراہیم کے لشکر

کے خبر لانے کتہ بیگ اور حمید خاں کی فوج کا حال معلوم کرنے مومن آتکہ بھیجے گئے

......ہم انبالہ کے برابر سے چل کر ایک بڑے تالاب کے کنارے اترے۔''

ظاہراً بادشاہ کو دامن کوہ سے میدان میں آنا پسند نہ تھا۔ اس کے ولایتی سپاہی اور سردار پہاڑوں کے موسم و مناظر سے مانوس تھے۔ حسب معمول وہ یہاں بھی نئی بھرتی سے فوج کے کھانچے بھر رہا تھا۔ اگرچہ خوب جانتا تھا کہ یہ نو وارد فوجی نظم وضبط کے بہت کم پابند ہوتے ہیں۔ مگر ابراہیم کے آہستہ آہستہ بڑھنے کی خبر سن کر اس نے فوراً کام شروع کیا اور میمنہ کی پوری جمعیت ہمایوں کی سپہ سالاری میں حمید خاں کے خلاف روانہ کی، تاکہ نوجوان شہزادے کی جنگی قابلیت کا امتحان کرے۔ فوج کی تعداد بہت معقول اور چیدہ آزمودہ کار سردار جیسے خواجہ کلاں، خسرو کوکلتاش، محمد علی جنگ جنگ ہمراہ کئے۔ ان کی موجودگی میں ہمایوں کو شاید خود کچھ بھی نہ کرنا پڑا ہوگا لیکن بہر حال وہ وہاں تھا۔

حصار کے لشکر سے، اولا ہراول دستے کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مغل سوار بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے ہوئے دشمن پر جاپڑے اور جب اس نے ہر طرف سے سمٹ کر انہیں گھیرنا چاہا تو کنارافق سے اصل فوج ابھرتی ہوئی دیکھائی دی۔ معلوم ہوا کہ ہراول کو آگے بڑھا کے لڑانا حصار کے سارلشکر کو سامنے لے آنے کی چال تھی۔ قدرتی طور پر حصار والوں نے اپنا رخ دوسری جانب پھیرا۔ لیکن مغل حملہ زن رسالے کی طرف سے یہ منہ پھیرنا غضب ہوگیا۔ پھر ان کے قدم نہ ٹکے۔ ہمایوں کے منتخب سرداروں نے مار مار کے بھگا دیا اور دور تک پیچھا کیا۔ کئی سو قیدی، چند جنگی

ہاتھی اور معقول مال غنیمت ہاتھ آیا۔

بابر نے ہمایوں کی فتحمند فوج کی خوب قدر افزائی کی تفنگچیوں کو حکم دیا کہ قیدیوں کو (توڑے دار) بندوق سے اڑا دیں۔ ہمایوں کو خلعت فاخرہ، اسپ خاصہ اور والا تبار عطا کی گئی۔ خوش ہو کر لکھتا ہے کہ ''یہ تو اس کی پہلی مہم اور پہلا معرکہ تھا۔ ہماری آئندہ کامیابی کا بہت اچھا شگون ہوا'' رفیقوں کے اور زیادہ دل نشین کرنے کی غرض سے ہمایوں کے پہلی بار ڈاڑھی منڈانے کی رسم بھی منائی گئی۔ وہ اس وقت سترہ سال کا ہو گیا تھا۔

بایں ہمہ بابر پہاڑیوں اور گھاٹیوں کا سہارا چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ کوچ کی رفتار بہت سست رکھی، اس امید میں کہ دہلی کا لشکر عظیم شاید بڑھ کر ناہموار زمین پر لڑنے کی جسارت کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور بابر کو گنگا کے مشہور معاون دریائے جمنا کے کنارے تک بڑھ کر دشمن کا انتظار کرنا پڑا۔ پڑاؤ سے حسب معمول وہ گردونواح کا جائزہ لینے روانہ ہوا:

دریا کو پایاب اتر کے میں (موضع) سرساوہ کی سیر کو گیا۔ یہاں چشمے سے ایک نالہ نکلا ہے۔ بری جگہ نہیں۔ یہاں ہم نے معجون کھائی۔ تروی بیگ کو یہ جگہ پسند آئی اور اس نے تعریف کی تو میں نے کہا ''سرساوہ تمہارا ہے۔'' یعنی اسی کو بخش دیا۔ میں نے ایک کھلی کشتی میں سائبان ڈلوالیا تھا کہ میں سیر کے کام آئے۔ کبھی کبھی ہم بہاؤ کے رخ نیچے (دشمن کی بیرونی چوکیوں کی جانب) اسے لے گئے''

ان کلمات سے بابر کی بے پروائی ظاہر ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہ اپنی سپاہ کا

میلان خاطر معلوم کرنے کی فکر میں تھا۔ نئی سر شماری کی گئی تو اس کی تعداد بھی اتنی نہ نکلی جتنی توقع تھی۔ جنگ کا انتظار کرتے کرتے کچھ لوگ تھک گئے اور لشکر چھوڑ کر چل دیئے تھے۔

مغل سواروں کا جھپٹا

"لشکر میں بعض اشخاص متردد تھے۔ تردد اور خوف سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ خدا نے جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ نہیں ٹل سکتا۔ پھر بھی سچ پوچھے تو اس قسم کی پریشانی یا اندیشہ مندی پر گرفت نہیں کر سکتے میرے آدمی اپنے گھروں سے دو تین مہینے کے راہ پر، زحمت انتظار کھینچ رہے تھے۔ ایک اجنبی قوم سے مقابلہ تھا جس کی زبان ہم نہیں سمجھتے تھے۔ لوگ آپس میں کہتے تھے کہ ہمارے حریف لشکر کی تعداد ایک لاکھ اور اس میں ایک ہزار جنگی ہاتھی ہیں۔ ابراہیم کے ہاتھ میں اپنے باپ دادا کی ساری جمع جتھا تھی لیکن یہ روپیہ اس نے اپنے رفقائے جنگ میں تقسیم نہیں کیا۔ بیٹھا سکے گنتا رہا۔ جنگ کا ساز و سامان تیار نہیں کیا۔ جیسا کہ تجربہ کار سپہ سالاروں کا دستور ہے۔ نہ وہ فیصلہ کر ٹھیرا رہے، ہٹ جائے یا لڑ پڑے۔"

یہ باتیں بڑے معرکے کے کئی ہفتے بعد تحریر کی گئی ہیں، اور اول پسند خیال آرائی سے خالی نہیں۔ ہر چند بابر حریف کی کثرت فوج کی افواہوں کو وقعت نہیں دیتا تھا، تاہم اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ محتاط ابراہیم کی سوار فوج کے مقابلے میں اس کے رسالوں کا پلڑا بہت ہلکا ہے۔ حکومت دہلی نے جن جنگ جو باج گزاروں کی امدادی

فوج طلب کی وہ تعداد میں نیم ویراں کابل سے چو گنے تھے۔ دو پشت سے اس خاندان کے بادشاہ فتح پر فتح پاتے رہے تھے۔ پھر یہ کہ بابر تو سندھ بابر تو سندھ پار کے پہاڑوں سے اتنی دور چل کر آیا اور ابراہیم کو اپنی دہلیوں کے حصار بند مقام سے تیس میل سے زیادہ چلنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔

پچھلے ہفتے سے بابر کی فوج لشکر گاہ کی پتلی پٹی کے گرد قصبہ پانی پت سے بائیں جانب باڑ تیار کر رہی تھی۔ اس کے کنارے کنارے سامان کے سات وسو چھکڑے چرمی رسوں سے باندھے تھے اور تھوڑی تھوڑی دور پر چوڑے فصل چھوڑے تھے، جن میں عثمانی ترک ماہروں کی توپیں زنجیروں کے پیچھے لگائی گئی تھیں۔ بعض کھلے فصل وہ تھے جن میں چرمی جالیاں تفنگچیوں کی حفاظت کے لئے بنائی تھیں اور قطار کے بائیں سرے پر زیادہ چوری جگہ چھوڑ دی تھی کہ یہاں سے دو دو سواروں کا پرا جھپٹ کر دشمن پر جا گرے۔ مطلب یہ کہ بابر نے مدافعت کا پورا انتظام کیا اور جوابی حملے کے لئے جگہ نکال رکھی تھی۔ لیکن سپاہ دہلی نے کوئی جارحانہ پیش قدمی نہیں کی اور ادھر سپاہ کابل کو دشمن کی کثیر سوار فوج کے ہوتے پہاڑی کے دامن کی طرف ہٹنے کا موقع نہ تھا۔

ایک دفعہ بابر نے اپنے معتمد علیہ اور مغل برادری کے چیف تیمور سلطان کو فوج دے کر بھیجا کہ دہلی کے لشکر عظیم کے ایک پہلو پر ضرب لگائے۔ تیمور سلطان کچھ قیدی اور مال غنیمت بھی لایا، مگر دہلی والوں نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اسی طرح مغل سوارت یر اندازوں نے بڑھ بڑھ کر کئی بار انہیں تنگ کیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

یہ چالیں تو نہ چل سکیں لیکن اتفاقی اسباب نے لشکر دہلی کو اس بڑے حملے پر آمادہ کر دیا، جس کی بابر تدبیریں کر رہا تھا۔ بعض نئے ہندوستانی حلیفوں نے لشکر دہلی پر شبخون مارنے کا مشورہ دیا۔ انہیں امتحاناً آگے بھیجا اور عقب میں مدد کے لئے مسلح سوار تیار رکھے گئے۔ جیسا کہ اکثر ہوا ہے، شبخون مارنے والے راستہ بھول گئے یا لشکر دہلی کے قریب جمع نہ ہو سکے اور صبح ہوتے ہی سلطان ابراہیم کے رسالے جنگی ہاتھی لئے ہوئے مقابلے میں نکل آئے۔ باہم جھڑپ ہوئی اور پھر دن نکلنے سے پہلے حملہ آور واپس ہوئے۔ محمد علی جنگ جنگ کے پیر میں تیر کا زخم آیا۔ ہمایوں حفاظت سے فوج نکال لانے پر مامور ہوا اور اس نے یہ خدمت انجام دی۔ مگر اس چوک جانے کے باعث ابراہیم اور اس کے سرداروں کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے دن کے وقت پوری فوج سے مغلوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمعے کو جب اچھی طرح روشنی ہو چکی تھی، اطلاع ملی کہ دشمن صف بندی کر کے بڑھ رہا ہے۔ فوراً ہم نے زرہ پہنی، ہتھیار سنبھالے اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔''

پانی پت کے میدان میں اس روز (20۔ اپریل 1526ء مطابق 8 رجب 932) کیا ہوا، اس کی صاف صاف کیفیت معلوم نہیں ہوئی۔ ابتدائی زمانے میں بابر اپنی فوج کی اگلی صفوں کو لڑایا کرتا تھا۔ پانی پت میں بجور (باجوڑ) کی طرح وہ سپہ سالار اعلیٰ کے مقام پر لڑنے والوں کے عقب میں رہا۔ لہذا اس کے صرف احکام تقررات، فوجوں کو ادھر سے ادھر پھیرے کا ذکر آتا ہے۔ تاہم اس قدر پتا چل جاتا ہے کہ دہلی کے سواروں کا دل بادل تیز تیز بڑھ کر مغل مورچہ بندی کے سامنے پہیل

ٹھٹکتا اور پھر ٹوٹ کر حملہ کرتا ہے۔ ہندوستان کے امراء، روسا خود مطلب سلطان ابراہیم سے کیسے ہی ناراض ہوں، میدان جنگ میں انہوں نے دیوانہ وار دلیری دکھائی۔ بابر کو تھوڑی ہی دیر میں میمنہ سنبھالنے کے لئے فوج ردیف سے کام لینا پڑا۔ دوسرے حصوں میں بھی سبک پا دستے جنہیں جوابی حملوں کے لئے لگا رکھا تھا، صف جنگ سلامت رکھنے کا کام میں لائے گئے۔ حتیٰ کہ محمد علی جنگ جنگ جسے تیر نے بیکار کر دیا تھا، اسے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی جمعیت میں آ کر شامل ہوگیا۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ تیروں کی باڑوں نے بڑھتے ہوئے ہاتھیوں کا منہ پھیر دیا۔ مغل انتہائی میسرے کی خندقوں اور جھنکاڑ کے مورچوں سے برابر چمٹے رہے۔ رومی (ترک) استاد محفوظ آڑ سے برابر توپیں بھر بھر کے آتش زنی کرتے رہے تا آنکہ رفتہ رفتہ ''پلٹانے والے'' دستے بازو کے سروں تک نکل آئے۔ بائیں جانب تو وہ لڑائی میں مخدوش طور پر پھنس گئے اور بابر کو آخری ردیف سوار بھیج کر ان کی مدد کرنی پڑی، لیکن دائیں طرف کے دستے ولی قرلی اور ملک قاسم کی قیادت میں کھلی جگہ نکل آئے اور سلطان ابراہیم کے بازو پر عقب سے جھپٹ کر گرے۔ دوپہر ہوتے دوسرا بازو بھی دھکیل کر مغلوں نے وسط میں گھیر لیا اور اب یہ غیر مرتب انبوہ توپ و تفنگ کی مار اور ترکوں کی چھوٹی پر قوت کمانوں کی تباہ کن باڑوں کی عین زد میں آ گیا۔ سوار فوج کو آتش بازی سے بچنے کی کوئی نہ سوجھی۔ غول کے غول پھٹ کر پلٹنے اور واپس دہلی کو بھاگنے لگے۔ مختصر یہ کہ مورچہ بند پیادوں نے حملہ آور سواروں کو مغلوب کر لیا۔ اور با قاعدہ فوج کی جنگی تدابیر شجاعت ذاتی پر غالب آئی۔ بابر کی ماہرانہ سپہ سالاری نے

ابراہیم کی اندھا دھند یورش کو شکست دی۔ سلطان دہلی مقتولوں کے ڈھیر میں مرا ہوا ملا۔ بابر نے حکم دیا کہ اسے عزت حرمت سے مسنون طریق پر دفن کر جائے اور اپنے سردار خلیفہ کو اس کام پر نگرانی کے لئے بھیجا۔ لکھتا ہے کہ ''آفتاب ایک نیزہ بلند ہوا ہو گا۔ جب کہ جنگ کا پہلا تصادم ہوا۔ دوپہر تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ زوال آفتاب کے ساتھ دشمن کو شکست فاش اور ہمارے رفیقوں کو فخر و مسرت نصیب ہوئی۔ خدائے تعالیٰ کی رحمت و کرم سے یہ دشوار کام ہمارے لئے آسان ہو گیا۔ وہ لشکر کثیر آدھے دن میں زمین پر منتشر غبار بن گیا۔ ابراہیم کے گردو پیش کے پانچ چھ ہزار آدمی مارے گئے۔ میرا اندازہ تھا کہ دوسرے مقتول 15 تا 16 ہزار ہوں گے لیکن بعد میں آگرے آ کے ہندوستانیوں سے سنا کہ اس جنگ میں کم و بیش چالیس ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔

''دشمن کو شکست ہوتے ہی سواروں کی پکڑ دھکڑ، بھاگتوں کا تعاقب شروع ہوا، میرے آدمی ہر درجے کے امیر و رئیس گرفتار کر کے لائے (ہندوستانی) مہاوتوں نے ہاتھیوں کے غول کے غول لا کر حوالے کئے۔ شروع میں خیال تھا کہ ابراہیم فرار ہو گیا اور اسی لئے میں نے تیزی سے اس کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ پھر سوار ہو کر اس کے لشکر گاہ، خیمہ و بارگاہ کا معائنہ کیا اور ایک تلاؤ کے کنارے اتر پڑا۔ نماز عصر کے وقت میرے چھوٹے برادر نسبتی خلیفہ کو ابراہیم کی لاش ملی اور اس کا سر کاٹ لایا۔

''اسی روز ہمایوں میرزا کو (بابر اس جنگ کے بعد سے اپنے بیٹے کی شہزادگی کو لفظ ''میرزا'' سے بطور خاص نمایاں کرتا ہے۔) خواجہ کلاں اور خازن ولی کے ہمراہ

مختصر سامان لے کر بہ عجلت آگرے جانے کا حکم دیا کہ شہر پر قبضہ اور وہاں کے خزانوں پر پہرہ بٹھا دیں۔ دوسرے سردار مامور کئے گئے۔ کہ سیدھے دہلی جائیں اور وہاں کے خزانوں کی نگرانی کریں۔ اگلے دن ہم خود چلے لیکن گھوڑوں کو آرام دینے کی خاطر کوس بھر چل کر جمنا کے کنارے اتر گئے اور دو دن ٹھہر کر (دہلی میں) پہلے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی (بہ تصحیح مترجم) زیارت سے مشرف ہوئے پھر شام کو قلعہ دہلی میں داخل ہوئے اور رات وہاں بسر کی۔ دوسرے دن خواجہ قطب الدینؒ کے مزار پر حاضری دی...... سلطان بہلول اور سکندر لودھی کے مقابر اور باغوں کی سیر کی لشکر گاہ میں واپس آ کر کشتی میں بیٹھے اور عرق پیا۔

''دہلی کا فوج دار ولی قرلی کو بنایا گیا...... خزانوں پر مہر لگا دی گئی۔ جمعرات کو جمنا کے کنارے شہر تغلق میں (تغلق آباد۔ بابر یہاں کے ترک ناموں پر زور دیتا ہے تاکہ اس ملک کے سابقہ ہم نسل سلاطین ترک، تغلق اور غزنویوں کی یاد دلائے) جمعے کو میں لب دریا اردو میں رہا۔ مولانا محمود اور شیخ زین دیگر ہمراہیوں کے ساتھ دہلی میں جمعہ پڑھنے گئے۔ میرے نام کا خطبہ پڑھا اور مساکین میں روپیہ تقسیم کر کے واپس آئے۔

اس ضمن میں بابر پہلی مرتبہ اپنے ''بادشاہ کابل و دہلی'' کے اعلان کا ذکر کرتا ہے۔ یہ 27۔ اپریل 1526ء (15 رجب 932ھ) پہلا جمعہ تھا جس دن سے مغل سلاطین اعظم کے پہلے مغل بادشاہ کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اگرچہ خود بابر اپنے آپ کو مغل کہلوانا سخت ناپسند کرتا تھا۔

قلندر بابر کی شہرت بادشاہی

پانی پت کی ناگہانی مصیبت کبریٰ شمالی ہند پر بجلی بن کر گری۔ ابراہیم کا جسم زیر زمین نابود ہوا، فوج کا تارو پود ایسا بکھرا کہ پھر کبھی نہ جڑا۔ سلاطین لودھی کے اور کسی وارث کو ہمت نہ ہوئی کہ افغانی پہاڑوں سے آنے والے فاتح کے خلاف میدان میں نکلے۔ لوگ اس مقام جنگ تک سے بچ کر نکلتے تھے۔ رات کے وقت رہ گیروں کا بیان تھا کہ اندھیرے میں روحوں کی انہوں نے نالہ وزاری سنی۔

بابر ایسے توہمات کو کیا گردانتا تھا۔ صدر مقامات پر اس کا فوری قبضہ کرالینا، کہ جنگ کی خبریں بھی لوگوں کو نہ پہنچتی تھیں، شاہی محلات، خزائن وغیرہ پر ایک دم پہرے بٹھادینا، عام باشندوں کو مرعوب کردینے کے لئے کافی تھا۔ لڑائی میں اس کی فوج کے نقصانات اتنے کم ہوئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لہذا علاقے میں پھیل کر وہ پوری طرح مسلط ہو گئے۔ انہیں غارت گری یا دشمن کے اہل وعیال کو ستانے سے روک دیا گیا تھا اور اس طرز عمل نے عوام پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ اسی طرح بڑے (کوہ نور) ہیرے کا قصہ لوگوں میں زبان زد ہو گیا۔ وہ یہ کہ ہمایوں اپنا دستہ لے کر آگرے پہنچا تو شہر کے حکام نے باضابطہ اطاعت قبول کی البتہ درخواست کی کہ قلعے ان مقامات میں داخل نہ ہو جہاں بادشاہ کے ذاتی اسباب کے کارخانے اور یرغمال میں آئے ہوئے لوگ رہتے تھے۔ ہمایوں کو بھی شہر میں جبر وقوت سے کام لینا پسند نہ تھا لہذا اپنے سپاہی قلعے کے باہر رہنے دیئے اور دروازوں پر باپ کے آنے تک پہرہ لگا دیا۔ یرغمال کے لوگوں میں گوالیار کے راجہ بیوی بچے بھی تھے۔ یہ دولت مند

راجہ پانی پت میں مارا گیا اور اس کے اہل و عیال نے قلعے سے نکل کر اپنے وطن جانے کی کوشش کی، ہمایوں کے پہرہ داروں نے انہیں حراست میں لے لیا مگر مال اسباب پر دست درازی نہیں کی۔ عالی خاندان ہندو عورتوں نے غالباً شہزادے کو خوش کرنے کی غرض سے حسب دستور نذرانے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ بہت سے بیش قیمت جواہرات نذر کیے۔ انہی میں کوہ نور ہیرا تھا۔ یہ گلابی رنگ کا بھاری ہیرا ہمایوں کے 320 رتی (8 مثقال) تلا (بہت سے گرم و سرد دیکھنے اور تراش خراش کے بعد جب یہ ہیرا ملکہ وکٹوریہ کے قبضے میں آیا تو اس وقت بھی 186 قیراط اس کا وزن تھا)۔ بابر قلعے کے باہر آگرے کی لشکر گاہ میں آیا تو ہمایوں نے باضابطہ پیشوائی کی اور وہ ہیرا بھی جسے صاف کرا لیا تھا، پیش کیا۔ پادشاہ نے اس کی سرگزشت سنی، عملی آدمی کی طرح شوق سے اسے آنکا۔ لکھتا ہے کہ اس کلاں الماس کی قیمت اکثر جوہر شناس ساری دنیا کی ڈھائی دن کی خوراک کے برابر بتاتے ہیں۔ وزن میں آٹھ مثقال معلوم ہوا۔ ہمایوں نے مجھے گزارنا تھا۔ میں نے وہیں اسی کو دے دیا۔'' بابر نے قیدیوں اور یرغمالیوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ''قریب قریب سب کو نہ صرف معاف کیا بلکہ وطن میں یا اور کہیں زمینداری دے کر رخصت کیا۔'' ابراہیم کی ماں کو سات لاکھ مالگزاری کا پرگنہ عطا کیا اور آگرے سے دو میل پر مکان دیا کہ قلعہ سے نکل کر وہ اپنے نوکروں سمیت وہاں جا رہے۔

جمعرات کے دن عصر کے وقت میں آگرے میں داخل اور ابراہیم کے محل میں اترا۔''

قریب دو ہفتے اس نے اپنے آپ کو خلوت ہی میں رکھا۔ دہلی کی مسجد میں جامع میں دوسر بر آوردہ علماء نے جمعے کے خطبے میں اس کا نام پڑھا اور ہمایوں نئی حکومت کے سپہ سالار کی حیثیت سے نمایاں رہا جب کہ باپ گھوڑوں کو ستانے یا جمنا میں کشتی رانی کرنے ہی میں مصروف رہا۔ جس وقت بیٹے نے دنیا کا کلاں ترین ہیرا جس کی قیمت بے حساب تھی، نذر گزارا تو اسے بھی کمال استغنا سے اسی کو دے دیا۔ یہ محض مفرط سخاوت نہ تھی بلکہ دراصل وہ اپنے موجی بیٹے کی اپنیس اتھ دلی وابستگی کا طلب تھا۔ پانی پت کے بڑے میدان کارزار میں ہمایوں خوب لڑا۔ بابر اہل عسکر کی نظر میں اس کی توقیر بڑھانی چاہتا تھا۔

بابر کے ان سوانح حیات سے اب اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے طرز فکر و عمل کا پتا چلانا سہل نہ تھا۔ اس میں عام آرا اور قرائن کے خلاف چلنے کی ایک عجیب ذہانت پائی جاتی ہے۔ بالفعل وہ خاص طور پر اپنی سپاہ کو اس کی کارگزاری کا صلہ دینے پر متوجہ تھا۔ وہ اسے بڑے خطرناک حملے کے لئے اتنی دور لایا اور کھلے میدان میں کہیں زیادہ سوار فوج سے اسے لڑایا جو اصول حرب کے اعتبار سے مہلک اقدام تھا۔ ان جاں بازیوں کا انعام دیا جانا ضروری تھا۔ چنانچہ سلطان ابراہیم کے محل میں قیام کے بعد ہی مقفل خزانوں کا بڑا حصہ فوج والوں کو دے دیا گیا۔ یہ مغل جاگیرداری ہندوستان کی روایات کی مخالفت تھی۔ کیونکہ یہاں رانا، راجا، بادشاہ بلکہ معمولی جاگیردار تک روپے پیسے کو اپنی مٹھی میں رکھتے تھے۔ بابر نے ستر لاکھ (جو غالبًا تین لاکھ ڈالر امریکی کے معادل مگر قوت خرید بڑھے ہوئے تھے) شہزادہ

ہمایوں کو دیئے اور اس کی جمعیت نے جو کچھ لوٹا تھا، وہ انہی کے پاس رہنے دیا۔ بڑے بڑے سپہ سالاروں کو دس لاکھ (چاندی کے سکے) فی کس دیئے اور بے حساب سازو سامان، ہتھیار، گھوڑے عطا کیے۔ ہر امیر و رئیس کو ٹھیک ٹھیک تناسب سے انعام ملا۔ بندوقچی، شمشیرزن، سائیس، باورچی، گاڑی بان بھیر و بنگاہ کے مزدور خیمہ نصب کرنے والے تک کوئی ایسا نہ تھا جس کی مٹھیاں غیر متوقع سکوں سے نہ بھر گئی ہوں۔ بابر کی بخشش کا رنگ یہی تھا۔ ولی خزانچی پر جو کچھ گزری ہو اس کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔ پھر یہ تقسیم زر، اراضی اور مواشی کی تقسیم کے علاوہ تھی جس نے سردار و سپاہی سب کو خوش حال کر دیا۔ اسی داد و دہش کی بنا پر دہلی سے یہ افواہ **ملک** بھر میں منتشر ہوئی کہ نئے بادشاہ نے سارا خزانہ جو ہاتھ آیا تھا، لٹا دیا اور اپنے لئے قلندری حصے کے سوا کچھ نہیں رکھا۔ اسی افواہ نے مغلوں کی بنائی ہوئی پہلی مساجد میں سے ایک مسجد کے کتبے میں جگہ پائی جس میں یہ الفاظ کندہ تھے کہ "قلندر بابر دنیا بھر میں بادشاہ مشہور ہے۔"

خود بابر نے ایک شعر میں اس خیال کو ادا کیا ہے کہ "ہر چند میں درویش برادری میں شامل نہیں۔ لباس شاہی میں بھی میرا دل ان کے ساتھ ہے۔"

اس کی بے نظیر فیاضی کا وہ اثر ہوا جس کی خود سے امید نہ تھی۔

پہرہ دار (عسس) کی ایک اشرفی

شہزادی گلبدن بیگم نے اس جشن مسرت کی کیفیت لکھی ہے، جو کابل میں فتح کی مفصل خبریں اور تحائف وہدایا کے آنے پر منایا گیا۔ یہ خدمت کسی معمولی آدمی کے نہیں، بڑے وزیر خواجہ کلاں کے سپرد ہوئی تھی۔ (اگر چہ یہ واقعات گلبدن بیگم نے بڑی عمر میں، اکبر بادشاہ کے عہد میں قلم بند کیے، لیکن اسے بچپن میں اس جشن کی تقریبات اور محل سرا کی باتیں یاد ہوں گی)

"پانچ بادشاہوں کی جمع جتھا اس (بابر) کے ہاتھ آئی تھی، سب اس نے بانٹ دی۔ ہندوستان کے امیروں کو اتنی کثیر دولت لٹا دینا بہت شاق گزرا...... خواجہ کلاں نے کہا، حضرت پادشاہ نے میرے ہاتھ یہ تحائف اپنی خالاؤں، بہنوں اور حرم کی جملہ مستورات کے لئے ارسال فرمائے ہیں۔ خود فہرست بنا کردی ہے کہ اور ہدایت کی ہے کہ دربار کے باغ میں ہر بیگم کا شامیانہ اور قناتیں لگا کے نام بہ نام تحفے تقسیم کیے جائیں اور پھر سب مل کر اس فتح بزرگ پر خدا کا شکرانہ بجالائیں......"

ہر بیگم کو ابراہیم کی ناچ گانا جاننے والی کنیزوں میں سے ایک کنیز، یاقوت و جواہر اور موتیوں کی بھری ہوئی کشتی، سکوں اور صدف سے بھرے ہوئے دو خوان، نو پارچے کے قیمتی خلعت دیئے جائیں گے۔ بہنوں اور بچوں کو، دوسرے عزیز و اقارب بھائی اور ان کی بیویوں کو، دادا، مغلانیوں کو...... سب کو جو اس شکرانے کی

تقریب میں شامل ہوں، زرنقد اور خلعت الگ دیئے جائیں گے۔

''چنانچہ ہم سب حضوری باغ میں خوشی تین دن رہے۔ فہرست کے مطابق تحفے تقسیم ہوئے۔ ہر کوئی نازاں تھا اور شکر کے سجدے کر کے حضرت پادشاہ کے عمر و اقبال کی دعائیں مانگتا تھا۔ چوکیدار (عسس) کے واسطے بھی بادشاہ نے خواجہ کلاں کے ہاتھ ایک بڑی اشرفی بھیجی تھی۔ (غالباً یہ چوکیدار بابر کے باپ عمر شیخ میرزا کے محل کا آدمی تھا اور اس کا خاص خیال کیا جاتا تھا) اس کا وزن تین سیر شاہی تھا لیکن خواجہ سے پادشاہ نے کہہ دیا تھا کہ اگر عسس پوچھے میرے لئے کیا تحفہ بھیجا ہے تو کہہ دینا بس ایک اشرفی۔ جیسے وہ معمولی اشرفی ہو۔ چنانچہ خواجہ کلاں نے ایسا ہی کہہ دیا۔ عسس بہت بگڑا اور تین دن تک بکتا جھکتا پھرا۔ پھر بادشاہ کے حکم سے اس اشرفی میں چھید کر کے ڈوری باندھی اور عسس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گلے میں لٹکائی گئی اور محل سرا میں پھرایا گیا۔ اب جو اس نے ٹٹولا اور اتنا وزن دیکھا تو خوشی سے بے حال ہو گیا۔ بار بار کہتا تھا دیکھو کوئی میری اشرفی کو ہاتھ نہ لگائے۔ بیگمات نے الگ اسے چاندی سونے کے سکے دیئے اور یہ بھی ستر اسی ہو گئے تھے۔''

بابر کی فیاضی اپنے خاندان یا کابل تک محدود نہ تھی۔ قندز و غزنین تک تحائف کے انبار گئے اور دو دوست بدخشاں کے کاشتکاروں اور ان کے بیوی بچوں نے

چاندی کے سکے پائے۔ سمرقند میں یہاں کے مہاجرین کو حصہ گیا اور حج کرنے والے اس کے تحائف مکہ معظمہ لے کر گئے۔ ساتھ ہی اعلان ہوا کہ ''امیر تیمور یا چنگیز خاں کی نسل کے ہر شخص کو دعوت ہے کہ ہمارے دربار میں آئے اور حسب ہمت وخدمت فائدہ اٹھائے'' بہ الفاظ دیگر سالہا سال کی آوارہ گردی کے بعد شیر کو لائق سکونت سرزمین مل گئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی نسل ونژاد کے جتنے افراد سلامت ہوں۔ انہیں بلا کر پوری قوم کا مرکز بنائے۔ یہ رائے کسی وقتی ترنگ میں آ کر نہیں قائم کی گئی تھی۔ بلکہ جب سے ہندوستان میں آیا یہاں کی سرزمین، پانی، سبزیاں، چرند، پرند ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتا رہا اور سفر یا لشکر گاہ میں برابر اس مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی۔ لوگ جو کچھ آ کر کہتے وہ عموماً سے خود دیکھنا چاہتا تھا۔ ہاتھیوں کی خوراک کو غور سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ ایک ہاتھی کٹی ہوئی پولیاں دس اونٹوں کے برابر کھا لیتا ہے۔ مگر بہتے دریا کو اس طرح پار بھی کر سکتا ہے کہ اوپر کی لدی چیز کو پانی ذرا نہ چھوئے۔ تین چار مل کر اتنی بڑی توپ کے چھکڑے کو کھینچ سکتے ہیں جسے چڑھانے میں چار سو آدمی درکار ہوں۔ ہاتھی سدھانے کے طریقے دیکھے اور سرائے قائم کی کہ ''بہت عقل مند جانور ہے۔ مہارت کی بات سمجھتا ہے اور اس کا حکم مانتا ہے۔''

چرس رسے سے پانی کھینچنے کا ہندوؤں کا طریقہ بابر کو پسند نہیں آیا کہ بیل کی واپسی میں رسا کیچڑ، پانی، گوبر میں گھسٹتا آتا ہے اور وہی چرس کے ساتھ کوئیں میں ڈالا جاتا ہے۔

نیل گاؤ سمیت پانچ قسم کے ہرنوں کی کیفیل لکھی ہے۔ موش نما جانور یعنی

گلہری کو پھرتی سے درختوں پر چڑھتے اترتے دیکھ کر اسے بہت لطف آیا۔ دوسری ولایات کے اکثر جانوروں سے واقف تھا، لہٰذا لوگوں کے جھوٹے سچے قصے سن کر یقین نہ کرتا تھا۔ مثلاً گینڈے کی طاقت کی روایتیں۔ اس مہیب صورت یک شاخہ جانور کو یورپ کے سیاحوں نے شروع میں دیکھا تو بہت ڈرے اور طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہوئیں۔ بابر نے انہیں تو باور نہیں کیا، البتہ تسلیم کرتا ہے کہ گینڈا گھوڑے کو سوار سمیت اپنے سینگ پر اٹھا کر اچھال سکتا ہے۔ جس کا خود تماشا دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ سوار جو اس طرح اچھالا گیا ''کرگدن زدہ'' کہلانے لگا تھا۔ ہندوستان کے طرح طرح کے طوطے دیکھے اور ان میں چمکتے رنگوں، سیاہ گردن اور چونچ والے کو بہت پسند کیا جو ایسی باتیں کرتا ہے کہ حیرت ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا وہ صرف آواز کی نقل کرنی سیکھ جاتا ہے یا سمجھ کر بھی بات کر سکتا ہے؟ ایک ملازم نے کہا کہ سیاہ چونچ کا طوطا پنجرے میں تھا، اس پر سنتی چڑھائی گئی تو وہ پکارنے لگا ''میرا چہرہ کھولو، مجھے سانس لینے دو۔'' بابر لکھتا ہے ''راست و دروغ بر گردن راوی مگر جب تک خود نہ دیکھے ایسے بات کا یقین کرنا مشکل ہے۔''

بھنگانے والے نیز مردار خوار پرندے دیکھے۔ مور کا گوشت امتحاناً کھایا۔ بہت سی مچھلیاں کھائیں ایک دفعہ مچھیروں کو دیکھا کہ جال کو پانی سے کوئی ایک ہاتھ اونچا لئے کھڑے ہیں، مچھلیاں اڑ اڑ کر پھنس جاتی ہیں صرف ایک مچھلی تھی جو گز بھر اوپر سے اچھل کر صاف پار کر گئی۔ ہندوستان کے پھل کچھ بہت مزے دار نہ نکلے سب میں بہتر آم تھا جس کی خربوزے کی طرح تعریف کی جاتی تھی۔ بابر کے نزدیک

یہ پال کے ہی اچھے ہوتے تھے لکھتا ہے ''عمدہ قسم کا آم واقعی بہت اچھا ہوتا ہے لیکن ایسی اچھی قسمیں ہر جگہ بہت کم پائی گئیں۔''

اول اول وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ہندو اپنی جاتی یا طبقے کے نام سے منسوب ہوتے ہیں اور قبائل یا خاندان سے موسوم نہیں ہوتے۔ لکھتا ہے ''ہندوستان کے اکثر باشندے بت پرست ہیں۔ بت پرست کو ''ہندو'' کہا جاتا ہے۔ بہت سے ہندو تناسخ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کاریگر، مزدور، سرکاری کارندے سب ہندو ہیں۔ ہمارے ملک میں صحرائی لوگ قبائلی نام رکھتے ہیں۔ مگر یہاں شہروں اور کھیتوں میں کام کرنے والے بھی الگ الگ قومیں بن گئی ہیں۔''

آگرے میں داخل ہوئے زیادہ دن نہ گزرے تھے جب بابر نے ہندوستان میں توطن اختیار کرنے کا اعلان کیا اور اسے سن کر اہل عسکر میں بڑی ناگواری پھیلی۔ اور تو اور سب سے ممتاز مشیر خواجہ کلاں جیسا اسے چھوڑ بھاگا۔ بابر لکھتا ہے ''سب سے بڑھ کر ہندوستان چھوڑنے پر خواجہ کلاں تلا ہوا تھا۔'' آخر اسے تحفے اور سوغاتیں بانٹنے اور کابل کا انتظام کرنے کے نام سے بھیج دیا گیا۔'' پھر بھی لوگوں میں بددلی دیکھی تو...... '' (باضافہ مترجم) انہیں سمجھا بجھا کر رضامند کیا۔ ہندوستان میں دارلسطنت دہلی کا قطب مینار نچی چھت کے دالانوں کے درمیان فلک نما عمارت تھی۔ سارے میدان میں مقبروں کے گنبد جن کے گوشوں پر نازک ستونوں کی برجیاں بنی ہوئی تھی، غوری اور (بہ تصحیح مترجم) بعد کے ترک سلاطین کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔ سلطان محمود اعظم کی طرح یہ بادشاہ بھی اعلیٰ درجے کے بنا

گزرے ہیں اگرچہ بابر کی رائے میں انہوں نے ہندو کاریگروں سے جلدی میں تعمیر کرائی اور کاریگروں کا بھونڈا پن جھلکتا ہے۔شان وشوکت دکھانے کا شوق بھی زوال کے عناصر سے خالی نہیں.....بڑی بڑی آبادیاں اکثر ایک برس میں، پانی کے لئے صرف ایک ندی کے سہارے بس گئیں اور کسی وبا یا خوف وخطر کے باعث لوگ انہیں پتتے میدان کی گرمی اور موسلا دھار بارشوں کے حوالے کر کے ویران چھوڑ گئے۔کسی افسردگی کی ساعت میں بابر لکھتا ہے کہ ''ہندوستان میں لطف کی چیزیں کم ہیں۔لوگوں کی صورتیں اچھی نہیں، نہ ملنسار ہیں نہ آپس میں میل جول کے طریقوں سے آگاہ ہیں۔مزاج شناسی، ذہن وذکا سے عاری، آداب مجلسی سے ناواقف ہیں۔ دستکاری میں جدت نہیں نہ سوچ بچار سے کام کرتے ہیں۔عمارت میں نقشے اور ہیات کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ ملک میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھے کتے نہیں ۔انگور، خربوزے بلکہ اعلیٰ درجے کے پھلوں میں کوئی پھل بھی اچھا نہی ہوتا۔ٹھنڈا پانی برف اور بازاروں میں اچھی قسم کا گوشت یا روٹی نہیں ملتی۔حمام، مدارس، حتیٰ کہ شمع اور شمع دان نہیں ہوتے موم بتی کی بجائے میلا چیکٹ چراغ دان (ڈیوٹ) ہوتا ہے اس میں ایک ہاتھ سے بتی اکساتے اور دوسرے سے تونبی میں سے تیل ڈالتے رہتے ہیں۔یہ کام جن لوگوں کے سپرد ہے، آپ روشنی منگائیں تو وہی دوڑے ہوئے آئیں گے اور ڈیوٹ جلا کر آس پاس کھڑے ہو جائیں گے۔ ملک میں دریا موجود ہیں مگر نہریں نہیں کاٹی گئیں۔نہ باغوں یا گھروں میں پانی لایا گیا۔ان کے گھر نہ خوش قطع ہیں، نہ ہوادار۔کوئی دل کشی نہیں رکھتے۔کسان اور ادنی طبقے کے لوگ ناف

سے نیچے دو بالشت کی لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں۔عورتیں ایک ساڑھی آدھی (بہ تصحیح مترجم) کمر سے لپیٹتی ہیں۔آدھی سر پر ڈال لیتی ہیں۔'' اس کے مقابلے میں ہندوستان کی خوبیوں کی فہرست بہت مختصر ہے۔

''رہیں خوبیاں، تو یہ ایک وسیع ملک ہے۔سونا، چاندی افراط سے ہوتے ہیں۔مینہ برستا ہے تو ہوا بہت اچھی چلنےلگتی ہے۔مگر برسات کی سیل تیر کمان، کتاب، کپڑا بلکہ مکانوں تک کا ناس مارتی ہے۔ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر طرح کے کاریگر کثرت سے ہیں۔ہر پیشے یا حرفت کی برادریاں معین ہیں، ان میں باپ دادا کے وقت سے وہی کام ہوتا چلا آتا ہے۔''

بادشاہ اپنی نئی قلمرو سے اتنا بددل تھا، تو اس کی فوج اور بھی مایوس ہوئی تھی فوج کی جان وہ لوگ تھے جو سرد کوہستانی ملک میں پلے اور اب اپنے وطن کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی یاد انہیں ستا رہی تھی۔وطن سے نکلے ایک سال ہونے کو آیا اور زیادہ وقت جنگ و جدال ہی میں مصروف رہے۔اب انعام بھی زرنقد اور اجناس کی صورت میں ملا تو مغل، ترک، افغان سبھی کی قدیم روایت، نیز فطری خواہش تھی کہ کوئی ناشدنی پیش آنے سے قبل اپنی ان غنیمتوں کی حفاظت سے گھر لے جائیں۔ سندھ پار ہندوستان پر پہلی تاختوں کا مقررہ ضابطہ یہی رہا تھا، فوج والوں کے نزدیک اس میں ردوبدل کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔

بابر لکھتا ہے کہ ''ہم آگرے آئے تو گرمی کا موسم تھا۔دیہات کے لوگ خوفزدہ ہوکر بھاگ گئے تھے۔ہمیں غلہ اور گھوڑوں کو چارہ نہ ملتا تھا۔دیہاتیوں نے رہزنی

اور چوری کا طریقہ ہماری دشمنی سے اختیار کیا۔ آمدورفت بند ہوگئی مجھے انعام واکرام بانٹنے میں بہت دن فرصت نہیں ملی کہ اضلاع اور تھانوں کے لئے معقول جمعیت مقرر کرتا۔ دوسرے اس سال گرمی کی بڑی شدت ہوئی۔ ہمارے آدمی لولگ کے بیمار ہونے اور مرنے لگے جیسے بادسموم سے ہلاک ہوجاتے ہیں۔

ان وجوہ سے اکثر آزمودہ کار سردار اور بیگ ہندوستان میں رہنے سے بددل بلکہ واپس جانے کے لئے پوری طرح تیار ہوگئے۔ پرانے اور سندرسیدہ بیگوں کی ایسی شکایت راستی سے کرنے میں مضائقہ نہ تھا۔ بندہ (بابر) ان کی دلی خیالات اور (دوسروں کے) نافرمانی کے طرزعمل میں فرق کرسکتا تھا۔ مگراس بندے نے پوری مسئلے کو دیکھا، سمجھا اور پھر رائے قائم کی تھی۔ اہل لشکر اور ان میں بھی ادنی...... ادنی نفروں سے بے سوچے سمجھے رائے زنی کرنا کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ پھر طرفہ تر یہ کہ ان میں بعض وہ لوگ تھے جنہیں معمولی درجے سے ترقی دے کر ہندوستان ہی میں امارت اور بیگ ی ملی ہے۔ یہ اعزاز میں نے اس لئے تو انہیں نہیں دیا تھا کہ میرے ارادے کے خلاف تقرر کریں۔"

جب لوگوں میں بددلی کی خبر سنی تو میں نے سب سرداروں کو شوریٰ میں بلایا۔ میں نے ان سے کہا کہ دنیا میں کوئی اقتدار و سیادت بغیر ضروری وسائل کے قائم نہیں رہ سکتے نہ کسی بادشاہ کی حکومت ملک و رعایا کے بغیر ہوا کرتی ہے۔ کئی سال کی محنت مشقت، طولانی سفر کی صعوبتیں، مرنے مارے جانے کے خطرات یہ سب برداشت کرکے ہم نے خدا کی رحمت سے دشمن کے انبوہ عظیم کو زیر کیا اور اس کی وسیع ولایات

حاصل کیں۔ اب وہ کونسی طاقت ہمیں مجبور کرتی ہے اور کونسی ضرورت پیدا ہوئی ہے کہ اتنے جوکھوں سے لیا ہوا ملک چھوڑ دیں اور تنگ دستی کی بلا میں واپس کابل چلے جائیں؟ کوئی شخص جو مجھے عزیز رکھتا ہو آئندہ اس کے منہ سے میں ایسی باتیں نہ سنوں۔ لیکن جسے ٹھیرنے کی تاب نہیں وہ شوق سے واپس چلا جائے۔

''ان کلمات سے میں نے ان کے پراگندہ خیالات دوبارہ درست کیے اور خوش ہوئے ہوں یا ناخوش دلوں سے اندیشے دور کیے۔''

بایں ہمہ نائب اول خواجہ کلاں اپنے خیال پر جما رہا۔ وہ کہتا تھا کہ میری صحت گرتی جاتی ہے۔ چنانچہ نہایت ناخواستہ دل سے بابر نے آخر اسے کابل واپس جانے کی اجازت دی مگر جب سنا کہ خواجہ (بہ تصحیح مترجم) دہلی سے چلتے وقت دیوار پر یہ شعر گھسیٹ گیا ہے کہ

اگر بخیرو سلامت گرزز سندھ شود
سیاہ روئے شوم گر ہوائے ہند شود

تو بہت جھلایا۔ ساتھ چھوڑ کر جانے کی کدورت کم نہ تھی کہ یہ شعر اس پر مستزاد ہوا۔ جواب میں ایک شعر مکمل خواجہ کو کابل بھیجا جس کا مطلب یہ تھا کہ ''بابر خدا کا شکر کر کہ ہندو سندھ کی بادشاہی اس نے عطا کی۔ خواجہ، تیری ہمت گرمی کی تاب نہیں لاتی تو جا، غزنیں کے جاڑے کھا۔'' مگر یہ کدورت جلد ہی رفع ہوگئی۔ دو سال بعد خواجہ کو ہندوستان کے حالات کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ ''مجھ جیسا آدمی زمین کابل کے مزے کس طرح دل سے بھلا سکتا ہے؟ وہاں کے لطیف انگور اور خربوزے کیونکر

یاد نہ آئیں گے۔ چند روز ہوتے ہیں لوگ خربوزے لائے اسے میں نے تراشا تو معاً وطن کی بیقراری اور غریب الوطنی کا رنج تازہ ہو گیا اور میں آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔''

اسی حب وطن کی بدولت رود کابل کا قلعہ، بعید برف پوش پہاڑوں کے زیر سایہ مرغزار، کچنال کے سرخ سرخ پھولوں کا کھلنا خاص طور پر یاد آتا اور دل کو بے چین کر دیتا ہیں...... کسی پیش دالان کی نگہداشت، کبھی باغوں کی درستی، خوش بو دار پھولوں کے درخت اور پودے لگانے کی تاکید کی ہے۔ ادھر ہندوستان میں بھی اپنے تیز گشت و سفر کرنے میں بار بار سایہ دار باغ نصب کرنے، آب پاشی کے وسائل مہیا کرنے کے احکام دیتا رہتا تھا۔ بڑے دریاؤں کے پیٹے میں اس قدر کثیر پانی کی مقدار کا ضائع ہونا، جو کبھی کبھی خشک میدانوں میں پھوٹ پڑتا یا سخت بارشوں کے بعد گدلے پانی کی طغیانی بن جاتا، بابر کو برابر اس کا قلق رہا ہے۔ لکھتا ہے کہ:

''میرا جہاں ذرا زیادہ قیام ہوا، میں نے رہٹ لگا کے نالیاں بنوانے کا انتظام کیا اور ان کے کنارے تفریح گاہیں تیار کرائیں۔ آگرے آنے کے تھوڑے دن بعد جمنا کے پار جا کے باغ کے لئے مناسب زمین دیکھی مگر ساری نواح بدنما تھی کہ بیزار ہو کر واپس آ گیا اور دریا کے کناروں کی زشت ہیات کے باعث یہاں ''چار باغ'' بنانے کا خیال چھوڑ دیا۔ پھر بھی چونکہ آگرے کے پاس اور کوئی جگہ ایسی بھی موجود نہ تھی، ہار کر اسی مقام سے کام لینا پڑا۔ پہلے اس قطعے پر کام شروع ہوا جہاں ہشت پہلو حوض کے قریب املی کے درخت تھے۔ بڑا سا کنواں بنا کے زمین میں گلایا

گیا کہ اس سے حماموں میں پانی لے سکیں۔ پھر حوض کو گھیر کر قریب ہی بارہ دری بنوائی جس کے محاذ میں سرخ وسفید پتھر کی حویلی کے اندرونی کمروں کے باہر گلاب اور نرگس کے پھولوں کی قطاریں لگا کر چمن بندی کی گئی۔ حمام کے حجروں میں سفید اور فرش میں سرخ پتھر بیانہ کا لگایا گیا۔ اس طرح ہندوؤں کے دستور کے مطابق ہم نے بھی بغیر اہتمام کے باغ اور عمارتیں بنوائیں۔ لیکن ان میں ایک وضع داری پیدا ہوگئی۔ ہندوستان کی تین چیزیں ہمیں بہت پریشان کرتی ہیں۔ ''گرمی، آندھی، گرد۔'' نئے حماموں نے تینوں آفتوں سے نجات دلا دی۔ خلیفہ وغیرہ کئی اور سرداروں نے بھی لب دریا قطعا گت ڈھونڈ کر باغ اور حوض بنوائے اور لاہور کی وضع کے رہٹ پانی کھینچنے کے لئے لگائے۔ ہندوستان کے لوگوں نے اس اس قطع کے باقاعدہ باغ اور عمارتیں نہ دیکھی تھیں، انہوں نے جمنا کے اس کنارے کو جہاں یہ باغ وغیرہ بنے، ''کابل'' کے نام سے موسوم کر دیا۔''

سردار اعلیٰ کے عزم مصمم میں ضرور ایسی تاثیر تھی کہ اس کے ساتھیوں نے نئی سرزمین میں جس سے متنفر تھے، اپنے وطن کی معروف چیزں کی نقل یہاں تیار کرائی۔ اس طرح بابر نے باوجودیکہ بار بار کی بیماری اور مسکرات کے زہر سے کمزور ہوتا جاتا تھا اور سب سے بڑا وزیر وندیم (خواجہ کلاں) اسے چھوڑ گیا تھا، نیز اہل عسکر نہایت بددل ہو رہے تھے، اپنے آپکو اور تمام ساتھیوں کو ہندوستان کے میدانی ملک میں سنبھالے رکھا تا آنکہ مہینے، دوسرا سال بن گئے۔ اس کے اپنے سرداروں سے یہ کہنا کہ کوئی طاقت ہندوستان چھوڑے پر ہمیں مجبور نہیں کرتی، دانستہ بے انصافی کی

بات تھی۔ اپنے اہل وعیال اور مانوس طریق زندگی سے دوری واضح طاقت تھی جو انہیں اپنے مغربی پہاڑوں کی طرف کھینچتی تھی۔ ان کی بدوی جبلت ابھی تک قوی تھی۔ صرف بابر کی مرضی کا خیال تھا جس نے انہیں روک رکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ ان میں ایسے لوگ کم تھے جو علانیہ بادشاہ سے بے وفائی کرتے، مگر اگلے سال خود شہزادہ ہمایوں آمادہ ہوا تھا کہ باپ کا ساتھ چھوڑ جائے۔

گوالیار کا (ہتیا پول) ہاتھی دروازہ

جملہ مصروفیتوں کے باوجود بابر تاریخ کی ورق گردانی کرنے کا وقت نکال لیتا تھا۔ اس کتب بینی کا بھی عجیب فائدہ اس نے یہ اٹھایا کہ اپنے رفیقوں کو بڑے بڑے بادشاہوں کے جنہوں نے ممالک مغرب سے شمالی ہندوستان پر حملے کئے، قصے سنائے۔ اس نے بتایا کہ سلطان محمود غزنوی اور امیر تیمور خراسان وسمرقند کے علاوہ بڑی بڑی ولایات کے مالک تھے اور ہمارے پاس غزنیں کابل قندز کی پٹی کے سوا کچھ نہیں دھرا ہے۔ اور یہ علاقہ بھی اتنے محدود وسائل معش رکھتا ہے کہ ہمیں اس کی پرورش کے لئے ہندوستان سے رسد بھیجنی پڑتی ہے۔ اب اگر ہندوستان سے ہم دست بردار ہو جائیں، تو خود ہمارے وطن پر کیا گزرے گی اور اگر وہ کام کریں جو محمود اور تیمور نے نہیں کیا، یعنی ہندوستانی کو اپنا گھر بنالیں تو کیا کچھ کارنامے انجام نہ دے سکیں گے۔

اس نے دوسرا نتیجہ یہ اخذ کیا کہ اتنی کثیر تعداد کے مقابلے میں ہماری کمزور

قلیل جمعیت کو یہ کامیابیاں مشیت الٰہی کے بغیر حاصل نہ ہوسکتی تھیں ۔ تقدیر کی ایسی کھلی نشانیاں اور خدا کا منشا دیکھ کر بھی آنکھیں بند کرنا اور واپس پلٹ جانا کس طرح جائز ہوگا ؟ اور یہ خالی حجت تھی ۔ واقعی بابر اس کی صداقت پر یقین رکھتا تھا ۔ سلاطین دہلی کے پرشکوہ مقبروں کو سیر کرتے وقت یقیناً وہ مرعوب ہوا ہوگا اور اسے اخسی کے باغ میں اپنے باپ عمر شیخ میرزا کی قبر کا پرانا ڈھیر یاد آیا ہوگا ۔

1526ء کے اواخر میں مہاوٹیں برسیں تو اس وقت بھی جنگی صورت حال کچھ قابل اطمینان نہ تھی ۔ دریائے سندھ سے جنوب مشرق میں پانچ سو میل فوج آگے بڑھ آئی تھی لیکن سچ پوچھئے تو **ملک** مقبوضہ صرف اسی قدر تھا جہاں ان کی چھاؤنیاں بنی تھیں ۔ یعنی ایک تنگ سا راستہ یا گلیاری جو درہ خیبر سے بھیرا ، لاہور ، سرہند ، پانی پت ، دہلی ، آگرہ ، بارہ تک آتی تھیں ۔ فی الواقع بابر نے اپنی فتح ''بھیرا سے بارہ تک'' ہی بتائی ہے ۔ (56) اس موسم بہار کے آنے تک مغلوں کی پیش قدمی بالائی گنگا کے شہر قنوج تک ہی ہوئی تھی ۔ پادشاہ کے باغ و عمارات کا سلسلہ ، نیز وصول مال گزاری کا حلقہ آگرے سے ایک منزل آگے نہیں گیا تھا ۔ مفتوحہ پٹی میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے آگے ہندوستان کے وسیع خطوں سے غراہٹ کی آوازیں آرہی یا مہال کی بگڑی ہوئی مکھیوں کی بھن بھناہٹ ، جن کے چھتے کو توڑا گیا مگر انہیں قابو میں نہیں لایا گیا ہو ۔

بابر ان خطرات سے بے خبر نہ تھا ۔ لکھتا ہے کہ ''ہمارے آگرے کے داخلے کے وقت یہاں کے لوگوں میں اور میرے آدمیوں میں باہم نہایت نفرت اور عداوت تھی ۔

کسان اور سپاہی میرے آدمیوں کو دیکھ کر ہی دور بھاگتے تھے۔ دہلی اور آگرے کے سوا باقی قلعہ بند شہروں نے اپنے مورچے مضبوط کئے اور انہیں حوالہ نہیں کیا نہ اطاعت قبول کی۔ قاسم سنبھلی نے سنبھل اور نظام خاں نے بیانہ میں یہی طریق عمل اختیار کیا۔ میوات میں (بہ تصحیح مترجم) حسن خاں ''ناپاک مرد کہ فتنہ وفساد کا سرغنہ تھا'' تار تار خاں، گوالیار میں، حسین خاں رابری میں، قطب خان اٹاوے میں، عالم خاں کالپی میں ڈٹے ہوئے تھے۔ قنوج اور دریا کے دوسری طرف سارے علاقے پر افغان مخالفوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ نصیر خاں، معروف اور بہت سے دوسرے امیر وہ تھے جو سلطان ابراہیم کی زندگی ہی میں باغی ہو گئے تھے اور جس وقت میں نے اسے شکست دی تو یہ قنوج اور اس کے آگے کے علاقے پر قابض تھے۔''

مشرق میں کنارے گنگا کے ان طاقتور باغیوں کے اور مغرب میں راج پوت راجاؤں کے خطرناک جتھے کے درمیان بابر قریب قریب بیچ میں تھا۔ جنوبی ہند کے وسط میں وجیا نگر میں سلطنت کی اس نے صرف سن گن پائی تھی۔

مذکورہ بالا حالات قدرتی ہی تھے کیونکہ مسلمان سلاطین عظام نے اکثر ''ابر آلود'' پہاڑوں سے یورشیں کیں اور واپس چلے گئے۔ تیمور نے دہلی کو تاراج کرنے کے بعد سمرقند کی راہ لی۔ خود بابر چار دفعہ دریائے سندھ کے پار آیا اور واپس ہو گیا۔ غرض ہندوستان کے دور دست جاگیرداری رئیس اس موقع پر بھی اپنے اپنے قلعوں میں مورچہ سنبھال کر بیٹھ گئے تھے کہ مغل لوٹ کا مال لے کر رخصت ہو جائے گا۔ ان میں کوئی تنظیم نہ تھی لیکن سرکشی میں سب متحد تھے۔ لیکن ایک سال گزر گیا اور بادشاہ یہیں رہا تو

صاف معلوم ہو گیا کہ وہ مستقل سکونت کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے ہر اقدام سے یہی بات زیادہ واضح ہوتی گئی۔ لہذا اب ان روسائے ہند نے زیادہ تجسس شروع کیا اور سوچ میں پڑ گئے کہ بابر سے کیا معاملہ کیا جائے۔ ابراہیم لودھی کے زمانے کی خانہ جنگیوں سے پنجاب اور دوآب کے سبھی اقطاع عاجز آ گئے تھے۔ بابر، اگرچہ ترک تھا لیکن معلوم ہوا کہ جس طرح اپنی قوت پر بھروسہ کرتا ہے اسی طرح قانون کا بھی احترام کرتا ہے۔ اہل ہند پانی پت کو ابھی نہیں بھولے تھے اور یہ بھی واقعہ تھا کہ کئی مغل آزمودہ کار سپہ سالاران علاقوں کو فتح کرنے کے لئے بھیجے گئے جو آئندہ اُکی جاگیر میں دیئے جانے والے تھے۔ تاہم ان جنگ آزماؤں نے بھی زیادہ تر فن فریب سے کام نکالا (اور مغل ایسے داؤ کرنے میں مشہور ہیں) خونریزی کی نوبت نہ آنے دی۔ اس کی مثال گولیار ہے جہاں کے حاکم تاتارخاں کو وہاں کے علماء اور طلبہ ناپسند کرتے تھے۔ پہاڑی بلندی پر یہ قلعہ تو قریب قریب ناقابل تسخیر تھا اور بابر نے اسے لینے کے لئے مختصر سی مخلوط فوج بھیجی تھی جس میں نئی بھرتی کے دیہاتی شامل تھے۔ تاہم دوسری طرف سے کافر راجپوتوں کو آمد آمد کا خطرہ ہو گیا تھا۔ بابر کے ایلچیوں نے سمجھایا کہ ایسے کافروں کی چڑھائی کے مقابلے میں ہر مسلمان باایمان کو متحد ہو جانا چاہئے۔ قلعے کے اندر والے علما نے خفیہ تجویز کی کہ پادشاہ کے آدمیوں کو اندر آ جانا چاہئے اور چپکے سے ہاتھی دروازے سے کھسک آنے میں مدد دی۔ اندر آتے ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ تاتارخاں کے بنائے کچھ نہ بنی اور آگرے جا کر پادشاہ کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ جمنا گنگا کے درمیان چند افغان لشکر قریب سے واقعات کو دیکھ رہے

تھے۔ یہ سب سے پہلی عسکری جماعتیں تھیں جنہوں نے بابر کی ملازمت اختیار کر لی اور ایک فوج کی فوج جسے ابراہیم لودھی نے جونپور اور اودھ کی بغاوت فرو کرنے بھیجا تھا، اس نے بھی انہیں کی تقلید کی۔ بابر کی برجستہ ذہانت نے کرشمہ دکھایا کہ اس لشکر کے سرداروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گویا وہ اس کے قدیم الخدمت تھے اور جونپور و اودھ کی بڑی بڑی جاگیریں انہیں عطا کر دیں۔

بابر کی یہ سب تدبیریں وقت سے بازی لے جانے کے لئے تھیں اور گوالیار کے آگے راجپوتوں کے جم غفیر کے جمع ہو جانے سے اس بات کی بہت کم مہلت ملی کہ وادی گنگا کے دشمنوں کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے۔ ادھر اس نے ہمایوں کی ماتحتی میں فوج کے دو جیش روانہ کئے تھے۔ کیونکہ بقول اس کے ہمایوں نے کہا تھا کہ بادشاہ کا آگرے میں قیام ناگزیر ہے۔ ہرچند وہ آب کے معرکوں میں کامیابی کا سہرا وہ اپنے بیٹے کے سر باندھتا ہے۔ لیکن بظاہر ماتحت سپہ سالاروں کو براہ راست ہدایات بھیج کر پوری مہم پر خود نگرانی کرتا رہا۔ ادھر ان بحرانی ایام میں اسے راجپوتوں سے بھگتنے کے لئے بہت کچھ آگرے میں تیاریاں کرنی تھیں۔ اس کے ترک (رومی) استادوں نے چندنئ اور کلاں تر توپیں ڈھالنے کی بھی کوشش کی۔ لکھتا ہے" میں نے استاد علی قلی سے ایک بڑی توپ ڈھالنے کی بھی کوشش کی۔ لکھتا ہے" میں نے استاد علی قلی سے ایک بڑی توپ ڈھالنے کی فرمائش کی تھی۔ جب اس نے بھٹیاں اور سامان تیار کر لیا تو آدمی بھیج کر مجھے اطلاع دی۔ پیر کے دن ہم اس کا ڈھلنا دیکھنے گئے قالب کے گرد آٹھ بھٹیاں لگائی تھیں۔ ہر ایک کی نالی کا منہ اس

قالب کی طرف تھا جس میں توپ ڈھلنے والی تھی۔ میرے آنے پر نالیوں کے منہ کھولے گئے اور پگھلا ہوا تانبا سیال شے کی طرح ہر نالی سے بہہ کر چلا لیکن تھوڑی دیر میں قالب کے بھرنے سے پہلے یکے بعد دیگرے سب نالیوں سے مصالحہ آنا رک گیا۔ یا تو اس (تانبے) کی مقدار میں کمی تھی یا بھٹیاں ٹھیک نہیں بنی تھیں۔ استاد علی قلی کو اس درجہ غیرت آئی کہ چاہتا تھا اس پگھلے تانبے میں خود کو گرا دے۔ میں نے اس کی دل جوئی کی بلکہ خلعت دے کر شرمندگی مٹائی۔

دو دن قالب ٹھنڈا ہو گیا اور اسے کھولا گیا تو استاد علی قلی بہت خوش ہوا اور فوراً مجھے اطلاع دی کہ توپ کی نال پوری بغیر خرابی کے تیار ہو گئی، البتہ بارود کا خانہ بنا کر اس میں جوڑنا پڑے گا اور میں یہ کر سکتا ہوں۔ پھر نال کو نکال کر تراش خراش کے لئے کاریگروں کو دیا اور خود خانہ بنانے میں مصروف ہوا۔

بابر کو یہ بات یاد تھی چنانچہ کچھ روز بعد جب اس کا عقبی خانہ تیار ہو گیا تو اس کے دغنے کی آزمائش دیکھنے گیا۔ یہ (آگے چل کر) ''غازی'' توپ کہلائی۔ جب چلائی گئی تو بغیر نال پھٹے، بھاری گولہ سولہ سو گز پھینکا، جو اس زمانے میں بہت لمبا پرتاپ تھا۔ اس مرتبہ استاد کو خلعت فاخرہ، عربی گھوڑا اور تلوار کی پیٹی (کمر) انعام لی۔

ہمایوں کی سرکشی

ترک مہندس توپیں ڈھال رہے تھے، ہمایوں کی فوجیں شباشب شرق میں بڑھ رہی تھیں، خود پادشاہ آگرے میں راجپوت جتھے کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھا کہا یک خط اس نے حرم سرائے کابل کو بھیجا جس نے وہاں کی بیویوں میں بڑی تشویش اور پریشان پیدا کر دی۔ یہ خط اپنی تزک میں بھی پورا نقل کر دیا ہے:

''گزشتہ جمعے عجیب واقعہ پیش آیا۔ تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم لودھی کی بدنصیب ماں نے سنا کہ میں نے بعض ہندوستانی کھانے کھائے تھے۔ صورت یہ کہ تین چار مہینے قبل میں نے ابراہیم کے باورچیوں کو بلایا۔ پچاس ساٹھ میں سے چار چھانٹ کر ملازمت میں رکھے کہ ہندوستانی کھانے تیار کریں گے جو اس وقت تک میں نے نہیں کھائے تھے۔ ابراہیم کی ماں نے یہ سن کر اٹاوے سے احمد ''چاشنی گیر'' کو بلایا (ہندوستانی (بہ تصحیح مترجم) بکاول کو بھی ''چاشنی گیر'' کہتے ہیں اور اسے کوئی تولہ بھی زہر کی پڑیا ماما کے ہاتھ بھیجی۔ احمد یہ پڑیا میرے باورچی خانے کے ایک ہندوستانی باورچی کے پاس لایا اور اسے چار پرگنے جاگیر میں دلوانے کا وعدہ کیا اگر کسی طرح وہ زہر میرے کھانے میں ملادے۔ ابراہیم کی ماں نے ایک اور ماما بھی بھیجی کہ دیکھ کر آئے۔ پہلی ماما نے زہر احمد کو دے دیا ہے یا نہیں۔

حسن اتفاق سے باورچی نے زہر پتیلی میں نہیں ڈالا بلکہ بلکہ رکابی میں چھڑکا۔ کیونکہ میرا حکم تھا کہ چاشنی گیر سالن پتیلی سے نکال کر ہندوستانی باورچی کو چکھایا کریں۔ مگر نالائق چاشنی گیروں نے رکابی میں سالن کے بعد نگرانی نہیں کی۔ چینی کی

رکابی میں جو چھلکے لائے جاتے ہیں۔ باورچی نے کچھ زہر ان پر چھڑک دیا اور اوپر میں گھی میں بگھاری ہوئی بوٹیاں رکھ دیں۔ اگر بوٹیوں پر بھی چھڑک دیتا تو بہت خرابی ہوتی۔ مگر وہ گھبرا گیا اور آدھا زہر چولھے میں گیا۔ جمعے کی نماز سے فارغ ہو کر دسترخوان چنا گیا۔ میں نے خرگوش کے گوشت کی رکابی سے کچھ کھایا۔ گاجریں پکی تھیں، وہ کھائیں پھر چند لقمے زہر والی رکابی سے لے کر کھائے پہلے تو کوئی چیز بے مزہ نہیں معلوم ہوئی، لیکن گوشت کی بوٹیاں کھائیں تو طبیعت بگڑ گئی۔ ایک دن پہلے خشک گوشت (''رقاق'') پکوا کر کھایا اور وہ بے مزہ معلوم ہوا تھا، میں سمجھا کہ اسی کے باعث متلی ہو رہی ہے۔ دو تین دفعہ ابکائی آئی۔ قریب تھا کہ دسترخوان پر ہی قے ہو جائے آخر اٹھ کر آبدار خانے میں گیا۔ جاتے جاتے ابکائیاں آئیں۔ پھر وہاں قے کی۔ کھانا کھا کے مجھے پہلے کبھی قے نہیں ہوئی تھی اور زیادہ شراب پی کر بھی ایسی نوبت نہ آئی تھی۔ لامحالہ شبہ پیدا ہوا اور حکم دیا باورچیوں کو حراست میں لے لیا جائے۔ ڈالی ہوئی غذا کتے کو کھلائی اور اسے نظر میں رکھا تو دوسری صبح اس کا پیٹ ابھر گیا اور ایسا علیل رہا کہ پتھر مارتے تھے تو بھی جگہ سے نہ اٹھتا تھا۔ بارے دوپہر کو وہ اٹھ بیٹھا اور مرنے سے بچ گیا۔ پتھر مارتے تھے تو بھی جگہ سے نہ اٹھتا تھا۔ بارے دوپہر کو وہ اٹھ بیٹھا اور مرنے سے بچ گیا۔ میرے دو ایک سپاہیوں نے بھی زہر والی رکابی سے کھایا تھا۔ وہ بھی قے کرتے رہے۔ ایک کی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ شکر ہے ہم سب بچ گئے۔

میں نے سلطان محمد، بخشی کو تفتیش کا حکم دیا اور جب باورچی کو سخت مار لگانے

چلے تو اس نے سارا حال ایک ایک کر کے بیان کر دیا۔ پیر کو دربار کا دن تھا، میں نے سب امیروں، وزیروں کو عمائد کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ سر دربار وہ دو مرد اور دونوں عورتیں لائی گئیں اور ان سے جرح کی گئی۔ انہوں نے پورا واقعہ اور اس کی تفصیل سنا دی۔ چاشنی گیر (احمد) کے ٹکڑے کرا دیئے۔ باورچی کی کھال کھنچوا دی گئی۔ ایک عورت کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا، دوسری کو بندوق سے اڑا دیا۔ ماد ابراہیم کو حراست میں رکھوایا گیا (بعد میں یہ کابل بھیجی گئی اور اس نے دریائے سندھ میں اپنے آپ کو گرا دیا)

ہفتے کو ایک پیالہ دودھ کا میں نے پیا اور اتوار کو تریاق فاروق ملا کر پیا۔ پیر کو مسہل لیا۔ کالا کالا صفرا سا خارج ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم زندہ سلامت رہے۔ جو کچھ پیش آیا اس کی سب تفصیل میں نے یہ سمجھ کر کہ (کابل میں) تشویش نہ ہو، خود لکھ دی ہے۔ یہ بلا ساتھ خیر کے ٹل گئی۔ اب کسی کو خوف و پریشانی کی ضرورت نہیں (شعر ترکی)

''چوٹ کھائی، بیمار ہوا، زندہ ہوں
موت کا مزا چکھا تو زندگی کی قدر ہوئی''

یہ خط منگل کو لکھا۔ ''میں چار باغ (آگرہ) میں ہوں۔'' پھر بابر لکھتا ہے کہ ''انہی دنوں میں بیانہ کے فوجدار مہدی خواجہ کے آدمی پے بہ پے آنے شروع ہوئے

اور خبر لائے کہ رانا سانگا کا آنا یقینی طور پر معلوم ہو گیا حسن خاں میواتی بھی اس سے جا ملنے کے لئے تیار بتایا جاتا ہے۔ اب اور سب باتوں سے پہلے اس کا تدارک ہونا چاہئے۔ پوری فوج کے آنے سے پہلے ہی کچھ مکمل بیانہ پہنچ جانی ضروری ہے۔''

بابر پہلے ہی ہمایوں کے سبک پا لشکروں کو مشرق سے واپس آنے کا حکم دے چکا تھا، جہاں نصیر خاں اور اس کے جونپور و اودھ کے حلیفوں کو مغلوں نے اپنے ہندوستانی پٹھان وفا داروں کی معیت میں بری طرح کھدیڑا تھا۔ یہ آزادی کے دعوی دار بابر کے الفاظ میں ''باغی'' تھے۔ صبا رفتار مغل سواروں نے گنگا کو عبور کیا اور نصیر خاں کی فوجوں کو گھاگرا تک دباتے ہوئے چلے گئے۔ باپ کا حکم ملا تو ہمایوں نے چند دستے چھوڑ کر کہ غیر منظم افغانوں کی خبر رکھیں، واپس کوچ کیا اور کالپی کے راستے پھیر کھا کے آگرے آیا۔ کالپی کے رئیس کی طرف سے کچھ کھٹکا تھا، اسے ہمراہ لیتا آیا۔ یہ پوری مہم جس سے بابر کا مقصد مشرقی حریفوں کو آگرے سے دور دھکیل دینا تھا آندھی کی تیزی سے چلی اور بڑی آن بان سے تکمیل کو پہنچی۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے سمجھنا مشکل ہے۔

ہمایوں جنوری 1527ء میں آگرے کے زیر تکمیل چار باغ میں باپ کے حضور میں باریاب ہوا۔ حسب معمول اعزاز و اکرام تحسین و آفرین سے جس میں بابر بیٹے کے ساتھ کبھی بخل نہ کرتا تھا، نوازا گیا۔ مگر یہاں یا شاید چند روز بعد اس نے اپنی دور دراز ولایت بدخشاں کو جانے کی اجازت مانگی۔ بابر زہر خورانی کی پوری جزئیات لکھتا ہے، بخلاف اس کے بیٹے کی اس متمردانہ درخواست کی نسبت قریب

سکوت کر جاتا ہے۔ ایسی اجازت کہ جس وقت ساری فوج مارا مار راجپوتوں سے لڑنے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی شہزادہ ہمایوں اپنی مضبوط بدخشانی جمعیت کے ساتھ چلا جائے، کسی طرح نہدی جاسکتی تھیں۔

ہمایوں نے ایسے نازک موقع پر باپ کو چھوڑ دینے کا خیال بھی کس طرح کیا، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ممکن ہے من موجی شہزادے کی خواجہ کلاں سے کوئی قرارداد ہوگئی ہو۔ خواجہ چند مہینے پہلے تک اس کا اتالیق ومشیر تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اور کئی سردار بابر کو واپس کابل لے آنا چاہتے تھے۔ ہمایوں کی نسبت بزدلی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس جنگ میں اپنی ماں سے کئی دن مشورے کرنے کے بعد وہ بادل ناخواستہ شریک ہونے آیا تھا۔ پھر جنگ میں ان سن رسیدہ آزمودہ کار سرداروں کے زیرنگرانی رہنا بھی اسے پسند نہ تھا، جو بابر کی ہر ہدایت کو قرآن و حدیث کے حکم کی طرف مانتے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بدخشانی سپاہی تقریباً 14 مہینے سے وطن چھوڑے ہندوستان میں مصروف جنگ رہے وہ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ اس نفرت انگیز ملک میں مزید مخدوش لڑائیاں لڑنے سے قبل جو کچھ مال متاع حاصل کیا تھا، اسے لے کر خیریت سے واپس چلے جائیں۔ مگر ممکن ہے ان میں سے کوئی سبب بھی نہ ہو بجز اس مراقی شہزادے کی ناتجربہ کاری اور پریشان خیالی کے ......بہر حال بابر نے وعدہ کیا کہ اس جنگ کے فوراً بعد ہمایوں کو بدخشاں جانے کی رخصت دے دی جائے گی۔ اسی زمانے میں عفو وکرم کی ترنگ میں آ کر میں اس نے حسن خاں میواتی کے بیٹے کو جو ی رغمال میں زیرنگرانی تھا، آزاد کر دیا بلکہ خلعت اور

مراحم شاہانہ کے وعدوں سے مطمئن کر کے آگرے سے رخصت کیا۔حسن خاں بیٹے کی طرف سے بہت پریشان تھا اور کوئی فیصلہ نہ کرسکتا تھا کہ مغلوں کا شریک حال رہے یا راجپوتوں کے جتھے میں جا ملے۔ بیٹے کے سلامت آتے ہی وہ راجپوتوں کی طرف چل پڑا۔

اسی کے ساتھ خبر آئی کہ وہ نیم مسلح جوق جو بیانے کی مقامی فوج کی مدد کے لئے گیا تھا، دشمن کے انڈتے سیلاب کے سامنے نہ ٹھیر سکا اور مقامی جمعیت سمیت سیدھا واپس چلا آرہا ہے۔

''آٹھ ستاروں کا خلاف جمع ہونا''

اب تک جس قدر حریف مغلوں سے لڑے، راجپوتی جتھا ان سب سے قوی تر قسم کا تھا اور بیانے سے بھاگنے والوں نے اقرار کیا کہ وہ راجپوتوں سے خوفزدہ ہیں۔

راجستھان کے رئیس اور راجہ آپس میں برابر لڑتے رہتے تھے لیکن ایک بیرونی دشمن کے مقابیل میں پوری طرح متحد ہونے کی قابلیت سے عاری نہ تھے۔ مسلم پادشاہ کے خلاف انہوں نے پورا سنگھٹن کرلیا تھا۔ان میں سات بڑے راجا اور شاید سو کے قریب چھوٹے رئیس کل اسی ہزار سواروں کا لشکر اور کئی سو جنگی ہاتھی لے کر آگئے تھے۔نام اور القاب کی فہرست پڑھے تو پرانی رزمیہ مثنویاں یاد آجاتی ہیں کہ سلسلہ وار میواڑ کے جھنڈوں کے پیچھے چتوڑ، رنتھنبور، چندمیری کے جنگجو چلے آرہے

ہیں۔ راجپوتی بہادری کا جوش دلوں میں بھرا ہے۔ دیس کے مالک ہونے کا زعم رکھتے ہیں اور اس وقت مسلمان حملہ آوروں سے اپنی جنم بھومی کو بچانے آئے ہیں۔ راجپوتوں کا حوصلہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ جنگ میں صرف اس وقت قدم ہٹاتے ہیں جب کہ دست بدست مقابلے میں ان کی صفیں پارہ پارہ ہو جائیں۔ انہیں حسن خاں میواتی وغیرہ اتحادیوں پر اسی قدر بھروسہ ہے کہ کامیابی میں ساتھ دیں گے اور مصیبت میں کام نہیں آئیں گے۔

راجپوتوں کا سرخیل، بابر کی طرح سپاہیوں کا محبوب ہے۔ رانا سانگا، سنگرام سنگھ چتوڑی لڑکپن سے معرکے لڑتا رہا اور ایک ہاتھ، ایک ٹانگ اور ایک آنکھ انہی آویزشوں کی نذر کر چکا ہے۔ اس کے مرتے وقت کہا جاتا ہے کہ جسم پر اسی زخموں کے نشان گنے جاسکتے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ ''رانا سانگا کو حکومت اپنی ہمت اور تلوار کے زور سے حاصل ہوئی تھی۔''

کسی سپاہ کی ہمت قومی اسباب اور نسلی روایات پر مبنی ہوا کرتی ہے۔ پھر اس موقع کے سپہ سالار کی قابلیت پر جیسے ہنی بال نے رومہ پر فوج کشی کی تو گو اس کا لشکر بہت مختلف عناصر کا مجموعہ تھا اور مقابلے میں رومی فوجیں زیادہ متحد اور قومی شعور سے متکیف تھی تاہم اس کی ذاتی فوقیت بازی لے گئی۔ مگر ان سب امور کے علاوہ کسی جنگ سے پہلے کے واقعات اور عجیب وغریب افواہوں کا بھی جو پڑاؤ میں الاؤ ون کے گرد اڑتی پھرتی ہیں، اچھا خاصا اثر ہوا کرتا ہے۔ اب آگرے میں لشکر کے حوصلے تھے کہ پست ہوئے جاتے تھے۔ بابر کو بھی اس بات کی خبر تھی۔ زمانہ حال کی فوج

دشمن کی اتنی زیادہ تعداد کے مقابل ہوتی تو غالباً جمنا کے کنارے آگرے کے گرد خندقیں کھود کو مدافعانہ جنگ کرنے کو ترجیح دیتی۔ مگر بابر اس قسم کی ذرا سی کمزوری بھی دکھاتا تو دوآب کے میدان اور قلعے کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ محض تاخیر کی بدولت بیانہ ابھی نکل چکا تھا۔ پس پیش قدمی کے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ لشکر لے کر راجپوت جتھے سے لڑنے چل پڑا۔ ہر اگلی منزل پر کنوئیں کھدواتا، احتیاط سے قدم بڑھاتا اور دشمن کی بدلتی منزلوں اور لشکر گاہوں کی پوری طرح خبریں منگواتا تھا۔ پانی پت کی طرح اس کے متحرک مورچے ساتھ ساتھ تھے اگرچہ یہاں قوی تر سوار فوج کا سامنا درپیش تھا۔ بعض ہندو رئیس جنہوں نے حال میں اطاعت و ملازمت قبول کر لی تھی، بابر نے ان پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ انہیں عقب میں دور کے قلعوں کی (جیسے سنبھل) حفاظت کے لئے بھیج دیا تھا۔

جنگ کا پہلا مقابلہ نقصان پر منتج ہوا۔ قراول کی ایک جمعیت جو دیکھ بھال کے لئے گئی تھی۔ بے احتیاطی سے دور تک بڑھے چلی گئی۔ دشمن چوکس تھا۔ ''مگر یہ لوگ کنواہہ کے راستے پر آگے پیچھے دیکھے بغیر چلے'' اور گھوڑے دوڑا کر ہندوؤں کے چند بڑے گروہوں پر جا پڑے۔ نتیجے میں ہر طرف سے گھیرے میں آ گئے۔ محمد علی جنگ جنگ کے امدادی لشکر نے بڑھ کر انہیں وہاں سے نکالا اور ب چا کر لے آیا۔ لیکن اسی اقدام نے راجپوتوں پر آئندہ رسالے کی کسی دوش کو روک دیا، جن کے لشکر اب مغل لشکر سے کوئی چھ کوس کے فاصلے کی بستی کنواہہ کے گرد مجتمع ہو رہے تھے۔

بابر نے ایک تالاب کے کنارے توپوں کے سامنے خندق کھدائی اور دستور

سابق کے مطابق گاڑیاں (ارابے) رسیوں سے بندھوا کر دفاعی خط تیار کیا کہ لوگوں کے حوصلے مضبوط ہوں۔ بڑی توپ ''غازی'' (57) ڈھالنے والے استاد علی رومی کو اپنے نائب مصطفیٰ رومی سے خلش تھی۔ لہذا نے ان عثمان لی استادوں کو الگ الگ صف لشکر کے انتہائی سروں پر متعین کیا۔ کانٹے کے دونوں بازوؤں پر ہمایوں اور عالم خاں نامزد ہوئے لیکن اصل قیادت کابل کے آزمودہ کار سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی۔ چین تیمور کو اپنے پاس قول یا قلب لشکر میں رکھا تھا۔

پادشاہ لوگوں کے دل بڑھانے کا موقع ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ سواروں کا قافلہ کابل سے آنے کی اطلاع ملی تو اس کی پیشوائی کے لئے کئی رسالے بھیجے کہ پرچم لہراتے ہوئے جائیں اور دھوم دھام سے ساتھ لائیں، تاکہ دشمنوں کو خیال ہو کہ کوئی بڑی کمک آئی ہے۔ اسی قافلے کے ساتھ اونٹوں کی قطار بھی غزنیں سے آئی اور وہاں کی شرابوں کے علاوہ ایک جہاں گرد نجومی کو بھی لائی۔ اس نے اہل لشکر کی بددلی کو دیکھ کر ایسی ہی بری بری پیش گوئیاں کرنی شروع کیں۔

''ایسے زمانے میں جب کہ فوج میں فکر و تشویش پائی جاتی تھی اور بعض اوقعات بھی نامساعد پیش آئے تھے۔ یہ کم بخت شریف نجومی آ گیا اور مجھ سے تو کچھ نہ کہہ سکا مگر اور جس کسی سے ملتا، یہی کہتا تھا کہ ''آج کل ساٹھ ستارے مغرب میں ہمارے مقابل آ گئے ہیں۔ جو کوئی مشرق سے لڑنے جائے گا شکست کھائے گا۔'' ضعیف الاعتقاد لوگوں کی یہ باتیں سن کر اور بھی ہمت پست ہوتی تھی۔ لیکن میں نے اس کی ہفوات پر بالکل توجہ نہ کی اور اپنی جگہ تدابیر میں کوئی تبدیلی یا فرق نہ آنے دیا۔'' بابر کو

ابھی تک اپنے لڑکپن کی وہ شکست یاد تھی جو نجومی کی جھوٹی پیش گوئی کی بدولت اندجان کی ندی کے پل پر کھائی تھی۔ البتہ (بہ تصحیح مترجم) میوات پر تاخت کرنے کا منصوبہ نہ چل سکا تو اس نے اپنے نفس کے محاسبہ پر توجہ کی۔ لکھتا ہے کہ "پیر کو میں سوار ہو کر نکلا تو اسی گشت میں خیال آیا کہ کتنے دن سے توبہ کا ارادہ کر رہا ہوں جو پورا نہیں ہوا اور گناہوں کی سیاہی دل پر چڑھتی رہی۔ میں نے کہا "آہ، اے نفس کب تک گناہوں میں تو سرشار رہے گا اور زندگی برباد کرتا رہے گا۔ بس۔ توبہ کر۔"

چنانچہ پڑاؤ پر واپس آتے ہی شیر نے اعلان کیا کہ آج سے میں نے قاتل حیات، شراب ترک کی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ سونے چاندی کے شاہی ساغر و سبو توڑ کر فقرا اور مساکین میں وہ سیم و زر تقسیم کر دیا جائے۔ اسی توبہ کی یادگار میں ڈاڑھی بھی رکھ لی۔ سب سے پہلے بادشاہ کی تقلید شراب سے توبہ کرنے والا رات کا چوکیدار تھا جس کے بعد کئی سو امرا، سردار و سپاہیوں نے شراب خوری سے توبہ کی۔ شراب کے سبو زمین میں انڈھا دیئے اور غزنین سے جو شراب آئی تھی، اس میں نمک ڈال کر سرکا بنایا گیا۔

اس توبہ کے بعد بابر اپنی قسم پر قائم رہا۔ ایک عام فرمان بھی جاری کیا گیا پوری علم داری میں شراب کی فروخت ممنوع کر دی گئی۔ درباری شاعر شیخ محمد زین نے یاد دلایا کہ آپ نے منت مانی تھی کہ خدا، رانا سانگا پر فتح دے گا تو مسلمان رعایا کا محصول معاف کر دوں گا۔ بابر کو بھولا وعدہ یاد اور معافی کے فرمان پر بھی دستخط کیے لیکن جنگ کے بعد یہ جزیہ پھر بھلا دیا۔

توبہ وانابت کے باوجود، جس میں بابر مخلص و صادق تھا، ظاہری حالات میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔ لکھتا ہے کہ ''ان دنوں کوئی شخص ہمت و حوصلہ مندی کی بات نہیں کہتا۔ جن وزیروں مشیروں سے صلاح نیک کی توقع ہے، کوئی کلمہ خیر زبان سے نہیں نکالتے۔ وہ امرا جو بڑی بڑی جاگیریں ہضم کر چکے ہیں کوئی مدد نہیں دیتے بجز ایک خلیفہ کے جو برابر حق رفاقت ادا کر رہا ہے اور کسی کام میں فروگذاشت ہونے نہیں دیتا...... ادھر فتنے ہیں کہ ہر طرف سر ابھار رہے ہیں۔ دشمنوں میں سے حسین خاں نے راپری کو جا دبایا۔ قطب خاں نے چندلور پر قبضہ جمایا (لب جمنا) خواجہ زاہد سنبھل چھوڑ کر چلا آیا۔ گوالیار کا قلعہ اس نواح کے ہندوؤں نے آگھیرا اور عالم خاں جسے کمک دینے بھیجا تھا ٹل کر اپنی جاگیر کو چل دیا۔ ایک مردک رستم خاں نے جمنا پار کے ترکش بندوں کو جمع کر کے کول کو لے لیا۔ بہت سے ہندوستانی عمائد بھاگ گئے۔ بارے کا حسن خاں ہندوؤں سے جا ملا۔ میں نے ان میں سے کسی شخص کی جانب اعتنا نہ کی بلکہ اپنے (جنگی) کام میں مصروف رہا۔''

ہرچند بابر واضح الفاظ میں نہیں لکھتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ متعدد قلعوں کا ہاتھ سے نکل جانا کچھ کم فکر کی بات نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی آگرہ کنواہہ کے راستے ہی میں ہے اور دشمن کے (بے ضابطہ) حلف خود آگرے کے آس پاس آ لگے ہیں اور جیب کترنے میں مصروف ہیں۔ ان کی کامیابی مزید بے وفائی اور فراری کا باعث ہو رہی ہے۔ مجموعی طور پر بیرونی مسلم اور دیسی ہندو کے اس مقابلے میں قوت کا پلڑا آگرے کی بجائے کنواہہ کے پڑاؤ کی طرف جھکا چلا جاتا ہے۔ دیکھنے والے

یہی رائے لگا رہے ہیں کہ بابر کو شکست کا سامنا ہے اور وہ کوئی تدارک نہیں کر رہا، بخلاف اس کے رانا سانگا نے فتح کے بہت کافی اسباب جمع کر لئے ہیں۔

بابر نے اپنے امراء اور سرداروں کو جمع کر کے دوٹوک تقریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اہل لشکر کو ترغیب و تحریک دینے کا یہ واقعہ سب سے بہتر ایک عورت (گلبدن) کے قلم سے بیان ہے:۔

"اب جو دشمن اتنے قریب آ گیا تو اس کے قلب ہمایوں کو یہ (اجتماع کی) تدبیر سوجھی۔ امرا اور خوانین سلاطین، چھوٹے بڑے، امیر غریب سبھی اس کی تقریر سننے کے لئے آ گئے۔ تب اس نے کہا "کیا تم نہیں سمجھتے کہ ہمارے اور ہمارے دیس اور وطن کے درمیان کئی مہینے کا سفر کا فاصلہ حائل ہے۔ اگر ہمیں خدا نا خواستہ، یہاں شکست ہوئی تو ہمارا ٹھکانا کہاں رہے گا؟ ہمارا مادری وطن کہاں، ہمارا شہر کہا ہے۔ ہم اس وقت اغیار روا جانب کے بیچ میں ہیں۔ ہر اعتبار سے ضروری اور بہتر ہے کہ تم خوب سمجھ لو کہ تمہارے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ اگر فتح ہوئی تو ہم خدا کی راہ میں غازی ہوں گے، اگر فتح نہ ہوئی تو جان دے کر شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان دونوں صورتوں میں نجات وفلاح ہماری ہے۔ ہمارا قدم آگے ہی پڑے گا۔ ہمارا نام نیک ہمیشہ یادگار رہے گا۔"

یہ بابر کا پرانا نظریہ تھا: نیک نامی کی موت کہیں بہتر ہے بدنامی کی زندگی ہے۔ اس میں کسی بناوٹ کا دخل نہ تھا۔ حقیقت میں وہ یہی سمجھتا تھا اور اسی اذعان کی تاثیر تھی جو سارے لشکر میں دوڑ گئی۔ انہوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر بطیب خاطر قسمیں

کھائیں کہ مر جائیں گے، میدان سے منہ نہ پھیریں گے۔ ہر جگہ اسی قول وقسم کا ہنگامہ سا برپا تھا۔ نجومی کے احکام اور بڑی بڑی فالیں، وقت کے وقت ہوا ہو گئی تھیں ...... پھر بابر نے اپنے آدمیوں سے وعدہ کیا کہ رانا سانگا سے جنگ کے بعد جو شخص بھی وطن کو واپس جانا چاہے گا اسے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

چند گھنٹوں تک پورے لشکر گاہ میں دینی جہاد کا جوش وخروش نظر آتا تھا۔ لیکن کنواہہ کی سڑک کے دوسری جانب ہندو پڑاؤ میں بھی ایسے ہی جذبات (بلا اعلان) طاری تھے۔

بابر نے بلا تامل فوج کو میدان کارزار میں نکلنے کا حکم دیا۔ یہ فارسی نوروز، 13 مارچ 1527ء (933ھ) کا دن تھا۔ توپ اور ارابوں کی قطاریں جو رسوں اور زنجیروں سے آپس میں جکڑ کر باندھی گئی تھیں، حرکت میں آئیں۔ نئی خندقیں کھودنے والے آگے آگے اور تفنگچی، مرتب صفوں میں شتابے جلائے ہوئے عقب میں بڑھ رہے تھے۔ قدم قدم چل کر راجپوتی پڑاؤوں اور ان کے اگلے رسالوں تک پہنچ رہے تھے۔ اوپر آسمان سے ہوئی دیکھنے والا شاید ایسا مشاہدہ کرتا کہ ایک سوسمار کسی چیتے پر حملہ کرنے کے لئے رینگتا ہوا چلا آتا ہے۔

''میدان کارزار کنواہہ''

پانی پت کی طرح اس جنگ کی نسبت بھی خود بابر نے کچھ زیادہ نہیں لکھا اور سرکاری شاعر شیخ زین کا ''فتح نامہ'' فصاحت و بلاغت کی لفاظی میں اصل واقعات کا

انکشاف ہونے نہیں دیتا۔ تاہم ابہام کے پردوں سے بعض صحیح جزئیات نکل آتی ہیں۔ بابر کی متحرک قطار کے درمیان فاصلے چھوڑ کر ان میں بڑی بڑی چوبی تپائیاں پہیوں پر چلائی جا رہی تھیں۔ عین کارزار کے دن ان سب کو نیم کندہ خندقوں کے پیچھے جو وقت کے وقت کھودی گئیں، ایک زنجیرے میں متحد اور پیوستہ کر دیا گیا تھا۔ شیر کا حکم تھا کہ اس حد سے باہر کوئی سپاہی نہ بڑھے۔ اور پوری صف کا خود اس نے سوار ہو کر معائنہ کیا کہ ہر سوار کو اپنے اپنے مقام پر مستعد رہنے کا جائزہ لے۔ راجپوت زرہ پوش جنگی ہاتھیوں کے پیچھے پیچھے بڑھے اور اس لئے ان کی رفتار شروع میں سست تھی۔

پانی پت کے مقابلے میں یہاں فوج کی ردیف کو بہت گہری صفوں میں مجتمع کیا تھا لہذا پورا لشکر، طویل پتلی قطار کی بجائے دشمن کو چوکور اور چھدرا چھدرا نظر آتا ہو گا۔ سامنا ہوتے ہی سب سے پہلے توپوں نے بڑھتے ہوئے ہاتھیوں پر گولہ باری کی اور معلوم ہوتا ہے۔ بڑی توپوں کے درمیان زنبورکوں نے زاویوں میں ترچھی باڑیں چلائیں۔ ادھر راجپوتی رسالوں نے جو پر جوش یورشیں کیں تو مغلوں کی تیر باری نے تیر باری نے ان کا منہ پھیر پھیر دیا۔ بابر کے سپاہی اپنی قسم کے پابند رہے انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی جگہ سے قدم نہ ہٹائیں گے اور مریں گے یا مارے جائیں گے۔

دوپہر کی تیزی نے بھی گھمسان کی جنگ میں کوئی کمی نہ ڈالی۔ راجپوتی دلاوری یکے بعد دیگرے حملے پر حملے کر رہی تھی، کیونکہ ایک لشکر ہٹتا تو دوسرے راجہ رانا کے

رسالے اس کی جگہ لیتے اور حریف پر ٹوٹ کر جا پڑتے تھے۔ عصر کے وقت تک بابر اپنی ردیف کے تمام دستے جنگ کے میدان میں جھونک چکا تھا اور ابھی تک اس کے جناحی لشکروں کو دونوں بازو برقرار رکھنے کی کوشش میں یہ مہلت نہ ملی تھی کہ پھیر کھا کے دشمن کی پشت پر جا نکلیں۔ شاید از سر نو صفوں کی درستی، زخمیوں کو پیچھے لے جانے اور گھوڑوں کو ستانے میں تھوڑا سا وقفہ واقع ہوا تھا کہ اتنے میں پادشاہ نے غیر متوقع حکم یہ دیا کہ پورا لشکر وقت واحد میں راجپوتوں پر حملہ کرے۔ ایک دم زنجیر بند ارابوں کے درمیان کے کھلے حصوں سے سوار نکل پڑے۔ توپوں کو آگے کھینچا گیا۔ تفنگچیوں نے سرعت سے پیش قدمی کی۔ اس چال کا فوری اثر ظاہر ہوا۔ راجپوتوں کے ملے جلے لشکروں نے بظاہر اس براہ راست تھپیڑ کو روکنے کی تیاری کی اور وسط کی طرف سمٹے ٹھیک اسی لمحے مغلوں کے جناحی جھپٹے پوری قوت سے چلے اور ہندوؤں کو تین طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ وہ ابھی تک مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے لیکن صفیں متزلزل ہو گئیں اور خود ان کے حملے بالکل رک گئے۔ اب اس عظیم لشکر کے اجزا ادھر ادھر گھیرے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رانا سانگا زخمی ہو کر میدان سے ہٹا لایا گیا تھا۔ سورج چھپتے چھپتے راجپوتوں نے میواڑ کے پہاڑوں کے رخ بھاگنا شروع کیا۔ مگر کہتے ہیں رانا سانگا نے قسم کھائی تھی کہ فتح کیے بغیر شہر میں واپس نہ آئے گا، لہذا اس نے چتوڑ جانا قبول نہ کیا۔

غروب آفتاب کے قریب بابر دشمن کو بھگاتا ہوا اس کے لشکر گاہ میں پہنچ گیا جو مغلوں کی صبح کے وقت کی صف بندی سے کوئی کوس بھر کے فاصلے پر تھا۔ وہ ایک کوس

اور آگے گیا اور پھر ''رات ہو جانے کی وجہ سے نماز عشا کے وقت تک اپنے اردو میں واپس پہنچ گیا۔''

راجپوتوں کی روایات کی رو سے ان کے لشکر کا بڑا حصہ میدان میں کھیت رہا۔ مقتولوں میں ان کے بہترین بہادروں کے نام آتے ہیں: ڈونگر پور کا راول، برادری کے دوسو منچلوں کے ساتھ۔ سلمبر ا کا راجہ چنداوت برادری کے تین سو عزیزوں کے ساتھ ۔ مارواڑ کا راج کمار اپنے سرداروں کے ساتھ۔ سونی گڑھ کا راؤ۔ چوہان رئیس، روسائے میواڑ اور بہت سے دوسرے نامی لوگ سب مارے گئے ۔ انہی مقتولوں میں حسن خاں میواتی بھی تھا۔

مغل فتح مندوں نے مقتولوں کے بریدہ سروں کا میدان میں ''کلہ منار'' تیار کیا اور بابر کو ''غازی'' یعنی ایک دینی جنگ کے فاتح کے لقب سے ملقب کیا۔ بے شبہ اس کی سپہ سالاری نے وہ معرکہ سر کیا جو نتائج کے اعتبار سے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ رانا سانگا اپنے زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور سال بھر کے اندر مر گیا ۔ اس کی اولاد میں بھی کسی کو پھر ہندوستان میں مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی ۔ پانی پت میں بابر نے شمالی ہند کے مسلمانوں بادشاہوں کی قوت توڑ دی تھی۔ کنواہہ میں اس نے راجپوت جتھے کا دم خم نکال دیا۔

''بجز تقدیر الٰہی کچھ نہیں ہوتا''

پانی پت کے بعد بابر نے سوار لشکر تیزی سے آگرے تک دوڑائے تھے۔ کنواہہ کے بعد ایسا کوئی اقدام نہیں کیا۔ ممکن ہے دن بھر کی شدید خونریزی میں فوج کو اس سے زیادہ نقصان پہنچا ہو جتنا کہ اس کے بیان سے منکشف ہوتا ہے وہ اپنا سرداروں کی سستی کی شکایت کرتا ہے لیکن مغل فوج کا راجستھان کی تپتی وادیوں میں گھسنے سے رکنے کا بڑا سبب گرمی کی آمد آمد ہوا۔ آزمودہ کار سپہ سالاروں کو قلعوں کی بازگشت کے لئے جو افراتفری کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے، بھیجنا ضروری تھا۔ بابر نے اپنے پرانے داؤ سے کام لیا کہ مستحق سپاہیوں کو جاگیریں دے کر روانہ کیا کہ جائیں اور خود ہی ان کو مفتوح کریں۔ پھر اپنے وعدے کا، اگرچہ بادل ناخواستہ، ایفا کیا کہ اکثر سرداروں کو جنہوں نے کابل کے سرد پہاڑوں کو واپس جانا چاہا، اپنے غنائم اور جمعیت کے ساتھ واپسی کی اجازت دے دی۔ خواہش کے اعتبار سے خود بادشاہ بھی وہاں کی یاد سے بے قرار تھا۔

بہر حال یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک تہائی صدی تک خوفناک دشمنوں کے مقابلے میں رہنے کے بعد شیر کو یہ سکون میسر آیا کہ افق سے کسی نئے خطرے کے سر پر آ جانے کی تشویش نہیں رہی۔ اب وہ رات کو زرہ پہنے بغیر سو سکتا تھا۔ آس پاس مخالفت اور بدسگال لوگوں کی کمی نہ تھی اور بہت سے مسائل حل طلب باقی تھے، لیکن اسے ان کی چنداں فکر نہ تھی۔ خدا کی رحمت اور فضل پر بھروسا بڑھ گیا تھا جس نے توبہ کرنے والے مومنین کو دگنی تگنی تعداد کے کافروں پر فتح کامل عطا کی اور وہ اعتقاد

رکھتا تھا کہ دوسری پریشانیوں میں بھی وہی خدائے رحیم وقدیر اس کی مدد فرمائے گا۔ تزک میں اگلے چند ماہ کے حالات بہت قل دول تحریر کئے گئے ہیں لیکن ان کی تہ میں ایک نیا اعتماد جھلکتا ہے اگرچہ پادشاہ کے دور اندیش دنیا دار امرا اس شیریں خیالی میں اس کے ہم خیال نہ تھے۔

"فتح نامہ" نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "فتح کی سب سے پہلے مبارک باد دینے جو لوگ آئے انہی میں محمد شریف نجومی بھی آیا جس نے طرح طرح کی بد فالیاں نکال کر مجھے آزادیا تھا۔ میں نے بھی برا بھلا کہہ کر دل کا بخار نکال لیا۔ لیکن کافر نعمت، منحوس، خود پسند اور ناپسندیدہ مزاج ہونے کے باوجود، قدیم الخدمتہ تھا اس لئے میں نے ایک لاکھ (دام) انعام اور ملک سے چلنے جانے کا حکم دے کر اسے رخصت کیا۔"

"(بہ تصحیح مترجم) طاہر خاں کی نسبت یہ سمجھ کر کہ اچھی کارگزاری کی ہے، میں نے الور کا پرگنہ اور پچاس لاکھ دام عطا کئے۔ لیکن اس نے بد دماغی سے انکار کیا اور معلوم ہوا کہ وہ کارگزاری بھی اصل میں چین تیمور سلطان کی تھی۔ پس میوات کا پرگنہ اور پچاس لاکھ سے دیئے گئے اور الور تردی بیگ کے نام کر دیا جس نے میمنے پر اوروں سے عمدہ کام انجام دیا تھا۔ الور کا خزانہ ہمایوں میرزا کو دے دیا۔ رانا سانگا سے جہاد کے وقت جب لوگوں سے حلف لیا گیا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ جو کوئی ہندوستان سے جانا چاہے گا اسے رخصت دی جائے گی۔ ہمایوں کے سارے لشکری بدخشاں یا کوہستان پار کے تھے اور ایک دو ماہ سے زیادہ کبھی اپنی ولایت سے باہر

نہیں رہے تھے۔لڑائی سے قبل ان کی روش اچھی نہیں رہی تھی۔ دوسرے ولایت کابل میں سپاہ بہت کم رہ گئی تھی۔ان سب وجہ سے میں نے ہمایوں کو کابل جانے کی اجازت دے دی۔''

(آگے چل کر) ''اطلاع ملی کہ ہمایوں نے دہلی کے راستے جاتے ہوئے، کئی کوٹھوں کا قفل تڑوایا اور بغیر میری اجازت روپیہ نکلوالیا۔ مجھے اس سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔نہایت رنج ہوا اور میں نے سخت سست کلمات اسے لکھے۔''

یہاں ہمایوں کے ناقابل فہم مزاج اور محرکات کا سوال پھر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔بابر نے بیٹے کے جانے کو عمداً اس طرح لکھا ہے کہ گویا وہ معمولی ضابطے کی بات تھی اور اس کا سبب بدخشانیوں کا وطن کی یاد سے مضطرب ہونا تھا۔ بلکہ بدخشاں کی بائے زیادہ تر کابل بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔تاہم خلاف توقع ان خزانوں کے قفل تڑوانے سے جو شاہی ضرورتوں کے لئے اس نے مقفل کر دیئے تھے، اسے بہت ناگواری ہوئی۔ یہ کام بدخشانی بطور خود نہ کر سکتے تھے۔اور نہ ہمایوں کے کہے بغیر دہلی کے حکام اس کی اجازت دیتے۔پھر اس شہزادے کو اپنی معرکہ آرائی کا صلہ بھی کچھ کم نہیں ملا تھا۔حصار کے اقطاع کے علاوہ دہلی آگرے کی بے حساب دولت جس میں وہ نور ہیرا شامل تھا، اسے مرحمت کی گئی اور بوقت رخصت الور کا خزانہ دیا گیا تھا۔غرض ممکن ہے کہ اس کا یہ فعل خواجہ کلاں کے شعر سے بڑھ کر (جو اس نے کابل جاتے وقت قیام ہندوستان کی مذمت میں دہلی کی فصیل پر لکھا تھا) ہندوستان میں رہنے کی مخالفت کا ثبوت ہوا اور امرا کی کوئی خاص ٹولی ہمایوں کو بھی اسی رائے پر

لگا لائی ہو کہ ہندوستان کو لوٹنے کے بعد چھوڑ دینا چاہئے؟ مقفل خزانے کھول کر ہمایوں نے غالباً صرف تھوڑی سی منتخب چیزیں لے لی تھیں اور دو مہینے ہی گزرے تھے کہ بابر نے اسے بدخشاں میں خلعت خاص اور گھوڑا بھیجا اور گویا قفل شکنی کے قضیہ نامرضیہ کو بھلا دیا۔

''ایک رات جوسہ کے قریب پہاڑ کے ٹیکرے پر ایک چشمے کے کنارے قیام ہوا۔ شامیانے نصب کرا کے یہاں گناہ معجون کا شغل کیا (واضح رہے کہ ترک مے نوشی کے وقت دوسری مسکرات سے بابر نے توبہ نہیں کی تھی) اس چشمے سے فوج کے گزرتے وقت تردی بیگ نے اس کی بہت تعریف کی تھی (تردی بیگ کو جو پہلے فقیر ہو گیا اور اب بابر کا ہم پیالہ تھا، اس کے حسب خواہش پہاڑی قلعہ جاگیر میں دیا گیا تھا) یہ چشمہ حقیقت میں بہت خوب تھا۔ ہندوستان میں نہریں نہیں بنائی جاتیں۔ دیہاتی لوگ چشموں ہی پر پانی لینے جاتے ہیں یہاں کے چشمے بھی ہمارے ملک کے چشموں کی طرح جوش مار کر نہیں بہتے بلکہ ان میں سے پانی رستا رہتا ہے۔ تاہم یہ چشمہ اچھا ''نیم آسیا'' پانی دے رہا تھا اور وہ بہہ کر دامن کوہ کے مرغزار تک پہنچتا تھا۔ اس کی خوبصورتی میں بھی شبہ نہیں۔ میں نے حکم دیا کہ اس کے گرد ہشت پہلو حوض بنا دیا جائے۔ جس وقت ہم چشمے پر بیٹھے معجون کے سرور کا مزا لے رہے تھے، تردی بیگ بار بار اس کی تعریف کرتا اور کہتا کہ میں نے اس کو یادگار بنا دیا ہے۔ اس کا کوئی مناسب نام بھی تجویز کرنا چاہئے۔ عبداللہ نے تنگ آ کر کہا ''اچھا تو اس کا نام'' شاہی چشمہ پسندیدہ تردی بیگ'' رکھ لو اس پر خوف قہقہے اڑے...... تردی بیگ فقیر ہو

گیا تھا، میں نے طریق درویشی کی بجائے اسے سپہ گری کے راستے پر ڈالا۔ سالہا سال تک وہ میری خدمت میں رہا مگر اب پھر اس کے سر میں فقیری کی ہوا اور مجھ سے جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے اجازت دے دی اور کامران کے لئے تین لاکھ دے کر اسے (قندھار) روانہ کیا۔

اس عطے کے ساتھ تردی بیگ کے ہاتھ بابر نے اپنے دور افتادہ رفیقوں کو ایک قطعہ بھی لکھ بھیجا۔ اسے خاص توجہ اور خوبی سے اس نے نظم کیا تھا۔ (ترجمہ):

''ان رفیقوں کو، جنہوں نے ہوائے کابل کی یاد میں ہندوستان کی مشقت و صعوبت چھوڑ کر عاجلانہ وطن کی راہ لی، وہاں کی خوشیاں اور عزیزوں کی صحبت مبارک ہو۔

مگر ہم جو یہاں رہ گئے، تمام زحمتوں کے باوجود، شکر ہے کہ ہم بھی زندہ سلامت ہیں۔ ہمارے عیش و راحت کے دن گزر گئے، تمہارے ایام زحمت!''

اگلی برسات میں دوسرے سپہ سالار و حکام نے بھی اپنی جاگیروں پر جانے کی رخصت مانگی اور غالباً امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے صرف پادشاہ اور خلیفہ رہ گئے جو ایک حد تک خواجہ کلاں کا قائم مقام ہو گیا تھا۔ لیکن برسات ختم ہوتے ہی پھر لشکر جمع کیا گیا کہ مفتوحہ علاقوں کی حدود کو معین اور محفوظ کیا جائے۔ اس لشکر کو خود بابر 27۔ جنوری 1527ء (ربیع الثانی 934ھ) کو لے کر پہلے جنوب میں چندیری کی طرف چلا جو سرحد راجستھان کے پہاڑوں کا مشہور قلعہ تھا۔ یہ ابراہیم لودھی کے قبضے میں رہا اور جنوبی سرحد کی کلید سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے راجپوت رئیسوں کو بابر

سبق دینا چاہتا تھا جو رانا سانگا کے مرنے پر حسب عادت باہم جنگ و جدال میں مصروف تھے۔ چندیری کو حوالے کر دینے کا مطالبہ وہاں والوں نے مسترد کر دیا۔

بابر لکھتا ہے کہ ''چندیری اچھے شاداب علاقے میں واقع ہے اور اس کے قریب آب رواں موجود ہے۔ پہاڑی کے اوپر اس قلعے کے اندر پہاڑ تراش کر ذخیرہ آب تیار کیا گیا ہے۔ یہاں امیر غریب سبھی کے مکان پتھر کے بنے ہیں۔ امرا کے مکانوں میں باریک نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ چھتوں پر بھی مٹی کی کھپریل کی بجائے پتھر کی پٹیاں لگائی جاتی ہیں۔ بالا حصار کے سامنے پانی کو تین حوضوں میں جمع کر لیا جاتا ہے یہاں پانی بہت اچھا اور میٹھا مشہور ہے۔ ندی کے پیٹے میں بھی پتھر کی سلیں کی سلیں پٹی پڑی ہیں جس سے تعمیر کا بخوبی کام لے سکتے ہیں۔ آگرے سے چندیری کا فاصلہ سڑک نوے کوس جنوب میں اور قطب تارے کی بلندی یہاں 25 درجے ہے...... چین تیمور کو چھ سات ہزار آدمی دے کے آگے روانہ کر دیا تھا ...... ہم نے کجوا میں پڑاؤ کیا اور ناظروں کو بیل داروں کے ہمراہ روانہ کیا کہ راستہ ہموار کریں اور جنگ جھاڑی صاف کر دیں۔ تاکہ چھکڑے اور بڑی توپیں آسانی سے گزر سکیں۔ کیونکہ کجوا سے چندیری تک جھاڑیوں پھیلی ہوئی ہیں......

پہاڑ کی چوٹی پر چندیری کا قلعہ اور نیچے شہر بستا ہے۔ شہر کے گرد بھی شاہراہ کے اوپر فصیل بنی ہوئی ہے۔ اسی سڑک پر میں نے خود جا کر جگہ جگہ اپنے سردار اور ایچی معین کئے۔ استاد رومی نے بیرونی فصیل کے باہر اپنی بڑی توپ ''غازی'' کی جگہ تجویز کی مگر یہ اونچی نہ تھی۔ بیل داروں نے اس کے لئے چبوتری بنادی۔ پھرت مام

سرداروں کو حکم دیا گیا کہ سیڑھیاں اور ڈھالیں لے کر قلعے پر حملہ کے لئے تیار ہو جائیں۔

اسی روز میدان ہی میں خلیفہ میرے پاس خط لے کر آیا جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ہماری مشرقی فوجیں بغیر تیاری کے حریف سے جا بھڑیں۔ شکست کھائی اور لکھنؤ چھوڑ کر قنوج میں ہٹ آئیں۔ خلیفہ کو بہت پریشان دیکھ کر میں نے اس کی تشفی کی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ جب تک چندیری کا معرکہ درپیش ہے تم یہ خبر منہ سے نہ نکالنا۔ کل ہم حملہ کریں گے اور اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے؟

چندیری والوں نے ساری طاقت بالا حصار میں جمع کر رکھی تھی اور شہر کی بیرونی فصیل پر صرف دو دو چار چار پہرہ دار مقرر کئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ہمارے آدمی ہر طرف سے اس فصیل پر چڑھ گئے۔ معدودے چند پہرہ داروں نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ بھاگ کر بالا حصار میں چلے گئے۔

علی الصباح میں نے ہر شخص کو اپنی جگہ تیار رہنے اور جس وقت میں علم اور نقارے کے ساتھ برآمد ہوں حملہ کر دینے کا حکم دیا۔ لڑائی کا زور بندھنے سے پہلے میں علم اور نقارچیوں کا تماشا دیکھنے گیا۔ اس گولہ باری کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ توپ کی بیٹھک نیچ اور فصیل پتھر کی نہایت مضبوط تھی۔ اس بالا حصار سے ایک دہری دیوار نیچے کے حوضوں تک بنی ہوئی تھی اور حملے کے لئے یہی جگہ مناسب تھی۔ یہ کام قلب کی فوج رکاب کے تفویض ہوا تھا۔ ہماری یورش ہر سمت میں ہوئی لیکن سب سے بڑی

جمعیت نے اسی مقام پر دھاوا کیا۔ ہندوؤں نے ہمارے بہادروں پر پتھر پھینکے۔ جلتی آگ پھینکی لیکن وہ نہ رکے اور آخر جوق کا سردار شاہم بیگ اس جگہ پہنچ گیا جہاں دہری دیوار بالا حصار کی فصیل سے ملی ہوئی تھی۔ بہت سے اور سپاہی ہجوم کر کے یہیں آ گئے اور دہری دیوار جو راستے کے پشتے کا کام دیتی تھی، اسے چھین لیا۔

بالا حصار کے اندر ہندوؤں نے اتنی مزاحمت بھی نہ کی جتنی اس پشتے اور فصیل پر کی تھی بلکہ جلدی سے اندر بھاگے اور ذرا دیر میں بالکل ننگے ہو کر نکلے اور پھر لڑنا شروع کیا۔ ہمارے کئی سپاہی مارے گئے اور بہت سے فصیل چھوڑ کر بھاگے۔ ہندوؤں کے ایک دم اندر بھاگنے کا سبب یہ تھا کہ وہ سمجھے قلعہ نہیں بچ سکتا، لہذا پہلے انہوں نے اپنی بیویوں اور پاتروں کو جا کر مارا پھر ننگے ہو کے لڑنے مرنے کے لئے باہر نکل آئے تھے۔ ہمارے سپاہیوں نے اپنے اپنے مقام سے دوبارہ حملہ کیا اور ہندوؤں کو فصیل پر سے مار ہٹایا۔ تب ان میں سے دو تین سو ہندو (راجہ) میدنی راؤ کے محل میں گھسے اور وہاں اس طور پر اپنے آپ کو ہلاک کیا کہ ایک شخص تلوار لے کر کھڑا ہوا اور دوسروں نے خوشی خوشی اپنی گردنیں اس کے آگے کاٹنے کو جھکا دیں۔ اس طرح ان کی بڑی تعداد واصل جہنم ہوئی۔

عنایت الٰہی سے یہ مشہور قلعہ، دو تین گھڑی میں کسی سخت جنگ اور شاہی نوبت و علم آگے بڑھائے بغیر فتح ہو گیا۔ مقتول ہندوؤں کے سروں کا کلہ منار چندیری کے شمال مغرب میں ایک ٹیکرے پر بنوانے کا حکم دیا گیا۔

اس طرح کسی خاص تعجب کا اظہار کئے بغیر بابر نے راجپوتوں کی مجنونانہ

بہادری کا ذکر ختم کیا ہے آئندہ ان سے بھگتنے کی اور کوئی نوبت اسے نہیں آئی۔

"گنگا پر ایک پل"

جاں نثار خلیفہ کی پریشانی بے جا نہ تھی۔ ہر چند اس کا تقرر ابھی باضابطہ نہیں ہوا تھا، تاہم بننے والی سلطنت کا وہ گویا وزیر اعظم تھا...... اگر چہ یہ سلطنت بھی ہنوز اس کے آقا کے خانہ دماغ ہی میں تیار ہو رہی تھی...... بہر حال اس کی چشم تصور کے سامنے ایک وسیع کشور کا عجیب منظر پھیلا ہوا تھا جس میں بھانت بھانت کے لوگ اور گروہ، کچھ مطیع و فرمان بردار، کچھ باغی اور لڑائی پر تیار، آزادی کے پکے یا بادل ناخواستہ محکوم، الگ الگ بولیاں بولنے والے بھرے تھے اور ان سب کو کسی مرکز پر جمع رکھنے والی پادشاہ کی مضبوط قوت ارادی کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ ان میں سب سے سرکش مشرقی کے افغان رئیس تھے جو شوریدہ مزاجوں کی فوج لے کر قنوج پر چڑھ آئے تھے۔ قنوج سے سردار فوج کے لئے آگرہ صرف دو دن کی مسافت پر تھا، حالانکہ پادشاہ وہاں سے سات دن کی منزل پر دور ایک مفتوحہ قلعے کے وسائل آب رسانی دیکھنے میں منہمک تھا۔

تاہم شیر نے چندیری میں زیادہ تساہل نہیں کیا بلکہ آگرے کی بجائے سیدھا، جمنا پار اودھ اور لکھنؤ کی طرف جہاں بغاوت کا زور تھا، پلٹ پڑا۔ لشکر شاہی کی آمد سن کر باغی لشکر جلدی سے گنگا کے پار اتر گئے اور اس عظیم دریا پر مقابلہ کرنے کی تیاریاں کیں جسے کشتیوں کے سوا عبور کرنا، ان کی دانست میں ممکن نہ تھا۔ انہیں اپنے

ہاتھیوں پر اور اپنے سرغنہ بایزید اور معروف پر پورا بھروسہ تھا کہ شاہی فوج کھلی کشتیوں میں دریا سے اتری تو گھاٹ پر مار مار کے اسے پسپا کر دیں گے۔ ادھر بابر اور اس کے مہندس سمجھتے تھے کہ گنگا پر بھی کشتیوں کا پل باندھا جا سکتا ہے۔ استاد علی رومی کو یقین تھا کہ اپنی منتخب توپوں سے میں اس کام میں مدد کر سکتا ہوں:۔

''جمعرات کو ہم قنوج کے پاس سے گزرے اور گنگا کے مغربی کنارے پر خیمہ زن ہوئے۔ طلایہ کے سواروں نے اوپر، نیچے گشت لگا کے کشتیاں پکڑیں اور چھوٹی بڑی تیس یا چالیس لے آئے۔ میر محمد جالہ بان (تختہ پل تیار کرنے والا) کو مناسب جگہ جہاں پل باندھا جائے اور ضروری مسالا جمع کرنے کے لئے بھیجا۔ وہ پڑاؤ سے کوس بھر نیچے جگہ دیکھ کر آیا۔ چند مستعد ناظروں کو حکم ہوا کہ کام شروع کرائیں۔ استاد علی نے اسی جگہ کے قریب اپنی توپ نصب کی اور خوب پتھر کے گولے برسائے (اس کا حریف) مصطفیٰ ترک بھی ارابوں پر اپنی توپیں لایا اور ذرا آگے ایک ٹاپو پر انہیں جما کے گولہ باری کرتا رہا۔ پل کے سرے سے اوپر کے رخ ایک دمدمے سے تفنگچی برابر گولیاں چلاتے رہے۔

ملک قاسم مغل اور تھوڑے آدمی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار ہوئے اور کچھ دیر خوب لڑے...... حتیٰ کہ قاسم کی جرات بڑھی کہ وہ دشمن کے پڑاؤ کے نزدیک پہنچا اور تیر باری کی۔ اس پر پڑاؤ سے ایک جمعیت ہاتھی لے کر نکلی اور قاسم کو بھاگنا پڑا۔ وہ کشتی میں چڑھ گیا تھا لیکن ہاتھی نے آ کر کشتی کو ڈبو دیا۔ اس معرکے میں قاسم مارا گیا۔

''پل بندھنے کے دنوں میں استاد علی پتھر کے گولے خوب چلاتا رہا۔ پہلے دن

آٹھ، دوسرے دن سولہ چلائے اور پھر تین چار دن اسی رفتار سے چلاتا رہا۔ یہ گولے اس بڑی توپ سے داغے گئے جس سے رانا سانگا کافر کی لڑائی میں کام لیا اور ''غازی'' نام رکھا گیا تھا۔ استاد نے ایک اور اس سے بھی بڑی توپ بنائی تھی۔ مگر وہ پہلا گولہ داغنے ہی میں پھٹ گئی۔ ہمارے تفنگچیوں نے مل کر جو باڑیں ماریں ان سے دشمن کے بہت سے سپاہی بلکہ بھیر کے بھاگتے ہوئے مزدور اور سرپٹ دوڑتے گھوڑے مارے گئے۔

''افغان پل بندھنے میں تاخیر پر تمسخرہ کرتے تھے۔ لیکن وہ چارشنبہ کو تیار ہو گیا اور میں اس کا سرا دیکھنے گیا۔ جمعرات کو مکمل ہوتے ہی لاہوریوں اور پیادوں کی ایک جمعیت شفقت کرکے پل سے دوسری طرف اتر گئی ان کی تعداد کم تھی اور لڑائی بھی زیادہ نہیں ہوئی لیکن جمعے کو قلب اور میمنے میسرے کے بہت سے سپاہی پار ہو گئے اور ادھر سے افغان بھی ہتھیار باندھ کر ہاتھیوں سمیت مقابلے میں نکلے۔ عشا کے بعد تک فریقین میں لڑائی ہوتی رہی۔ مگر اس رات میں نے حکم دیا کہ جو لوگ پار اترے تھے سب واپس اپنے پڑاو پر آ جائیں۔''

بابر اعتراف کرتا ہے کہ ہفتے کی سحر فوج کو واپس لانے کا عجیب سا خیال اس لئے آیا تھا کہ ٹھیک ایک سال قبل وہ نوروز سہ شنبہ کے دن سیکری سے فوج لے کر چلا اور چار دن بعد رانا سانگا سے لڑ کر غالب آیا تھا۔ اب گنگا پر بھی پل اترنے کے لئے چلا تو نوروز تھا اور اس کے دل میں آئی کہ اور چار دن ٹھیر کر ہفتے ہی کے دن افغانوں پر حملہ کرنا سازگار ہو گا۔

"(اگلے) ہفتے لکھنؤ گیا۔ گومتی کے پار منزل ہوئی۔ اس ندی میں جا کر غسل کیا۔ معلوم نہیں پانی میرے کان میں چلا گیا یا سردی کا اثر تھا کہ سیدھا کان گنگ ہو گیا اور کئی دن تکلیف رہی۔ اودھ سے ایک دو کوچ باقی رہے تھے کہ چین تیمور کا ہرکارا پیام لایا کہ دشمن سردی ندی کے پار ڈٹا ہوا ہے۔ بادشاہ کمک بھجوائیں۔ میں نے قراچہ کے ماتحت کوئی ایک ہزار شمشیر زن روانہ کیے...... اس کے پہنچنے پر جب ان فوجوں نے دی پار کی تو ادھر صرف پچاس سوار اور تین چار ہاتھی تھے جو فورا فرار ہوئے۔ چند کے سر کاٹ کر بھیجے گئے...... بایزید کا پیچھا گیا مگر وہ ایک جنگل میں گھس کے بچ گیا۔ چین تیمور آدمی رات میں کوئی چالیس کوس تک پیچھا کرتا رہا اور اس کے اہل وعیال کے پڑاؤ تک گیا لیکن وہ بھاگ چکے تھے۔ تاہم اس نے ہر طرف سوار دوڑائے اور محمد باقی وغیرہ دشمنوں کو اس طرح کھدیڑتے پھرے جیسے بھیڑیا بکری کو۔ تا آنکہ بایزید کے بال بچے مل گئے اور گرفتار کر لئے گئے۔

میں انتظامات درست کرنے کی غرض سے اودھ کے قریب اسی مقام پر چند روز ٹھیرا۔ یہاں والوں نے سات آٹھ کوس اوپر کے علاقے میں بتایا کہ شکار خوب ہوتا ہے۔ میر محمد جالہ بان کو بھیجا گیا کہ سرداور گھاگرا ندیوں کے گھاٹ دیکھ کر آئے جمعرات کو میں شکار کے ارادے سے سوار ہوا۔"

یہاں پھر بابر کے روزنامچے سے پانچ ماہ سے زیادہ کے حالات گم ہو گئے ہیں لیکن آئندہ اور آخری ہفتوں کی سرگزشت سے واضح ہوتا ہے کہ مشرقی ندیوں پر مقابلہ کرنے والے مغلوب کر لئے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے امید تھی کہ یہ آخری

معرکہ آرائی ہو گی۔ اس سال 1528ء کی گرمی (934ھ) میں اس کی سلطنت بد خشاں کے پہاڑوں سے گنگا گھا گرا کے سنگم تک پھیل گئی تھی جو سڑک ایک ہزار میل (پانچ سو کوس) کی مسافت تھی۔ لہذا اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنی حکومت کے طور پر طریق کی نسبت وضاحت کر دے کہ وہ آئندہ کیا ہو گا؟

☆............☆............☆

باب ہشتم :: مغل اعظم کی سلطنت

گلبدن بیگم کا سفر آگرہ

جنگی مقابلوں کے ختم اور برسات کے بعد "پادشاہ ہندوستان" نے اپنے اہل و عیال کو کابل سے بلوایا۔ دو سن رسیدہ خالائیں جو سمرقند کی خانماں خرابی میں ساتھ تھیں، پہلے ہی نومفتوحہ ملک میں آ چکی تھیں۔ بابر نے چنگیزی خاندان کے جملہ افراد کو دوبارہ آگرہ میں آنے کی دعوت دی تھی، وہ اسی بلاوے پر آئی تھیں۔ لیکن کابل سے تمام اہل و عیال کو بلوانے کے معنی یہ تھے کہ بابر کابل سے تعلقات قطع کر رہا ہے۔ بڑے بیٹے تو خواجہ کلاں کے مشورے کے مطابق اپنی اپنی ولایتوں میں مقیم رہے۔ ورنہ محل سرا کے باقی سب افراد نے رخت سفر باندھا اور نوکروں اور پاسبانوں کی معیت میں خیبر کے راستے پر چل پڑے۔

ہر ایک آرزو تھی کہ پادشاہ کے لئے کوئی تحفہ لے کر حاضر ہو اور ہر ایک مشتاق تھا کہ باریابی کے وقت کیا پاتا ہے؟ گلبدن بیگم چھ برس کی تھی، یعنی قریب قریب اتنی بڑی جتنا کہ خود بابر پہلی دفعہ سمرقند جانے کے وقت تھا۔ وہ اپنی اصلی ماں کی بجائے بڑی بیگم ماہم کے ساتھ روانہ ہوئی اور خانزادہ بیگم، بی بی مارکہ وغیرہ دوسری بیگمات کچھ روز بعد چلیں۔ ممکن ہے کہ اس علیحدگی کا سبب اہل حرم کا اندرخانہ مناقشہ ہو۔ بہر حال ننھی گلبدن کے دل میں تو سب سے زیادہ لو یہ لگی تھی کہ باپ سے

آگرے میں کب ملنا ہوتا ہے۔ لکھتی ہے:

''یہ حقیر پر تقصیر ماہم بیگم کے ہمراہ والد ماجد کے حضور میں ادائے آداب کے لئے گئی۔ جب ہم کول کے چڑیا باغ میں پہنچے تو دو پالکیاں اور تین سوار ملے جو والد نے ماہم کے لئے بھیجے تھے چنانچہ وہ فورا کول سے آگرے روانہ ہوئیں۔ اعلیٰ حضرت خود انہیں لینے باغ مذکورہ تک آنا چاہتے تھے۔ مغرب کے وقت کسی نے آ کر پادشاہ کو اطلاع دی کہ ملکہ راستے پر دو کوس دور رہ گئی ہیں۔ یہ سن کر والد نے گھوڑا لانے کا بھی انتظار نہیں کیا بلکہ پیدل چل پڑے اور اس مکان کے قریب ماہم سے ملے جو بعد میں میری ماں کو دیا گیا۔ بیگم پالکی سے اترنا چاہتی تھیں۔ مگر پادشاہ نے پالکی ٹھیرنے نہ دی اور اسی طرح خود بھی خدم کے ساتھ چلتے ہوئے انہیں اپنے محل تک لائے۔

ماہم نے پادشاہ سے ملاقات کے وقت حکم دیا کہ مجھے اگلے دن صبح کو آداب بجا لانے کی غرض سے حضور میں لایا جائے۔ اس روز ہمارے جلو میں پادشاہی نو سوار، نو کوتل گھوڑے پالکیوں کے گرد، اور بیگم کے تقریباً سو ملازمین اعلیٰ درجے کے گھوڑوں پر سوار لباس فاخرہ پہنے ہوئے تھے۔ قابل دید نظارہ تھا۔ والد کے وزیر خلیفہ اپنی بیوی سلطانم کے ساتھ نئے حمام تک پیشوائی کو آئے۔ میری بڑی دوا نے باغ خورد پر مجھے پالکی سے اتارا اور مسند بچھا کر اس پر مجھے بٹھا دیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ خلیفہ آئیں تو میں ان کی کھڑے ہو کر تعظیم دوں اور گلے ملوں۔ چنانچہ وہ آئے تو میں نے اٹھ کر معانقہ کیا۔ پھر ان کی بیوی سلطانم آئیں۔ مجھے معلوم نہ تھا

کہ ان سے کس طرح ملا جائے۔ میں دوبارہ اٹھنا چاہتی تھی کہ خلیفہ نے منع کیا اور کہا یہ تمہاری خادمہ رہ چکی ہیں، ان کی تعظیم کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی آپ کے والد کا احسان ہے کہ اپنے قدیم خادم کی عزت بڑھائی اور آپ سے میری تعظیم کرادی اور مجھے ملنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل کرنا ہمارا فرض ہے۔

''خلیفہ نے 6 ہزار چاندی کے سکے اور 5 گھوڑے خود نذر کئے اور سلطانم نے تین ہزار نقد اور 3 گھوڑے پیش کئے پھر اس نے کہا غریبانہ ماحضر تیار ہے اگر آپ نوش فرمائیں تو اپنے خادموں کو عزت بڑھائیں گی، میں نے قبول کیا۔ وہ مجھے بہت اچھے مکان میں لے گئے۔ جہاں شہ نشین پر گجراتی منقش کا سرخ شامیانہ اور منقش بلیوں کے سہارے قنات بندھی تھی۔ یہاں (خلیفہ کی حویلی میں) دستر خوان بچھایا گیا اور طرح طرح کے کباب قورمے اور نان وشربت اور فواکہ چنے گئے۔ چاشت کا یہ کھانا کھا کر میں پھر پالکی میں سوار ہوئی آداب بجا لانے باوا حضور کے سامنے گئی۔ میں نے ان کے پاؤں چومے۔ انہوں نے تھوڑی دیر مجھے گود میں بٹھایا اور بہت سی باتیں پوچھتے رہے۔ اس حقیر کنیز کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتی تھی......''

گلبدن اس روز بھاری بھرکم ''ناشتے'' کے بعد جس باپ سے ملاقی ہوئی وہ اس شخص سے مختلف تھا جو چار برس پہلے کابل سے ہندوستان روانہ ہوا تھا۔ ماہم نے

اپنے سفر میں پانچ مہینے لگا دیئے تھے۔ جس کا شاید یہ سبب ہو کہ وہ ہمایوں کے بغیر ہندوستان جانے سے رکتی تھی۔ بہر حال ملکہ اور اس کی سوتیلی بیٹی کے اسی زمانہ سفر (دسمبر 1528ء تا جون 1529ء) میں نئے مقبوضات کا بابر نے انتظام درست کیا اور ادھر اپنے گھر کا بندوبست کرنے میں برابر مصروف رہا۔ ان آخری دو سال میں اس نے کوئی نئی مہم اور فوج کشی نہیں کی اگرچہ ان حوصلہ مندیوں کا شوق ابھی تک معدوم نہ ہوا تھا۔ مگر اتنے بڑے ملک اور کثیر رعایا کے زیر نگیں آنے کے بعد لامحالہ اسے زیادہ وقت ان کے معاملات کے انصرام میں دینا پڑتا تھا اور ادھر یہ مسئلہ حل کرنا تھا کہ نئی سلطنت میں اس کی اولاد کا قیام کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ضروری تھا کہ بیٹوں سے جواب بڑے ہوتے جاتے تھے، زیادہ قریبی رابطہ قائم کیا جائے۔ وقت کی اس ضرورت کی بناء پر اس کا پہلا اقدام یہ تھا کہ ہمایوں کو ایک نصیحت آمیز خط بدخشاں بھیجا۔ تقریب یہ ہوئی کہ ہمایوں کے ہاں لڑکا، جس کا نام الامان رکھا گیا تھا، پیدا ہوا تھا۔ مضمون یہ ہے:۔

''ہمایوں کے نام، جسے دیکھنے کا آرزومند ہوں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو بیٹا عنایت کیا۔ خدائے بزرگ و برتر ہمیشہ تمہیں ایسی ہی خوشیاں دکھائے۔ تم نے اس کا نام ''الامان'' رکھا ہے۔ خدا مبارک و مسعود فرمائے۔ لیکن تم جو مسند آرائے حکومت ہو، تم کو جاننا چاہئے کہ عوام اسے ''المن'' (بہ معنی حملہ گر) یا ''ایلمان'' (پناہ یافتہ) تلفظ کرتے ہیں۔ خدائے قدیر زمانہ دراز تک اسے اپنی امان

میں رکھے اور اقبال مند کرے۔

تمہارے لئے بڑ کام کرنے کا وقت آتا ہے۔ اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کامران کے ساتھ مہر و مروت سے کام کرنا نہ بھولنا۔ تم کو معلوم ہے کہ ہر چیز میں اس کے پانچ حصے کے مقابلے میں تم کو چھ حصے دیئے گئے۔ آئندہ ضبط نفس کو ہاتھ سے نہ دینا اور اس سے خوش دلی کی مفاہمت ہمیشہ قائم رکھنا۔ ذمہ داری کا بوجھ بڑے بیٹے پر ہی ہوا کرتا ہے۔

مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔ گزشتہ چند سال میں تمہارے بہت کم خط آئے اور آدمی ایک بھی نہ آیا۔ میں نے جسے تمہارے پاس بھیجا تھا، اسے پلٹ کر آنے میں ایک سال لگ گیا۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے؟ تم خطوں میں اپنے عزیزوں سے جدائی کا شکوہ لکھتے ہو۔ یہ شکوہ بے جا ہے۔ حضرت سعدی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ''بند و سلاسل میں بھی اپنے حال پر قانع رہ۔ جریدہ سفر میں بھی اپنی منزل خود تلاش کر۔''

بادشاہوں کو پابند رہ کر، تنہا کام کرنا ہوتا ہے۔ انہیں تنہائی کی شکایت نہ کرنی چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ تم نے میرے حکم کی تعمیل میں خط لکھ دیا۔ مگر اسے دوبارہ پڑھا بھی تھا؟ اگر پڑھتے تو مطلب نہ سمجھ سکتے۔ مجھے اس کا مطلب نکالنے میں کافی دردسری ہوئی۔ کیا تم نے نثر میں کوئی معما تیار کیا ہے۔ یقیناً ایسا نہ ہوگا۔ پھر ہجے، اگرچہ ماٹھری تو ہیں

مگر اچھے نہیں ہیں۔ غرض ابہام کی وجہ سے خط کا مطلب واضح نہیں ہوتا اور اس کا سبب مسجع لفاظی ہے۔ آئندہ الفاظ میں تکلف و تصنع سے پرہیز کرو۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف لکھنا چاہئے تمہیں لکھنے میں بھی زحمت نہ ہوگی اور پڑھنے والے کو بھی پریشانی نہ ہوگی۔

اب تم ایک کار اہم شروع کر رہے ہو۔ تجربہ کار سرداروں سے مشورہ کرو اور ان کی صلاح مانو۔ دن میں دو مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی اور امیروں کو مشاورۃ کے لئے بلایا کرو۔ ان کا آنا اتفاق پر منحصر نہ رکھو۔ جو مسئلہ زیر غور ہے اس کی ہر بات اور کارروائی کا تصفیہ کرنے میں پہلے ان لوگوں سے مشورہ لے لینا چاہئے۔ مکرر یہ کہ خواجہ کلاں مدت سے میرے خاندان کا ہمراز و رفیق ہے۔ تمہارے معاملے میں بھی اسے ہم راز رہنا چاہئے۔ خدا کے فضل سے تمہارے معاملات میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی۔ اور کچھ دن بعد تمہیں کامران کی غالباً ضرورت نہ رہے گی۔ اس صورت میں اسے میرے پاس آنے دینا۔

ایک اور بات یہ کہ تسخیر کابل کے بعد سے ہمیں فتوحات پر فتوحات نصب ہوئیں۔ اس لئے قبضہ کابل کو میں بہت مسعود یخال کرتا ہوں اسے اپنے خالصہ (ملک شاہی) میں داخل کرلیا ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی طمع نہ کرے۔

جب تک سپاہ پوری طرح تیار اور مجتمع نہ ہو جائے، کوئی فوج کشی نہ

کرنا۔ بیان شیخ کو زبانی بھی سمجھا دیا ہے وہ سب باتیں تم سے کہے گا
......اس سب کے بعد مکرر دعائے خیر اور اشتیاق دید تحریر کرتا ہوں۔
نوشتہ روز پنجشنبہ۔ اسی مضمون کے خط کامران اور خواجہ کلاں کو لکھے
اور روانہ کئے گئے ہیں۔''

بظاہر اس خط کا ہمایوں نے جواب نہیں بھیجا۔ وہ دل کی بات کم کسی کو بتاتا تھا اور اپنے مستقبل کی جستجو نجوم کی علامتوں میں کرتا تھا۔ حیدر میرزا جواب بڑا ہو گیا تھا، انہیں دنوں کاشغر سے آیا۔ لکھتا ہے کہ ہمایوں پر ایک ''مولانا'' کے برے اثرات بہت بڑھ گئے تھے اور وہ افیون کھانے لگا تھا۔ تاہم ''کار اہم'' کی ذمہ داری لینے میں اس نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ یعنی بدخشاں اور کابل کی فوجیں جمع کر کے ازبکوں کے خلاف بڑھا جو اس کی سرحدوں پر برابر فتنہ وفساد اٹھاتے رہتے تھے۔ اصل میں تقدیر کا چکر ان شمال مغربی اقطاع میں دوبارہ پھرتا نظر آتا تھا۔ خراسان میں شیبانی کے جانشین ازبک سردار عبید خاں کو ایرانی شاہ طہماسپ نے پسپا اور قتل کر دیا تھا۔ اور بابر، جس کا بیان ہے کہ عبید خاں کو جادوگروں نے گمراہ کیا، اسے ایک خدا ساز موقع سمجھا کہ بیٹا سمرقند لینے کی ایک اور کوشش کرے کیونکہ خود وہ ہندوستان چھوڑ کر یہ مہم نہ لے جا سکتا تھا۔

لیکن ہمایوں اور اس کا بھائی قوت وفراست کسی میں بھی باقی ماندہ سلاطین ازبک کے ہم پلہ نہ نکلے۔ ہمایوں نے سرحدی قلعہ حصار کو پھر جھپٹ لینے میں خاصی استادی دکھائی لیکن سمرقند کے قریب تر مقامات میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ احساس

ناکامی لئے ہوئے واپس چلا آیا۔ یہ بھی یقینی ہے کہ ماں کے خط نے جوتا کیداً آگرے بلا رہی تھی، اسے سوچ میں ڈال دیا ہو۔ پھر حسب عادت مہینوں گومگو میں رہ کر وہ بغیر اطلاع بدخشاں سے چل پڑا اور اپنے کم عمر بھائی ہندال کو بلا کر اپنا قائم مقام بنا دیا۔ بابر کو خبر بھی نہ کی تھی لیکن جب اس کو معلوم ہوا تو اس نے ہمایوں کے فیصلے کو بے تامل منسوخ کر دیا۔ خود ہمایوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ولی عہد سلطنت بدخشاں سے اسپ سوار ایک دن میں کابل پہنچ گیا جو فی الواقع بڑا کارنامہ تھا۔ کابل سے اس نے آگرے کی راہ لی۔

یہ سال، 1529ء بیرونی دنیا میں جس کی مغل درباروں کو ابھی خبر تک نہ تھی، کئی قابل ذکر واقعات کا حامل گزرا ہے۔ عثمان لی، سلطان سلیمان اعظم نے باربرداری کی گاڑیاں جلا دیں اور توپیں لے کر وی آنا کی شہر پناہ سے ہٹ گیا کہ اپنی توجہ مشرقی سمندروں کی طرف معطوف کرے کیونکہ اب وہاں پرتگیزی بیڑے دور دور تک گشت لگا رہے تھے اور البوکرک کی درخشاں بحرنوردی سے گوآ میں ان کا مضبوط گڑھ اور گنگا کے دہانے نیز چاٹ گام اور سیامی ساحل پر جگہ جگہ بحری چوکیاں بن گئی تھیں۔ لیکن گوآ کے فرنگی تاجروں کا ابھی تک صرف جنوبی ہند کی سلطنت وجیا نگر یا شاہان بنگالہ سے سابقہ پڑا تھا۔ البتہ ان کے سفیر و سوداگر (اکثر یہ دونوں کام ایک ہی جماعت انجام دیتی تھی) شاہ طہماسپ کے شائستہ دربار تک، کبھی مسجد کبود والے تبریز میں اور کبھی اصفہان میں رسائی حاصل کر رہے تھے۔ تبریز میں سن رسیدہ بہزاد ابھی تک نوجوان انجلیکو کی سی چابک دستی سے قلمی تصویریں بنا رہا تھا اور وہاں کے

بڑے کتب خانے کا منتظم تھا۔ سفیر سوداگروں کو ایران کی روز افزوں خوش حالی اور بیداری میں چڑھتے سورج کی حرارت محسوس ہوئی تھی۔ بخلاف اس کے شیبانی کی ساختہ سلطنت جو ازمنہ وسطی کی بدوی حکمرانی کی آخری یادگار تھی، مغربی یورپ سے دور پڑی تھی اور اس کا رابطہ تھا بھی تو یا اندرونی غیر متمدن اقوام سے اور یا ماسکو کے ایسے تاجروں سے جو دور دور گشت لگاتے ہوئے ادھر جا نکلتے تھے۔ عجیب واقعہ ہے کہ پہلا فرنگی جو ہندوستان کے مغل دربار میں وارد ہوا ایک ترک امیر البحر تھا کہ پرتگیزوں کو گوآ سے نکال باہر کرنے کے ارادے سے بیڑا لے کر چلا مگر طوفان نے اس کے جہازوں کو برباد کر دیا اور خود اسے ساحل ہند پر لا پھینکا۔ لیکن یہ واقعہ بھی بابر کے بعد اگلی نسل یعنی ہمایوں کے آخری عہد سے تعلق رکھتا ہے۔

جملہ سلاطین، خوانین، عمائد و امراء نذر لاتے ہیں

اس اثنا میں بابر نے بہ حیثیت بادشاہ اپنا پہلا دربار منعقد کیا۔ ان شتاب روا یام میں اس کا روزنامچہ کچھا اکھڑا اکھڑا سا ہو گیا ہے۔ اس جشن عام یا تماشا کرانے کی وجوہات کی وہ کوئی صراحت نہیں کرتا نہ یہ کہتا ہے کہ مہمانوں کو کس طرح دعوت دی گئی تھی۔ جشن ترک مغل نمونے کے مطابق اور بظاہر فتوحات کے اعلان کے نتیجے میں منعقد ہوا تھا جسے ہر طرف نشر کیا گیا تھا۔ اسی قسم کا سابقہ اعلان وہ صلائے عام تھی جو بابر نے آل چنگیز و تیمور کو آگرے آنے کی دی تھی۔ اپنے تیسرے فرزند عسکری کو بھی اس نے انہی دنوں بلوایا اور شمشیر و کمر، شاہانہ خلعت، توغ و علم وغیرہ سپہ سالاری

کے جملہ لوازم دے کر نوازا تھا۔ جشن منانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو گئی کہ بادشاہ کے پہلے پوتے کی ولادت کا باضابطہ اعلان کیا جائے۔

غرض جو سبب بھی ہو، یہ نمائش پادشاہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ کرائی گئی تھی اور اس سے قبل جہاں تک معلوم ہے۔ بابر نے ایسا دربار عام نہیں کیا تھا۔ ہندوستان میں آئندہ مغل سلاطین کے دربار میں جس شان سے منعقد ہوئے اس کے مقابلے میں آگرے کا بابری جشن بچوں کا کھیل ہوتا ہے۔ لیکن بابر اس نے نہایت لطف اندوز ہوا اور اسے بڑا عمدہ ہنگامہ بتاتا ہے:۔

"ہفتے کے روز باغ میں جشن ہوا۔ خس پوش بنگلے میں میری نشست تھی۔ دائیں جانب محترم علماء اور سمرقند سے آئے ہوئے دوسرے ملا اور حفاظ بیٹھے۔ اسی جانب کچھ فاصلے پر شامیانہ تان کر قزل باش سفیروں کو جگہ دی تھی۔ میرے قریب ہی عسکری، خواجہ کلاں، خلیفہ اور خواجہ عبید اللہ احراری کے ایک پوتے تھے۔ بائیں جانب ازبک سفیر اور (راجستھان و بنگالہ) کے ہندو (وکلا) تھے۔ دستر خوان بچھائے جانے سے پہلے تمام سلاطین، عمائد و امراء نے زر سرخ و سفید و سیاہ اور دیگر اجناس (پارچہ) نذر گزرانیں۔ میں نے زیر انداز بچھوا کر حکم دیا کہ یہ نذوران پر انبار کر دی جائیں۔ جس وقت نذریں گزارنی جا رہی تھی، سامنے دریا کنارے مست اونٹوں ہاتھیوں اور مینڈھوں کو لڑایا گیا اور پہلوانوں کی کشتیاں کرائی گئیں۔

(بہ تصحیح مترجم) کھانے سے فراغت کے بعد خواجہ کلاں کو تن زیب کا جامہ جس پر کارچوبی پھول تھے، عنایت کیا گیا۔ ازبک و ازغون سفیروں کو زربفت کے نیم

آستین دیئے۔ بڑے سفیروں کو ایک ایک مثقال سونا چاندی۔ علی ہذا دو بڑے خواجہ (مشائخ) کو زرونقرہ تول کر عطا کیا گیا...... معصومہ (بیٹی) اور ہندال آگرے میں نہ تھے، ان کے نوکروں کو خلعت اور سینہ بند مرحمت ہوئے۔ میر محمد جالہ بان نے گنگا کا پل باندھنے میں قابل تعریف کام کیا تھا، اسے اور دو بہادر تفنگچیوں کو ایک ایک خنجر دیا۔ استاد علی رومی کے فرزند اور رچیتہ سدھانے والے ولی کو بھی خنجر عنایت ہوئے۔

اندجان سے میرے ساتھ گھر بار تج کر دشت وصحرا چھاننے والے رفیقوں کو (جو فرغانہ چھوڑنے کے بعد کوہ سیاہ کی گھاٹیوں میں میرے ہمراہ پھرے) زری کام کے لباس اور دوسرے عطیات دیئے گئے۔

آش نوشی کے وقت ہی ہندوستانی بازی گروں اور نٹوں کو حکم ہوا کہ اپنے کرتب دکھائیں۔ یہاں کے نٹ ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ پہاڑوں کے پار ہماری ولایات میں انہیں کوئی نہیں جانتا۔ ان میں سے ایک تماشا یہ ہے کہ ایک حلقہ پیشانی پر، دو دو اپنے گھٹنوں، انگلیوں اور پاؤں کے انگوٹھی پر لگا کر وقت واحد میں انہیں گھماتے ہیں۔ ایک کرتب یہ ہے کہ (بہ تصحیح مترجم) مور چال چلتے وقت ایک ہاتھ میں زمین سے اٹھا لیتے ہیں اور اس میں اور ادھر پاؤں میں حلقے ڈال کر پھراتے ہیں۔ ہمارے ہاں دو نٹ ایک دوسرے کو پکڑ کر قلا کھاتے ہیں مگر یہاں والے تین تین مل کر کئی قلائیں لگاتے ہیں۔ ایک کرتب یہ ہے کہ ایک نٹ 6، 7 گز کا بانس پیٹ پر رکھ کر سیدھا بلند کرتا، دوسرا اس پر چڑھ کر اوپر کھیل تماشے دکھاتا ہے۔ ایک کرتب یہ ہے کہ ایک لڑکا نٹ کے سر پر ڑھتا ہے، نیچے والا اسے لئے لئے کرتب

دکھاتا ہے اور یہ لڑکا سر کے اوپر اچھل کود دکھاتا اور برابر اپنا توازن قائم رکھتا ہے۔ ذرا نہیں لڑکھڑاتا۔ کئی رنڈیاں بھی اس موقع پر آئیں اور اپنا ناچ دکھایا۔

مغرب کے قریب سونے چاندی اور مسی سکے کی بکھیر کرائی گئی۔ اس کے لوٹنے میں بڑا شور اور چھینا جھپٹی ہوئی، لطف آ گیا۔ مغرب اور عشا کے درمیان پانچ چھ معزز مہمانوں کو رات کی نوبت بجنے تک میں نے اپنے پاس بٹھایا پھر کشتی میں دریا کی سیر کی۔ دوسری صبح باغ ''ہشت بہشت'' میں آ گیا۔

''دوشنبہ، جب عسکری مسلح لشکر کے ساتھ سفر پر جانے کے لئے تیار ہوا تو رخصت ہونے حمام میں میرے پاس آیا اور مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔''

پادشاہ کے اس پہلے دربار میں بعض باتیں ضرور خلاف معمول نظر آئیں گے۔ بیرونی ممالک جن سے ابھی تک سفارتی تعلقات پوری طرح متعین نہیں ہوئے، ان کے سفیروں کی رسمی خاطر تواضع واجبی سی کی گئی۔ اسی طرح ہندوستان کے کسی رئیس، راجہ عطائے خلعت و اعزاز کا ذکر نہیں آتا۔ اس کے مقابلے میں پرانے رفیقوں کو بہت کچھ انعام و اکرام دیئے جاتے ہیں۔ وہ ان قبائلی سرداروں تک کو اس موقع پر نہیں بھولتا جنہوں نے پہلی مرتبہ کابل آتے وقت پہاڑوں سے گزرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ علیٰ ہذا، رئیس و راجہ کی بجائے جالہ چیتے کے شکاری، توپچی، تفنگچی مراحم خسروانہ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ یہ بات کہ اس کی زندگی اور بڑے بڑے کارنامے چند مردوں اور خواتین کی وفاداری سے ظہور میں آئے، بابر کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی اور نہ اپنی ابتدائی زندگی کے سوانح جو فرغانہ کے دیہات اور کھیڑوں

میں، پہاڑی چراگاہوں کے قبائلی لوگوں میں گزرے تھے اسے کبھی فراموش ہوئے کیونکہ اس وقت جاہ طلب طبقہ امرا کے افراد عموما اس کے چھپے ہوئے دشمن تھے۔ اس کی تزک میں بار بار یہ جملہ آتا ہے اور اسی سے گلبدن بیگم نے نقل کرنا سیکھا ہے کہ میرے آدمیوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ، امراء اور عوام (دونوں) تھے۔ اوائل سولہویں صدی کی دوسری خودنوشت سوانح میں تلاش کیجئے تو شاذونادر ہی یہ جملہ آپ کی نظر سے گزرے گا۔

آگرے کے جشن عام میں ''خواجگان'' یعنی بزرگان مشائخ کی جماعت محض تبرک نظر آتی ہے۔ سمرقند کے دنوں میں بارہا بابر کو ان کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ خواجہ کلاں جو دونوں بڑے بیٹوں کے مشیر کی خدمت انجام دیتا تھا، کابل سے بلایا گیا تھا۔ ایسے ارباب تدبر کے مقابلے میں دیکھنا تھا کہ آئندہ اس کے فرزندوں اور دربار آگرہ میں دینی ذہنیت والوں کا کتنا دخل رہ سکے گا۔

ہندوستان کی معاشرت میں ادنیٰ اور اعلیٰ کی گہری خلیج موجود تھی۔ دہلی کے لودھی سلاطین میں ہندو راجاؤں کا استبدادی مذاق آگیا تھا۔ اسلامی نہ سہی، ترکی نقطہ نظر سے ہندوؤں کی ذات پات کی تفریق انوکھی چیز تھی تاہم معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے اسے اہل حرفہ میں تقسیم کار کا ایک عجیب طریقہ سمجھ کر روا رکھا تھا۔ مجموعی طور پر ابراہیم کی جابرانہ حرص و آز، سکندری لودھی کے مذہبی تعصب اور رانا سانگا کی نخوت کے مقابل بابر کی رواداری اور مروت نہایت نمایاں تھیں۔ بایں ہمہ پہاڑ پار کا قلندر بادشاہ ابھی تک ایسے وسائل نہ رکھتا تھا کہ اپنی تخت گاہ کے زیر انداز سے آگے تک

اپنے اثرات کو وسیع و استوار کرے۔ ادھر وقت کا دھارا تیزی سے بہا جا رہا تھا۔

حکومت چلانے کے اقدامات

آگرے کے ''تماشے'' میں ایک گروہ کی غیر حاضری نمایاں تھی۔ چین تیمور، کوکلتاش، جنگ جنگ وغیرہ آزمودہ کار سپہ سالار جنہوں نے ہندوستان کی لڑائیاں جیتیں، انعام لینے کو حاضر نہ تھے۔ انہیں سندھ کے مبہم خطے کی تسخیر اور تنظیم کے لئے جنوب مغرب میں بھیجا گیا تھا جہاں دریائے سندھ کے کنارے ریگستان بن گئے ہیں اور بے سرے دیہاتیوں کو آئے دن بلوچیوں سے گتھم گتھا رہنا پڑتا تھا جو لڑائی کی سن گن پاتے ہی غول کے غول چھاپے مارنے آجاتے تھے۔ مذکورہ بالا سردار وہ لوگ تھے کہ پانچ سال پیشتر بابر کی طرف سے لاہور میں متعین رہے اور ملتان و سندھ کے اضلاع سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے تھے۔

ابھی تک مصروف پادشاہ کے پاس حکومت کرنے کا آلہ صرف یہ تھا کہ فوجی سرداروں کو جاگیردار بنا کر اضلاع میں بھیجا جاتا اور وہ اپنے لشکر سے سرکشوں کو قابو میں لا کر ایک قسم کا امن و انتظام قائم کرتے اور مال گزاری وغیرہ موصول کر لیا کرتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بادشاہی سپاہ ابھی تک میدان میں تھی اور غیر عسکری عمال کا بھی کوئی نہ کوئی فوجی عہدہ ہوتا تھا۔ خزانچی ولی ایک لشکر کا سالار بھی تھا اور بوڑھا کتاب دار عبداللہ کنواہہ کی جنگ میں لڑنے آیا تھا۔

اطمینان سے سوچنے کی فرصت ملتے ہی بابر نے حکم دیا کہ آگرے سے براہ

لاہور کابل تک کی سڑک ناپی جائے۔ ہندوستان کا یہ راستہ جس سے وہ آیا، ابھی تک یہاں کے قیام کے لئے ناگزیر زنجیر تھی اور اس کی سلامتی پر فاتح کی سلامتی کا انحصار تھا۔ سڑک کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی کیونکہ سب سے مقدم یہ تھا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر برج بنا کے ڈاک کے چھ گھوڑوں کی چوکیاں حفاظت کے لئے تیار کی جائیں۔ یہ چوکیاں جہاں بادشاہی خالصہ علاقے میں نہ تھیں، وہاں متعلقہ جاگیرداران کی تعمیر اور نگہداشت کے خرچ کے ذمے دار قرار دیئے گئے۔ ہر نئے کام کے سلسلے میں لازما دوسری ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ سڑک کے فاصلے اور برجوں یا میناروں کی بلندی ناپنے کی غرض سے مغل عمال کو مقررہ پیمانے مہیا کئے گئے جو ہندوستان میں کابل کے پیمانوں سے مختلف تھے۔ اس ''یوں ناپو'' کے نقشے میں فاصلے کی پیمائش کا حساب قدموں سے، قدموں کا بالشتوں سے، ان کا چار انگشتوں سے اور آخر میں ہر انگشت کا چھ دانوں سے مقرر کیا گیا۔ ہندوؤں کے اعداد جو لاکھوں کروڑوں سے چل کر مہا سنکھ تک جاتے تھے، اول اول مغلوں کی خاصی پریشانی کا باعث ہوئے جنہیں اپنے وطن میں سیدھے سادھے سینکڑے اور ہزار ہی تک کا حساب کرنا ہوتا تھا۔ ان کے زیورات عموماً چاندی پر فیروزہ، پکھراج اور قلیل تر یاقوت کے نگ جڑ کر بنائے جاتے تھے۔ ہندوستان اور راجستھان میں الماس، زمرد اور بڑے بڑے موتیوں کی آب و تاب دیکھ کر وہ کسی قدر متعجب ہوئے لیکن ابھی اس دولت کی زیادہ حرص ان میں نہ ہوئی تھی۔ ہندوستان کے قیمتی کپڑے تن زیب، زربفت وغیرہ بھی انہیں کارآمد کی بجائے نمائش زیادہ معلوم ہوئے البتہ ان

کی خواتین ان کی فریفتہ ہو گئیں۔

سب سے بڑی ضرورت مواصلات کا سلسلہ قائم کرنے کی تھی اور اس میں مغلوں نے مقامی انتظام کو ترقی دی۔ تیز رفتار سوار ڈاک چوکی کے گھوڑوں سے کام لیتے اور بابر کے متحرک دربار کو اس کے عمال سے باخبر رکھتے تھے۔۔ ڈاک کا اس نے خصا عامل مقرر کیا۔ جسے یباول کہیت تھے اور وہ اس کے تحریری احکام بہ عجلت ہر جگہ پہنچانے کا ذمہ دار تھا۔ ملک کے دوسرے آئین اور محکمے ابھی تک بد نظمی کی حالت میں تھے۔ وصول محاصل اور سکے کی بھی یہی حالت تھی اور زبان کا مسئلہ بھی کچھ کم ٹیڑھا نہ تھا۔ کیونکہ مغلوں میں مذہبی روایات کی عربی کے ساتھ ادبی اور مجلسی زبان فارسی اور زیادہ مانوس چغتائی ترکی تھی، اگرچہ اس کا اب رواج کم ہوتا جاتا تھا۔ ان معیاری السنہ کو ہندوستان میں پشتو، ہندوستانی اور راجپوت اور بنگالیوں کی زبانوں سے سابقہ پڑا اور پہاڑی اور میدانی علاقوں کی بہت سی بولیاں ملیں چونک فوجی چھاؤنیاں ابھی تک نظم و نسق کا بھی مرکز تھیں لہذا ان کے آس پاس وہ مخلوط مشترک بولی تیار ہونے لگی جس میں اہل عسکر فارسی اور ہندوستانی جملے ملے جلے بولتے تھے۔ اردو یا لشکر کی یہی نئی زبان شمال مغربی ہندوستان کی اردو بننے والی تھیں۔ (58) بابر کو جو کابل تک سب سے خود ہی باتیں کیا کرتا تھا، ہندوستان آ کر ترجمان ساتھ رکھنے پڑے۔ اسی طرح نئی نئی ہنگامی ضرورتوں کے واسطے اس نے مستعد اور کارواں اشخاص کا انتخاب کیا۔ چون کہ حکومت کا باقاعدہ نظام نہ تھا۔ اس نے ذمہ داری کا ایک وقتی سلسلہ بنالیا جیسے توپوں کا متعلق جملہ کام استاد علی قلی کی

نگرانی میں تھے، اسی طرح آگرے کی عمارات میں مزدوروں پر راج کاریگر مقرر کئے اگر چہ سرکاری تعمیر کا کام ابھی بڑے پیانے پر مشکل سے شروع ہوا تھا۔

محاصل کی وصولی میں اس کے جاگیردار سرداروں نے وہی قدیم طریقہ جو کاشتکار و زمین دار کے درمیان چلا آتا تھا، بجنسہ قبول کرلیا۔ کم سے کم اصول یہی تھا اور اس پر عمل ہر علاقے میں کمی بیشی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اناوہ کے مہدی خواجہ جیسے بڑے جاگیرداروں کو واقعتہً کیا مالیہ ادا کیا جاتا تھا، اس کا انحصار بارش، فصل، رعایا کی خوش حالی بدحالی اور پھر محصل کی مستعدی پر تھا۔ دور کے (دیسی) زمیندار جو اپنے دیہات کے مالک تھے، بادشاہی خزانے کو عموماً (پیداوار کا) عشر ادا کرتے تھے۔ مگر یہ بھی آگرے سے ان کے قریب یا بعید ہونے پر منحصر تھا۔ سرحدی رئیس، امیر، سالانہ خراج بھیجتے تھے۔ یہ اکثر قلیل زر نقد رسم پوری کرنے کے لئے ہوتا تھا، جیسا کہ یوسف زئی اور افریدی قبیلوں کے سردار جو خود چھاپے مارنے میں ماہر تھے۔ لہٰذا بابر کی تاختوں کو نہیں بھولے تھے۔ پنجاب کے خانہ جنگی کی وبا سے نجات نہیں ملی تھی اور ملک سندھ یا مشرق میں گنگا کے دوآبوں سے ابھی کوئی مالیہ وصول نہ ہوتا تھا۔

ڈرے ہوئے لوگوں میں امن و اطمینان قائم کرنے اور بہتری کی امیدیں دلانے کی غرض سے یا جیسا کہ خود لکھتا ہے کہ ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے بابر کو پہاڑی قلعوں سے دریا کے بیلوں تک مسلسل سفر کرنا پڑتا تھا اور لامحالہ فرماں روائی گھوڑے کے زین پر بیٹھ کر ہو رہی تھی۔ مقامی مالی نظامات کو بدستور رہنے دینے کی وجہ بھی غالباً یہ تھی کہ کسی تبدیلی سے نئی مشکلات پیدا ہو جاتیں لہذا نسبتاً کم تر خرابی کو

برداشت کرلیا۔ پھر جنوبی سرحد کی حفاظت کا مسئلہ بھی طے کرنا تھا جس کی صحیح حد بندی نہیں ہوئی تھی۔ بابر نے پہلے ادھر توجہ کی۔ رانا سانگا کے بیٹے بکرماجیت سے رنتھنبور کا بڑا قلعہ لے لیا اور عوض میں اسے زیادہ دور کا علاقہ (باج گزاری کے وعدے پر) عنایت کیا۔ اسی زمانے میں گوالیار کی دوبارہ سیر کی۔ یہ شہر اور قلعہ سرسبز دامن کوہ میں بلندی پر واقع اور اس کا بت خانہ مشہور تھا۔ جس میں چٹان تراش کر ہندو دیوتاؤں کی مورتیاں بنائی تھیں۔

لکھتا ہے کہ" پھلواری کے باغ سے سوار ہو کر ہم گوالیار کے مندر دیکھنے چلے۔ بالائی منزل میں پتھر کی کرسی ہی سے بتوں کو اوپر تک تراشا گیا ہے اور نیچے کے تہ خانوں میں چٹانیں تراش کر مورتیاں بنائی ہیں۔ یہاں کی سیر کر کے میں شمالی جانب بڑے باغ میں گیا جسے رحیم داد نے ہتیاپول (ہاتھی دروازے) کے باہر بنایا ہے۔ وہاں اس نے کھانا تیار کرایا تھا۔ اس دعوت میں عمدہ عمدہ کھانے چنے گئے تھے اسی کے ساتھ چار لاکھ کی مختلف اشیاء اور زرنقد (رحیم داد نے) نذر گزرانا۔

چارشنبہ کو ہم آبشار دیکھنے گئے۔ اسے گوالیار سے چھ کوس پر بتاتے ہیں لیکن مجھے سواری میں مشکل سے اتنا معلوم ہوا۔ ظہر کے بعد ہم آبشار پر پہنچ گئے۔ یہاں پہاڑ کی چٹانوں سے پانی بہہ کر ایک حوض میں آتا ہے۔ اتنے فاصلے پر جتنی گھوڑے کی چرائی کی رسی لمبی ہو۔ مقدار میں ایک پن چکی چلانے کے لائق۔ ہم نے آبشار کے اوپر بیٹھ کر معجون کھائی پھر ایک اور ٹیکرے پر جا کر گویوں کا گانا سنا۔ ہمراہیوں کو جنھوں نے پہلے نہ دیکھے تھے میں نے آبنوس کے درخت دکھائے ...... مغرب کی نماز

کے بعد ہم سوار ہو کر راستے میں ایک مقام پر دو گھڑی سوئے اور پھر دن کی پہلی نوبت کے وقت گوالیار کے بڑے باغ میں پہنچ گئے۔''

شیر ابھی تک وقت سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی رات چھت کے نیچے بسر کرتا تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ گیارہ برس کے عمر سے میری دو عیدیں کبھی ایک مقام پر نہیں آئیں!

اس نے ہندوستان کو توڑنے یا بتوں کی صورتیں بگاڑنے کا اقدام نہیں کیا جیسا کہ محمود یا سکندر (لودھی) پہلے بادشاہوں نے کیا تھا۔ کنواہہ میں فتح پانے کے بعد ہندوؤں کو بھی اپنی رعایا کا ایک عنصر سمجھ کر اپنے دامن حکومت میں لینا قبول کیا (جیسا آئندہ اس کے پوتے اکبر نے) گوالیار کے مندروں کی نسبت لکھتا ہے کہ بتوں سے قطع نظر، ان کے مکانات مسلمانوں کے مدرسوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مجالس شوری میں بھی اپنے امرا کے ساتھ اب ہم ''امرائے ہند'' کو شریک ہوتا سنتے ہیں رنتھنبور کی تحویل کے سلسلے میں اس نے خاص طور پر وہاں کے ایک پرانے ہندو ملازم کے بیٹے دیوا کو بلایا اور بکر ماجیت کے سفیروں سے گفت و شنید کر کے ''انہی کے طور طریق کے مطابق'' قلعہ حوالے کرنے کی شرائط طے کرنے کا کام سپرد کیا۔ انہی ایام میں ہرات کے دور دراز رشتہ داروں کو ایک خط میں تحریر کرتا ہے کہ ''باغیوں کی جانب سے ہندوستان میں اطمینان ہو گیا اور مشرق یا مغرب میں ہندوؤں کی طرف سے بھی فکر نہیں رہی۔ تائید الٰہی شامل حال رہی تو جو کچھ پیش نظر ہے اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن تدبیر کروں گا۔''

''ہندوستان میں ایسے خربوزے''

مذکورہ بالا کلمات شیر کے دلی یقین کا پتا دیتے ہیں۔تمام ناجنس مقبوضات کو ایک منظم سلطنت کی شکل میں لانے کا عظم کام انجام دینے میں لوگ اس کے شریک تھے، ان سب میں معلوم ہوتا ہے، بابر سب سے کم فکرمند تھا۔تاہم ایک خط میں خواجہ کلاں کو اپنی دلی آرزو صیغہ راز میں منکشف کرتا ہے کہ کسی طرح کابل آنے کی فرصت مل جائے:۔''اپنی مغربی ولایت میں آنے کا اتنا اشتیاق رکھتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ہندوستان کے معاملات اب خاصی طرح درست ہو گئے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب خدا چاہے تو ملک میں کامل امن اور انتظام قائم ہو جائے گا۔جیسے ہی یہ ہو گا ی، میں کابل کی جانب چل پڑوں گا۔وہاں کی راحت و مسرت کس طرح فراموش کر سکتا ہوں۔''پھر لکھتا ہے کہ کوہستان (بدخشاں) کا خربوزہ تراشا تو وطن کی یاد اس قدر غالب آئی کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

بعض دفعہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر واقعی بابر اس خیال میں تھا کہ جتنا جلد ہو سکے خواجہ کلاں اور ہمایوں سے جا ملے اور تمام مغربی لشکروں کو جمع کر کے ایک مرتبہ ایک سمرقند و ہرات واپس لینے کی آخری کوشش کرے۔یہ یخال ان لفظوں سے ناشی ہوتا ہے کہ ''جو کچھ پیش نظر ہے، اسے حاصل کروں گا۔'' لیکن ایسا قیاس کرنا درست نہیں ہے کیونکہ دو مہینے قبل سمرقند کی مہم اس نے (خواجہ کلاں کے حسب مشورہ) اپنے دو بیٹوں کے تفویض کی تھی اور غالبا اسے امید تھی کہ پوری طرح کامیاب نہ ہونے پر بھی وہ کچھ فوائد اور شہرت و ناموری حاصل کر سکیں گے۔یہ بھی

لکھ دیا تھا کہ جب ضرورت نہ رہے تو کامران کو باپ کے پاس آگرے بھیج دیا جائے۔اس خط کی تحریر کے وقت ہمایوں واقعتہً کوچ کر کے لب آمو پہنچ گیا تھا اور بابر نے انہی دنوں آگرے میں پہلا جشن یا تماشا کرایا تھا۔

مختصر یہ کہ بابر کے خطوں کا مطلب اسی قدرت حا جو اس نے تحریر کیا۔وہ پھر بیمار ہوا اور درحقیقت بہت تھک گیا تھا۔کابل کے مانوس پہاڑوں میں آنے کا اشتیاق...... ''جو بیان سے باہر ہے'' آرام لینے کی خاطر تھا ہمایوں اور کامران دونوں کو اس نے صراحتاً لکھ دیا تھا کہ کابل پادشاہ کا خالصہ علاقہ ہے۔اسے لینے کی وہ طمع نہ کریں۔اسی کے ساتھ اپنے پسندیدہ خربوزوں سے محروم ہونے کی تلافی اس نے وہ کی جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھا، یعنی بلخ سے بیج منگا کر آگرے کہ ہشت بہشت باغ میں کاشت کرائے اور جب وہ تیار ہوئے تو انہیں کھا کر بہت خوش ہوا۔لکھتا ہے'' ایسے انگور اور ربوزے ہندوستان میں پا کر میرے دل کو نہایت تسکین اور مسرت ہوئی۔''

خواجہ کلاں کے اسی خط ،مورخہ فروری 1529ء وطن کے خربوزوں کی یاد پر اشک بہانے کے بعد، یکایک وہ مزاج شناس وزیر کو کابل کی حکومت ،اس کے برج و بارہ کی مرمت ،باغوں کی نئی قلم بندی اور اپنے اہل حرم سرا کو ہندوستان منتقل کرنے کی ہدایتیں دیتا ہے۔انہی ہدایات کے درمیان ماضی کی اوریا دیں ،شوریدہ سر شاعر بنائی (ہراتی) کا ایک لطیفہ اور مے کشی کے سرور رفتہ کا قلق بھی معرض تحریر میں آجاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ ''تم نے کابل کے حل طلب مسائل کی بابت تحریر کیا ہے۔میں نے پوری

توجہ سے غور کیا اور یہ رائے قائم کی کہ ایک اقلیم میں کئی کئی حاکم ہوں تو اس کا نظام استوار نہیں رہ سکتا۔ اسی بنا پر میں نے اپنی بڑی بہن اور بیگمات کو ہندوستان بلوایا ہے (بہن سے خانزادہ بیگم مراد ہے اور اس جملے سے حرم سرا کے اندر کشاکش کا پتا چلتا ہے) کابل اور اطراف کابل کو میں نے خالصہ قرار دیا اور اس کی ہمایوں اور کامران کو اطلاع دے دی ہے۔ میرے یہ خط دونوں شہزادوں کو وہ لوگ پہنچائیں جو صاحب فہم و فراست ہیں...... لیکن علاقے کی حفاظت اور رسد رسانی میں کسی بد نظمی کا عذر میں آئندہ سننا نہیں چاہتا۔ اگر اب میں نے سنا کہ بالا حصار کی فصیلیں مضبوط نہیں ہیں، سامان رسد سے گودام اور نقود سے خزانہ معمور نہیں ہے تو اس کوتاہی کا الزام آں رکن سلطنت (خواجہ کلاں) کی گردن پر ہوگا۔

خاص طور پر جو کام کرنے ہیں، ان کی فہرست ذیل میں لکھتا ہوں۔ ان میں بعض امور خصوصاً خزانہ معمور رکھنے کے بارے میں پہلے بھی تم کو لکھا جا چکا تھا:۔

اول: قلعہ کی مرمت۔

دوم: غلے کی بہم رسانی۔

سوم: سفیروں کے جو آتے جاتے ہیں قیام اور سربراہی کا مناسب انتظام۔

مسجد جامع کی تکمیل، کارواں سرائے، حمام کے حجروں کی مرمت نیز بالا حصار کے پیش دالان کی تکمیل کے لئے جسے استاد علی حسن بھٹی کی پکی اینٹوں سے بنا رہا تھا ...... اور جو دیوان عام کے ہم سطح نیز اسی نقشے کے مناسب ہونا چاہئے۔ ان سب کاموں کے لئے محاصل کا جتنا روپیہ مطلوب ہے، لے لیا جائے۔

مزید برآں کابل خورد کا بند، بت خاک بندی کا تنگ گزرگاہ پر پانی روک کر مکمل کیا جائے اور غزنیں کے بند کی مرمت کرائی جائیں۔

مزید برآں، خیاباں کے باغ کے لئے پانی کافی نہیں ہے۔ ایک پن چکی (آسیا) بھر نہر ضرور اس میں کاٹ کرائی جائے۔

خواجہ بستہ کے جنوب مغرب میں میں نے نہر نکالی اور ذخیرہ آب بنا کے ہر طرف نئے پودے لگائے تھے یہاں سے ندی کے پار تک میدان نظر آتا ہے اس لئے اسے ''منظر'' کہتے ہیں۔ وہاں اچھے سے اچھے درخت لگانے اور ایسی چمن بندی کرنے کی ضرورت ہے کہ حواشی پر خوش رنگ وخوش بو پھولوں کی جھاڑیاں ہوں اور عمدہ نقشے کی مطابق انہیں نصب کیا جائے۔

سید قاسم کو تمہیں مدد دینے کے لئے مقرر کیا ہے۔ تفنگچیوں کو مشق کراتے رہنے میں کوہی نہ کرنا اور استا دمحمد امین کی اسلحہ سازی کے کام میں کمی نہ آنے دینا۔

اس خط کے ملتے ہی بڑی بہن اور بیگمان کو کابل سے روانہ کر دو۔ دریائے سندھ تک انہیں پہنچا جاؤ۔ خط پہنچنے کے بعد ایک ہفتے سے زیادہ ان کی روانگی میں دیر نہ ہونی چاہئے۔ پوچھو کیوں؟ تو سبب یہ ہے کہ ان کو لانے کے لئے جو لشکر جائے گا، اس کا قیام بھو کے علاقے میں ہوگا اور دیر تک انتظار میں ٹھیرا تو علاقے کی خرابی کی باعث ہوگا۔

اپنے رات کے چوکیدار عبداللہ کو میں نے لکھا ہے کہ تو بہ کے شاداب اغ میں آکر بھی میرا دل تشنگی کے صحرا کی یاد میں بیقرار رہتا ہے۔ قطعہ:

"ترک شراب سے سوگوار ہوں
کام کرنے کی ہمت نہیں پاتا
لوگوں کو پشیمانی ہے اور توبہ کر رہے ہیں
میں نے توبہ کی اور پشیمان ہوں۔"

"بنائی کی حاضر جوابی اس وقت یاد آئی۔ ایک دن اس نے ایسا لطیفہ سنایا کہ میر علی شیر پھڑک گیا۔ جبہ جو پہنے تھا اس میں بہت عمدہ گھنڈیاں تھیں۔ کہنے لگا، تو نے ایسا مزے کا لطیفہ سنایا کہ یہ جبہ اتار کے تجھے دے دیتا مگر گھنڈیاں نے روک دیا۔ بنائی نے کہا، گھنڈیوں سے کیا رکاوٹ ہے، رکاوٹ تو ان کے کاجوں نے ڈالی ہے" ...... راست و دروغ بر گردن راوی ...... خدا را دگی سے برا نہ مان جانا وہ قطعہ بھی جو اوپر نقل کیا، سال بھر پہلے میں نے لکھا تھا۔ توبہ کرنے کے بعد دو سال تک بزم شراب کے لئے میرا دل ٹوٹتا تھا۔ خدا کا شکر ہے اس برس یہ خیال بد دل سے دفع ہوا۔ شاید یہ حضرت خواجہ (احرارؒ) کی کتاب نظم کرنے کی برکت ہے۔ تم بھی کیوں نہیں شراب چھوڑ دیتے؟ یاران عزیز کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا ایسا ہی پر لطف ہے جیسی ان کی صحبت۔ لیکن تمہارے ساتھ بیٹھ کر پینے والا کون رہ گیا ہے؟ اگر شیر حیدر اور علی قلی جیسے ہم نشین ہیں، تو شراب کشی پر لعنت بھیجنا کچھ دشوار نہ ہونا چاہئے! باقی بہت بہت سلام او رشوق ملاقات۔

(آخری میں) یہ خط پنج شنبہ کو لکھا گیا۔ کیا کیا خیال آتے رہے کہ ضروری ہدایتوں کے درمیان اتنی بہت سی اور باتیں شامل کر دیں۔ زبانی پیاموں کے ساتھ،

خط شمس الدین محمد کو دیا اور رخصت کیا۔ وقت شب، پنجشنبہ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خط، شیر کی اپنے پرانے وطن کو خیر باد کہنا تھی۔ اگر چہ خیر باد کہتے وقت دل کڑھ رہا تھا لیکن بظاہر اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان سے کبھی واپس نہ جا سکے گا اور زندگی کا خاتمہ بھی قریب نظر آتا تھا۔ ماہم اور اپنی بہن، بیٹیوں کو اس نے بلا تاخیر آگرے آنے کا حکم دیا گو کہ یہ سفر پورا کرنے میں انہوں نے بہت دیر لگائی۔ سب سے چھوٹا بیٹا ہندال جسے بابر نے دیکھا نہ تھا، وہ بھی ہمایوں کے پاس بدخشاں میں رہا۔

اس خط کے لکھتے وقت بھی بابر اپنے معمول کے مطابق عاجلانہ کوچ کر رہا تھا کہ مشرق میں نئے دشمنوں کے مقابل عسکری کی امداد کریں۔

گنگا میں کشتی رانی

ابھی بارشیں ہو رہی تھیں۔ بعض دفعہ اندھیری چھا جاتی اور ہوا خیموں اور جنگل کے درختوں پر ایسے تھپیڑے مارتی جیسے کسی جادوگر نے اسے انتقاماً لہکا دیا ہو۔ بابر کبھی کبھی افیون، نیز معجون کے نشے سے دل بہلاتا ہوا برابر کوچ کرتا رہا کہ گنگا کے پار منتظر عسکری سے جا ملے اگر چہ ایک دن اسے گھوڑے کی بجائے پالکی میں سفر کرنا پڑا۔ آگے چل کر وہ اکثر چپٹی کشتیوں میں راستہ طے کرتا جو فوج کے ہمراہ چڑھے ہوئے دریاؤں میں لائی جا رہی تھیں۔ چند بڑی توپیں اور ارابہ دار زنبوریں بھی انہیں بار برداری کی کشتیوں میں چڑھائی گئی تھیں۔

''سہ شنبہ کو ہم نے کوچ کیا۔لشکر گاہ کے سامنے ایک ٹاپو سے دریا میں سبزہ زار نظر آیا۔ میں کشتی میں سیر کو گیا اور پہر گئے واپس آیا۔ یہاں دریا کا کنارہ اونچا تھا۔ میں سوار ہو کر بے خبر جا رہا تھا کہ گھوڑے چٹخی ہوئی زمین سے گزرا یکا یک زمین دھنسی، میں اچھل کر کنارے کے رخ کودا۔گھوڑا بھی نہیں دھنسا لیکن، اگر میں زین پر بیٹھا رہتا تو شاید وہ اس کراڑے کے اندر دھنس جاتا۔آج ہی میں نے تیر کر گنگا پار کی۔ ہاتھ گنتا گیا۔تینتیس ہاتھ میں پار ہوا اور دم لئے بغیر واپس تیر آیا اور سب دریا پہلے تیر کر میں نے پار کئے تھے، سوائے گنگا کے۔

ایک رات پہلا پہر گزرا اور (بہ تصحیح مترجم) تراویح کی نماز ہو چکی تھی کہ ایکا ایکی دل بادل اٹھے اور ایسا طوفان آیا کہ خدا کی پناہ۔ میں اس وقت دربار کے خیمے میں لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔اس سے پہلے کہ کاغذ اور کتاب کے اجزا سمیٹ سکوں، خیمہ پیش چوبہ سمیت مجھ پر آپڑا۔خدا نے مجھا بچایا اور کوئی چوٹ نہیں آئی۔ کتاب کے اجزا سب بھیگ گئے۔انہیں جمع کرنے میں بڑی دقت اٹھائی پھر انہیں چوکے کے نمدے پر بچھایا اور اوپر کمبل ڈال دیئے۔ کوئی نیم ساعت میں طوفان فرو ہوا تو میرے سونے کا خیمہ پھر نصب کیا گیا اور شمع روشن ی۔ بڑی مشکل سے آگ جلائی گئی۔ میں رات بھر نہ سویا۔صبح کی نوبت بجنے تک کتابوں کے اجزا اور اوراق سکھانے میں مصروف رہا۔''

اس پریشان کن طوفان کے آنے سے چند روز ہی قبل حسن اتفاق سے خواجہ کلاں نے عرضی بھیج کر یہ خلاف معمول سی درخواست کی تھی کہ ''وقائع'' بابری کی

پوری نقل اسے کابل ارسال کی جائے۔ یہ بادشاہ کے اور کوئی احوال ووقائع نہیں ہو سکتے، غالباً تزک ہی مراد ہوگی۔ بابر نے لکھا ہے کہ اس نے خود "ایک نقل کی تھی"، وہ خواجہ کلاں کے پاس ارسال کی۔

چڑھی ندیوں کے پار کوچ جاری تھا مگر اس میں بھی سرکاری ہرکارے بلخ تک کی اور دور دراز سرحدوں کی خبریں لاتے رہتے تھے۔ تبریز سے سفیر آنے کی نیز ماہم کے منزل بہ منزل بڑھنے کی اطلاعیں اسی کوچ میں ملتی رہیں۔ البتہ تاکید کے باوجود ہمایوں نے کوئی خط باپ کو نہیں لکھا۔

شیر کا بری اور دریائی لشکر نئے، دشوار گزار علاقے سے بنارس پر بڑھ رہا تھا۔ ضمناً اس نے ایک افغان سردار شیر خاں کا ذکر کیا ہے کہ اس کی ملازمت میں آیا پھر دغا دے کے نئے باغیوں سے جاملا۔ (یہ شیر خاں وہی تھا جو آئندہ سنین میں شیر شاہ کے نام سے مشہور اور مغلوں کا نامی گرامی حریف بلکہ ہمایوں کے حق میں اسی قدر خوفناک ثابت ہوا جیسا شیبانی، بابر کے واسطے بلائے جان ہوگیا تھا) ایسی ناگوار خبروں سے اسے کچھ پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ سرسری احکام نافذ کرے کہ دو ترکش بند دستے ترک اور ہندی سرداروں کے ماتحت جنگ کے بیٹے کے ہمراہ یورپ کے لوگوں کی ہمت بندھانے شاہی فرامین لے کر جائیں۔ بڑے بڑے مغل سپہ سالار مع چین تیمور مغرب میں چھوڑ دیئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آخر بادشاہ کو اپنے ہاتھوں میں قوت آجانے پر اعتماد ہوگیا اور اب وہ دشمن کی کثرت تعداد کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کوچ کے بعض واقعات کا مزہ لے لے کے ذکر کرتا ہے۔ جیسے ایک شیخی

خور پہلوان کا ایک ہر ایک سے کشتی لڑنے کا دعوی کرنا اور پہلی ہی پکڑ میں پچھڑ جانا۔ تاہم بابر نے دل دہی کے لئے اسے بھی انعام دیا۔ ہاتھیوں کا حلقہ بنا کے شیر و کرگدن کے شکار کو جانا اور سارا جنگل چھاننے کے باوجود کوئی شکار نہ ملنا۔ ایک عثمان لی ترک پھنسیوں کا نیا علاج تجویز کرتا ہے کہ مرچوں کو جوش دے کر بھپارا کیا جائے۔ بابر نے یہ عمل کیا تو بڑی چرمراہٹ محسوس کی (اگر چہ فائدہ ہوا) کشتی میں ایک مگرمچھ آپڑتا ہے اور دیکھنے دکھانے کے لئے گرفتار کیا جاتا ہے۔ گل نیلوفر کا کھلنا سن کر اس کے تالاب پر بادشاہ گیا کہ بیج لائے۔ ندیوں کے سنگھ پر دشمن کے علاقے میں اس طرح داخل ہوا جیسے نئی جگہ کی سیر کو جاتے ہیں۔

ہمارا لشکر کرم ناس ندی کے کنارے اترا۔ کہتے ہیں ہندو اس کے پانی کو چھونے سے وہم کرتے ہیں۔ اسے پار کرنے کی بجائے گنگا کے کنارے کنارے سامنے سے نکل جاتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس ندی کا پانی جس کسی کو لگ جائے اس کا ''کرم'' یعنی نیک عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی سے یہ نام رکھا ہے۔ میں کشتی میں بیٹھ کر اس ندی کے اندر دور تک گیا پھر واپس آکر گنگا کے شمالی کنارے پر کشتیاں ٹھیرا دیں۔ لیکن لشکر میں پہلوانوں کی خوب کشتیاں ہوئیں۔ میرے ساقی محسن نے دعوی کیا کہ ایک ایک کر کے چار پانچ سے لڑوں گا۔ پہلے کو تو اس نے دبالیا مگر دوسرے پچھنی کھائی۔ بہت بہت شرمند ہوا۔''

بار بار علیل ہونے اور سخت درد کی تکلیف اٹھانے، آندھی طوفان آنے کے باوجود جس میں اسے روزنامچہ تک لکھنا دشوار ہو جاتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ بابر کس

اطمینان کے ساتھ جملہ امور پر قابو رکھتا ہے۔ سیاسی داؤ پیچ کرنے میں پہلے اناڑی تھا ، اب خوب ماہر ہو گیا ہے۔ مقابلے میں مشرقی افغان حریفوں کے لشکر بڑے ہٹیلے سرداروں کے زیر قیادت تھے جیسے سلطان بایزید، محمود خاں برادر ابراہیم لودھی اور تازہ وارد شیر خاں (سوری)۔ لیکن باران سب کو گھبرتا۔ کھدیڑتا چلا جاتا تھا۔ اس کے اعلانات مقامی لوگوں کو دعوت دیتے تھے کہ پادشاہی لشکر میں بھرتی ہوں اور باغی جتھوں سے افغانی سردار ب رابر ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے اردو میں چلے آرہے تھے۔ چنار، بنارس، خ غازی پور جہاں سرکشوں کا جماد ہوا تھا، اب سب زیر نگیں آ چکے تھے۔

پھر بھی اصلی خطرہ آگے رہا تھا۔ نصرت شاہ والی بنگال و بہار نے آگرے کے جشن میں تحائف بھیج کر اظہار دوست داری کیا تھا لیکن اب بنگال اور بہاری فوجیں گنگا اور گھا گرا کے مقام اتصال کے اوپر جمع ہو رہی تھیں کہ پہلے پسپا ہونے والے لودھی افغانوں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے روکیں لیکن جب نصرت شاہ نے (جسے بابر ''بنگالی'' لکھتا ہے) بایزدید، محمود خاں اور شیر خان کو اپنے لشکر گاہ میں باریاب کیا تو بابر سمجھ گیا کہ اب بنگالی سپاہ باغیوں کے تعاقب میں میرے آگے بڑھنے میں مزاحم ہو گی۔ بایں ہمہ اسے ان سب متحدہ حریفوں کا سامنا کرنے سے بھی منہ پھیرنا منظور نہ تھا۔ یوں وہ جنگ کرنی نہ چاہتا تھا۔ اس نے نصرت شاہ کو لکھا کہ ''میرا خاص مقصد امن و صلح ہے۔''

مگر سچ یہ ہے کہ اس کا دلی مقصد کچھ اور بھی تھا۔ وہ یہ کہ اپنے تیسرے سیزدہ

سالہ فرزند عسکری کو (جسے پچھلے دونوں سپہ سالاری کا توغ وعلم دے کر آگرے سے بھیجا تھا) اسی قسم کی ناموری سے ہم کنار کرائے جیسی ہمایوں کو پانی پت کی جنگ میں میسر آئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں عسکری کے واسطے کوئی معرجہ جیتنا ضروری تھا اگر چہ وہ پانی پت جیسی خوزیز جنگ لڑنی نہ چاہتا تھا۔ اور اپنی مخلوط فوج پر جو نو جوان سپہ سالاروں کے ماتحت تھی، غالباً زیادہ اعتماد بھی نہ رکھتا تھا۔

بہر حال دریاؤں کے سنگھ پر اس نے وہ مقصد پوری طرح حاصل کرلیا جس کا خواہاں تھا اور کامیابی بھی اس کمال اور آسانی سے پائی گویا مغل فوج تھی کہ خود اس کے بنائے ہوئے ناٹک کے مطابق اداکاری کر رہی تھی۔

عسکری کے واسطے نیک شگون

جاسوس، بنگالی سپاہ کی تعداد و اسلحہ کی خبریں لائے کہ مغلوں سے زیادہ بھی ہے اور مستعد پیادہ فوج کے ساتھ آتشیں اسلحہ سے بھی مسلح ہے جو غالباً تجارتی بندرگاہوں پر پرتگیزوں سے خریدے گئے تھے۔ طلائے کے سواروں نے اطلاع دی کہ اتحادی حریفوں نے دو دریاؤں کے سنگھم کے پیچھے مضبوط مورچے بنائے ہیں اور کناروں کی زمین دھنسیلی، میدانوں کھیتوں میں کیچڑ اور جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے گھوڑوں کے لئے اچھی نہیں حالانکہ مغلوں کا بھروسہ سوار فوج پر ہی زیادہ تھا مگر لڑ کر دریا پار کرنے میں وہ خوف منجھے ہوئے تھے۔ یہ بات نصرت شاہ کو معلوم نہ ہوگی مگر اس کے لودھی حلیفوں نے تو شاید خبردار کر دیا ہوگا۔

تیز رو گھاگرا کے گنگا میں گرنے کے مقام پر پہنچنے سے پہلے بابر نے کئی دن یوں گزارے کہ چھپر کھا کے ایک مقامی بزرگ (منیریؒ) کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا اور مضمحل گھوڑوں کو چھانٹ کر پیچھے بھیجا کہ ستا کے، کھلا پلا کے تازہ دم کئے جائیں۔ خود بھی تندرست نہ تھا، لہذا ایک کشتی میں مقیم رہا جس پر دید بانی عرشہ بنایا گیا اور ''آسائش'' موسوم کیا تھا۔

عسکری کا لشکر گنگا کے دوسری یعنی شمال کنارے کوچ کر رہا تھا اور بابر دائیں کنارے پر تھا۔ لہذ ذ مقام جنگ پر ملنے کی غرض سے فوجوں کو کشتیوں میں اتار کر اس مثلث میں جمع کیا گیا جو گھاگرا اور گنگا کے اتصال پر بنا ہوا تھا۔ چونکہ دشمن مثلث کی راس پر خیمہ زن تھا اس لئے مغلوں کے حق میں یہ موقع ساز گار نہ تھا۔ بنگالیوں کی عظیم لشکر گاہ ایک مورچہ بند ٹاپو کے پیچھے تھی اور دریا کے کنارے ان کی کشتیوں کا بیڑا پھیلا پڑا تھا۔ سنگم کے آس پاس سے، جالہ بانوں کو بتایا کہ گھاگرا کو پایاب عبور کرنا ممکن نہیں۔ پادشاہ نے عسکری کی سپاہ کو دریا سے دور رکوا دیا اور اپنے لشکروں کو لئے ہوئے کنارے تک بڑھ آیا۔ چند روز تیاریوں میں گزرے۔ فوج والوں نے استاد علی رومی کی بڑی توپ ''غازی'' اور دوسری چھوٹی توپوں نیز تفنگچیوں کے واسطے دھس دمدمے ندیوں کے سنگم پر بنائے۔ استاد مصطفیٰ کو گنگا کے جنوبی کنارے پر دوسرے دمدمے کا کام سپرد ہوا جہاں سے زنبورکیں اور توڑے دار بندوقیں دشمن کے بیڑے اور ٹاپو پر آتش بازی کر سکتی تھیں۔ جب ادھر ادھر باڑیں چلنی شروع ہوئیں تو بابر نے عسکری اور تمام سرداران سپاہ کو بلا کر شوری کیا۔ اس نے کہا ''یہاں

دریا اترنے کی جگہ اچھی نہیں ہے پس ہماری قلیل فوج یہاں انتظار کرے گی اور بڑے لشکر کو اوپر جا کر ہلدی گھاٹ سے گھاگرا کو عبور کرنا اور پھر بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنا چاہئے۔اس نے بتایا کہ میں خود دو لشکروں کو لے کر مثلث کے زاویے میں ٹھیروں گا۔ایک کے مورچے دوسرے کے عقب میں رہیں گے۔اور عسکری کو چار لشکر دے کر (یعنی دو تہائی سپاہ) دو تین میل اوپر کے رخ بھیجا جائے گا۔کہ گھاٹ سے پار اتر جائے ، جہاں پایاب جگہ تھی یا گھاگرا کا پاٹ کم اور کشتیوں کو پار کرنا آسان تھا۔ گھاٹ پر کشتیاں پہلے سے جمع کی جا رہی تھیں۔مگر دشمن ابھی تک ہلدی گھاٹ کے سامنے نظر نہیں آیا تھا۔

''جب تک عسکری دشمن سے ملاقی ہو، استاد علی قلی اور استاد مصطفیٰ اپنی بڑی توپ، زنبورکوں اور ''فرنگیوں'' (چھوٹی توپ کا نام) سے اور بندوقوں سے برابر غنیم کو اپنی طرف متوجہ رکھیں گے۔توپیں گنگا کے پار گولے چلاتی رہیں گی اور ہم تیار اور منتظر رہیں گے کہ عسکری کی سپاہ نزدیک پہنچ جائے تو خود بھی دریا اتر کر دشمن پر جا پڑیں۔

پہلے دن صبح کے وقت دریاؤں کے آر پار گولہ باری شروع ہوئی تو بابر سے اپنی بڑی توپوں کی کارگزاری دیکھے بغیر نہ رہا گیا۔لکھتا ہے کہ ''میں سوار ہو کر کوئی کوس بھر عین سنگم کے زاویے پر گھوڑے سے اترا اور استاد علی کی چھوٹی توپوں کی باڑیں چلتی دیکھ کر خوش ہوا۔اس نے پتھر کے گولوں سے دو کشتیوں کو نشانہ بنایا جو ٹوٹ کر ڈوب گئیں۔مصطفیٰ نے بھی اپنے مورچے سے ایسا ہی کیا۔میں نے حکم دیا کہ بڑی توپ

بھی صف جنگ میں لائی جائے اور کئی یساول مدد دینے کے لئے مقرر کئے۔ پھر پڑاؤ کے قریب ایک ٹاپو پر جا کر معجون کھائی...... دوسری صبح ''بہادر'' نام کی کشتی میں بیٹھ کر گولہ باندازی کے موقع تک گیا اور ہر ایک کو اپنے کام پر لگایا۔ نماز ظہر کے قریب ایک آدمی نے آ کر اطلاع دی کہ بڑی توپ میں گولہ بھر لیا گیا ہے۔ اب کیا حکم ہے؟ میں نے حکم دیا کہ اسے تو داغ دو اور دوسرا گولہ بھر کر میرے آنے تک ٹھیرو۔ پھر نماز عصر کے قریب ایک بنگالی ڈونگے میں بیٹھ کر دمدمے تک گیا اور استاد کے ایک بڑا گولہ اور دوسرے چھوٹے گولے چلانے کا معائنہ کیا۔ بنگالی بھی توپ چلانے میں شہرت رکھتے ہیں۔ ہم نے یہاں اس کا امتحان لیا لیکن دیکھا کہ وہ کسی خاص نشانہ پر گولہ نہیں مارتے، جہاں تہاں چلاتے رہتے ہیں۔''

اس عرصے میں عسکری کی سپاہ گھاگرا کو شمال میں پار کر آئی تھی اور دریا میں جا بہ جا کشتیوں کی آویزشیں ہو رہی تھیں۔ بنگالیوں نے یہ کوششیں بھی کیں کہ لڑ کر دریا کے پار بابر کی فوج سے آ بھڑیں ادھر بابر نے انہیں پیچھے دھکیلنے کے لئے دستے پر دستہ دوڑایا اور حکم دیا کہ بڑھتے ہوئے دوسری طرف عسکری سے جا ملیں۔ اس عمل سے مغل سپاہ کا زور ہلدی گھاٹ یعنی شمال کی جانب ہوتا چلا گیا۔ تیسری صبح سویرے سویرے یہ خبر جس کا بابر کو اشتیاق تھا، آ گئی کہ مغلوں کی گولہ باری اور دوسری طرف کشتیوں کو جنگی تدبیر سے لڑانے کی بدولت دشمن کا سارا بیڑا بہاؤ کے رخ نیچے بھاگ رہا ہے۔ ''ہماری (یعنی عسکری کی) تمام سپاہ دریا کے پار اتر گئی، کوئی باقی نہیں رہا اور اب سب بنگالی سوار اس کے مقابلے کو نکل آئے ہیں۔'' اسی لمحے بابر کشتی چھوڑ کر

اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور جملہ سرداران سپاہ کو حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے سب کے سب بلا تاخیر دریا کے پار ہو جائیں۔ وہ بھی عجیب نظارہ ہو گا کہ صبح کی مدھم روشنی میں سپاہیوں کے جوق در جوق چپٹی کشتیوں میں لد لد کر اور سوار ڈونگوں میں سوار گھوڑوں کو پانی میں تیراتے ہوئے دریا اتر رہے تھے۔ لاہوری اور ہندوستانی (پیادے) تیر تیر کر یا نرسلوں کے میٹھوں کی مدد سے پانی میں چل کر پار ہوئے۔ بابر کے الفاظ میں "کوئی ناشدنی واقعہ نہ ہوا" ایک سپاہی کو اس نے دیکھا کہ تیرتا نہیں جانتا، گھوڑے کی ایال کے سہارے پار ہوا۔

تاہم دوسرے کنارے پر اترنا آسان کام نہ تھا۔ بنگالی اژدہام کر کے آ گئے تھے کہ آنے والی کشتیوں اور طرح طرح سے دریا پار کرنے والوں کو کنارے پر روکیں اور چڑھنے نہ دیں۔ بابر اپنے ایک سردار کی تعریف کرتا ہے کہ کس طرح چند سواروں کو لے کر اترا گھوڑے پر چڑھ کر پیادہ بنگالیوں کے ہجوم پر تنہا جا پڑا کہ اتنے میں اس کے ساتھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔ بارے دریا اترنے کی یہ برجستہ چال چل گئی مغلوں نے دوسرے کنارے پر قدم ٹکا لئے۔ بابر نے یساول دوڑا کر حکم بھیجا کہ "سب ٹکڑیاں یکجا ہو کر غنیم کے بازو پر حملہ کریں۔ اس کی صفوں میں در آئیں۔"

یہ واقعہ بجائے خود قریب قریب خرق عادت تھا کہ سوار سپاہی دریا کے پار جا اترے جہاں ان سے بڑی تعداد میں پیادے آتشیں اسلحہ لئے موجود تھے۔ پھر اترنے اور صفیں باندھ کر نصرت شاہ کے بازو اور عقب میں حملہ کرنے سے انہیں کون روک سکتا تھا جس کی اصل سپاہ عسکری کے لشکروں کا مقابلہ کرنے چلی جا رہی تھیں۔

بابر جانتا تھا کہ کھیل کا خاتمہ کس طرح ہوگا۔ بنگالے کی فوج پر جو تین طرف سے ضرب لگی تو بے تحاشا چوتھے کھلے رخ سے بھاگی۔ لودھی خاندان کے سلاطین بنگالے کے پرچم چھوڑ کر جان سلامت لئے فرار ہوئے۔ بابر اپنی کشتی میں پلٹا کہ اب اس پر سوار ہو کر مفرور دشمن کے خیمہ و خرگاہ کا معائنہ کرے۔ پھر دریا کے پار آئے۔ لکھتا ہے ''میں نماز ظہر کے لئے وضو کر رہا تھا کہ میرے سردار واپس آئے۔ میں نے ان کی تعریف کی اور انعام و عنایات کا امیدوار بنایا۔ عسکری بھی آیا۔ یہ اس نے پہلا معرکہ دیکھا تھا۔ شگون اچھا ہوا۔'' زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بعض افغان رئیس اظہار اطاعت کے لئے حاضر ہوئے۔ نصرت شاہ کے اطمینان خاطر کی غرض سے اسے لکھ بھیجا کہ میرا مقصد خاص بھی امن و صلح ہے اور اب حالات سازگار ہیں، شرائط صلح طے ہوسکتی ہے۔ چند روز میں شاہ بنگال کے دو موقع شناس ایلچی آئے اور پادشاہ کی خدمت میں باریاب ہو کر عرض کیا کہ نصرت شاہ آپ کی شرائط ماننے کے لئے تیار ہے۔ قریب قریب انہی دنوں میں چین تیمور سلطان کا قاصد پیام لایا کہ بلوچیوں کو دریائے سندھ کے مغرب میں دور تک دھکیل دیا گیا اور اب وہ دریا سے کوئی چھ سو کوس دور ہٹ گئے ہیں۔ اس طرح مشرق اور مغرب دونوں سرحدوں کی جنگ انجام کو پہنچی۔ اب ہندوستان کا بادشاہ بلا حجت تمام شمالی ہند کا **ملک** تھا اور اس کا حریف کوئی نہ رہا تھا۔ بابر اقرار کرتا ہے کہ چین تیمور کی اطلاع سن کر ''بڑی خاطر جمع ہوئی۔''

''شباش واپسی''

اب اس نے بلا تاخیر آگرے کی جانب باگ موڑی۔ بارش ختم ہو گئی تھی لیکن طوفان پر طوفان آتے رہے گنگا کے کنارے ادھر ادھر بچے کھچے سرکشوں کا قلع قمع کرنا اور بایزید اور لودھی سلطان کے تعاقب کا کام باقی تھا۔ مگر بابر کو آگرے کی لو لگی تھی جہاں بیٹیاں اور ماہم اب پہنچنے والی تھیں۔ گریزپا باغیوں کا پیچھا کرنے کا فرض اس نے عسکری اور مشرقی سپاہ کے دوسرے سپہ سالاروں کے تفویض کیا۔ ایک موقع پر یہ سن کر کہ ان میں سے کوئی دریا کی طغیانی دیکھ کر پار جانے سے ٹھٹکتا ہے، بابر نے فوراً عتاب آمیز تاکیدی حکم بھیجا ''جس طرح بن پڑے، دریا کو اتر جاؤ۔ مقابلہ بڑی تعداد سے ہو تو دوسروں کو اپنے ساتھ لو مگر کام کرنے میں ہرگز سستی اور بے دلی نہ دکھاؤ۔'' اسی قسم کا حکم اس نے گنگا اور گھاگرا اترنے کے وقت نافذ کیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے میں خود اس کا طرز عمل تیس برس سے ایسا ہی رہا تھا۔

راستے میں پھر ندیاں، دریا طے کرنے تھے اور جوان دنوں طغیانی پر تھے۔ اس سفر میں روزنامچہ بھی کسی کسی دن اختصار سے ہی لکھا جا سکا۔ پھر بھی کہیں کہیں ذاتی کوائف آ جاتے ہیں۔ جیسے اقامتی کشتی، آسائش'' کچھ وقت گزارنا۔ ختم ماہ رمضان پر گھٹا کی وجہ سے نیا چاند دکھائی نہ دینا۔ ایک ٹاپو پر رات کو ٹھیرنا جہاں سیلاب آ گیا اور دوسرے ٹاپو پر جانا پڑا۔ ایک جگہ دیہاتیوں کا مشعلیں جلا کے مچھلیاں خالی ہاتھوں سے پکڑنے کا تماشا جس میں بابر شریک ہوا اور خود بھی ایک مچھلی ہاتھ سے پکڑی لکھتا ہے:

''اس علاقے کی طرف سے ہماری خاطر جمع تھی لہذا ہم سہ شنبہ کو راتوں رات آگرے چلے اور ایسی تیزی سے چلے جیسے چھاپہ مارنے جاتے ہیں۔ صبح تک سولہ کوس طے کر کے دوپہر کالپی کے پرگنے میں آرام لیا۔ گھوڑوں کو دانہ چارہ کھلایا۔ شام ہوتے چل پڑے اور تیرہ کوس طے کر کے تیسری گھڑی رات بہادر خاں کے مقبرے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر سویا، صبح کی نماز سویرے سے پڑھ کر پھر جا جلا نہ چل پڑے۔ دن ڈھلے تک سوالہ کوس چل کر اوناوہ جا لیا۔ یہاں مہدی خواجہ نے پیشوائی کی۔ پہر بھر رات گزری تھی کہ پھر چل پڑے راستے میں تھوڑی دیر سونے کو ٹھیرے اور پھر دوپہر تک چل کر راپری میں دوپہر کو آرام لیا۔ ظہر کے بعد (پنجشنبہ کو) سترہ کوس طے کر لئے اور رات کی دوسری نوبت بجتے بجتے آگرے کے ہشت بہشت باغ میں گھوڑے سے اترے۔

جمعے کی صبح بخشی سلطان محمد اور دیگر عمائد حاضر ہوئے۔ نماز جمعہ پڑھ کر میں نے جمنا کو عبور کیا اور قلعے میں داخل ہوا اور پھوپیوں سے جا کر ملا۔

بلخ کا ایک کاریزی خربوزے کاشت کرنے پر مقرر کیا تھا۔ آج وہ چند خربوزے لایا۔ چھوٹے ہیں مگر مگر بہت اچھے نکلے۔ ایک دو تاکستانوں میں جو میں نے ہشت بہشت میں لگائے تھے، انگور بھی بہت عدہ ہوئے۔ شیخ گھورن انگور کا ٹوکرا مجھے بھجوایا۔ یہ انگور بھی برے نہیں ہیں۔ ہندوستان میں ایسے خربوزے اور انگور پیدا ہونا دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ہفتے کو آدھی رات کے وقت اطلاع آئی کہ ماہم آرہی ہے۔ عجیب اتفاق ہے

کہ کابل سے وہ (اور بیٹیاں) اسی روز چلی تھیں جس روز میں یورب کو فوج لے کر روانہ ہوا۔" اس طرح دومنزلہ سہ منزلہ کر کے بابر نے پچھلے 48 میل طے کئے اور اہل وعیال کا خیر مقدم کرنے آگرے پہنچ گیا، جنہوں نے کابل سے آنے میں پانچ مہینے لگائے۔

یہاں پھر تزک منتشر یادداشتوں کی صورت اختیار کرتی ہے اور تاریخیں بھی صرف کہیں کہیں دی گئی ہیں۔ ان میں چین تیمور کے عین اس وقت کہ کشتیاں ہو رہی تھیں آنا مذکور ہے اور یہ کہ گوالیار کے حاکم رحیم داد پر بے وفائی کا شبہ ہونے سے قریب تھا کہ بابر خود ادھر چل پڑا گو خلیفہ نے اسے باز رکھا۔ ماہم کے ہمایوں کی طرف سے ہدیہ لانے کا ذکر آتا ہے لیکن اس کے سوا ہمایوں یا ہندال کی نسبت کچھ تحریر نہیں جسے بڑے بھائی نے (باپ کی بغیر اطلاع) بدخشاں بلوالیا تھا۔

تزک میں آخری اندراج 7 ستمبر 1529ء (3۔محرم 936ھ) کا یہ ہے: "رحیم داد کی بداعمالی کی معاف کر دیا گیا۔ اس کی جگہ شیخ گھوران (جونیلوفر کا بیج اور تازہ انگور لایا تھا) اور نور بیگ گوالیار بھیجے گئے کہ وہ وہاں کا انتظار کے سپرد کر دے۔ آئندہ جو کچھ پیش آیا، وہ گلبدن یا خواند میر وغیرہ مورخوں کے ہاں ملتا ہے۔ خواند میر ہندوستان کی عظیم تر سلطنت کے پادشاہ کی سرپرستی میں آرہا تھا۔ گلبدن ان دنوں باپ کے پاس تھی اور خاندان کے واقعات کو آخری مہینوں میں اہل حرم نے جس طرح مشاہدہ کیا، وہ کیفیت اسی خاتون کے ہمایوں نامہ سے نقل کی گئی ہے۔

''خاندان میں موت آتی ہے''

گلبدن کو اس نئی دنیا اور نئے دربار میں آ کر باپ کے ملنے سے جو بے پایاں خوشی ہوئی تھی، اس کا نقش برابر دل پر قائم رہا آگرے کے طول طویل سفر میں جب کہ فوجی بدرقہ ساتھ تھا۔ ننھی گلبدن کو بادشاہ کے سامنے جانے سے بہت خوف رہا لیکن جب سے اس نے اٹھا کر اپنی گود میں لیا اس وقت سے، ایک ہفت سال بچے کے جملہ معصوم جذبات کے ساتھ وہ باپ سے وابستہ ہوگئی۔ اسے پدرانہ شفقت کی نئے وطن میں مانوس و مستقل ہونے تک ضرورت بھی تھی۔ وہ اپنی ماں دلدار بیگم اور بھائی ہندال سے جدا کر لی گئی اور ماہم کے زیر تربیت تھی۔ اب آگرے میں ماہم سب سے بڑھ کر دو نئی آنے والیوں کے پیچھے پڑی رہتی تھی جو گورے رنگ کی چرکس کنیزیں تھیں اور محل میں کھلے بال اچھالتی پھرتی تھیں۔ وہ ماہم کی زیادہ پروا نہ کرتی تھیں کیونکہ بادشاہ کی منظور نظر تھیں اور کسی معمولی آدمی نے نہیں، ایران کے شاہ طہماسپ نے انہیں بابر کے پاس بھیجا تھا۔ گلنار اور نارگل ان کے نام بھی طرفگی سے خالی نہ تھے۔ رات کو ان میں سے ایک یا دوسری، پادشاہ کی طلبی پر اس کے حجرے میں چپکے سے آجاتی تھیں۔

مگر ان کنیزوں پر پیچ و تاب کھانے سے بھی ماہم کی توجہ دوسری پریشانیوں سے نہیں بٹ سکی، جن کا گلبدن پورا اندازہ نہ کر سکتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے فرزند ہمایوں کے آگرے میں موجود نہ ہونے کی فکر کھائے جاتی تھی۔ کئی سال میں شوہر کو دیکھا تو مسلسل جنگ و سفر کے باعث اسے بہت مضمحل پایا اس کی بار بار

بخار آ جانے کا، پھر مرچوں کے بھپارے سے سوزش ہونے کا سن کر نہایت مشوش ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس حال میں وہ بزرگوں کے اقوال نظم کرتا تھا۔ ایک اور تشویش یہ کہ دوسری بیوی کے فرزند عسکری پر خاص نظر عنایت ہوگئی تھی ...... غرض شوہر کے بارے میں یہ سب تو ہمات ماہم کو اندیشہ مند کرتے تھے۔ قیام کابل کی ساری مدت میں وہ حرم سرا کی تنہا مالکہ رہی تھی، اب اس کی خاطر پراگندہ اور وہم پرست ہونے کی وجہ سے چار سال پہلے بچے کے مرنے کا غم بھی نہیں بھولی تھی، پس وجدانی طور پر اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ نئی شان وعظمت خاندان پر کسی آنے والے مصیبت کی نشانی ہے۔ خود بابر ایسا کوئی خطرہ محسوس نہکرتا تھا۔ ادھر گلبدن ان باتوں کو مشکل سے سمجھ سکتی تھی۔ وہ اپنے جلیل الشان باپ کو دیکھ کر ہی خوشی سے پھولی نہ ساتی تھی مگر ماہم کیعتاب کے خوف سے اسے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ کم سے کم ایک مرتبہ اس نے ماہم کو اپنے بادشاہ باپ پر بھی اعتراض کرتے سنا اگرچہ وہ بے نتیجہ رہا۔ لکھتی ہے کہ ''قیام آگرہ کے سارے زمانے میں میرے والد کا معمول تھا کہ ہر جمعے کو اپنی پھوپیوں سے ملنے جاتے تھے (جو بیوی بچوں کے آنے سے پیشتر آگرے آگئی تھیں) ایک دن سخت گرمی تھی۔ حضرت بیگم نے بیقرار ہو کر کہا '' آج ایسی لو چل رہی ہے۔ کیا حرج ہے اگر اس جمعے آپ اس کے پاس جانا ناغہ کر دیں؟ وہ بیگمیں اس میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھیں گی۔'' والد حضرت نے کہا '' ماہم، تعجب ہے تم ایسی بات کہتی ہو۔ میری پھوپیوں کے باپ رہا نہ کوئی۔ بھائی میں بھی ان کی خاطر داری نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟''

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ کابل سے دوسری شاہی خواتین، مع خانزادہ بیگم اور بی بی مبارکہ نئے دارالسلطنت میں پہنچ گئیں۔ بابر نے پہلے سے اطلاع دی اور انتظام کردیا تھا مگر ان کی آمد بھی ماہم کی تشکین و تشفی نہ کرسکی۔ گلبدن لکھتی ہے "کابل سے شہزادیوں کے آنے کی خبر آئی تو والدہ حضرت میری بڑی پھوپی اور اپنی بڑی بہن اور عزیز ترین خاتون (خانزادہ بیگم) کے شایان شان استقبال کے لئے نئے حمام تک خود پیشوائی کرنے گئیں۔ انہی کے خیمے میں دوسری آنے والی بیگمات پادشاہ کا آداب بجالانے حاضر ہوئیں۔ سب نہایت مسرور و شاد تھیں۔ شکر کے سجدے ادا کئے اور پھر سب مل کر آگرے روانہ ہوئے۔ پادشاہ نے ہر ایک کو حویلیاں عنایت کیں" مگر خانزادہ آگرے کے نئے تزک و احتشام میں زیادہ دن نہیں رہی بلکہ اپنے محرور المزاج شوہر مہدی خواجہ، حاکم اٹاوہ کے پاس چلی گئی۔ تاہم بابر نے اسے بھی دوسری بیگمات سمیت خود ساتھ جا کر اپنی زیر تعمیر عمارتیں اور آگرے کا وہ حصہ دکھایا جسے "کابل" کا نام دیا گیا تھا۔ گلبدن کے ذہن میں تو یہ آیا کہ اس کا باپ جسے پہلی دفعہ ہوش میں دیکھا، عجیب سے عجیب کام کرسکتا ہے:۔

"آگرے میں دریا کے دوسری جانب اس نے حکم دیا کہ محل سرا اور باغ کے درمیان ایک سنگین محل خود اس کے لئے تعمیر کیا جائے...... ایک دن وہ ماہم بیگم اور اس حقیر کنیز کو دھول پور لے گئے جہاں پہاڑ کی چٹانوں میں انہوں نے کوئی سات قدم عرض کا حوض ترشوایا ہے۔ ایک دفعہ فرمایا تھا کہ بن جائے تو اسے شراب سے بھرواؤں گا۔ لیکن چونکہ رانا سانگا کی جنگ سے پہلے شراب پینی ترک کی، لہذا عرق

لیمو سے اسے بھروایا تھا۔

سیکری میں (آخری میدان جنگ کے قریب) اعلیٰ حضرت نے ایک بڑا تالاب بنوایا، اس کے بیچ میں چبوترہ تھا۔ یہ تیار ہو گئے تو وہ جا کر چبوترے پر بیٹھتے یا اس کے گرد کشتی رانی کا لطف اٹھاتے تھے..... سیکری کے باغ میں ایک شاندار (دو منزلہ) بارہ دری بنوائی جہاں بیٹھ کر وہ اپنی کتاب لکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ نیچے کی منزل میں اپنی افغانی دایہ کے ساتھ میں بیٹھی تھی کہ میری والدہ (ماہم بیگم) نماز کے لئے گزریں میں نے دایہ سے کہا مجھے اٹھا، اس نے جو ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو جوڑ جگہ سے اتر گیا۔ مجھ میں طاقت نہ رہی اور بے اختیار رونے لگی۔ فوراً استخواں بند بلایا گیا اور جب تک اس نے جوڑ نہیں بٹھا دیا بادشاہ وہاں سے نہیں گئے۔

کی اس رحم دلی کی جب تک اس کی پٹی نہیں بندھی، وہ وہاں سے نہیں گیا، یاد کے ساتھ گلبدن اس کی ماندگی کو یاد کرتی ہے:۔

''چند روز بعد وہ (شاہی معافی کے) باغ زرافشاں کی سیر کرنے گئے۔ اس میں وضو کرنے کا حوض بنا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر کہنے لگے ''میرا دل حکومت اور فرماں روائی سے بھر گیا ہے۔ میں تو گوشہ نشین ہو کر اس باغ میں آ رہوں گا۔ رہے نوکر تو ایک طاہر طشت بردار میرے لئے بالکل کافی ہو گا۔''

یہ سن کر ماہم اور ہم سب بچوں کا بہت دل دکھا اور سب نے آب دیدہ ہو کر کہا خدا آپ کو زمانہ دراز تک صحیح سلامت رکھے۔ اور بیگم نے کہا خدا آپ کے بچوں کو آپ کے بعد عمر دراز عطا کرے''

اس واقعے سے کچھ پہلے ہمایوں یکایک والدین کے پاس آ گیا تھا۔ کس طرح اور کس تاریخ آیا، یہ بات پادشاہ کی تزک یا اس کی بیٹی کی کتاب میں مرقوم نہیں ہے۔ عجب نہیں بابر نے بیٹے کی وارفتہ مزاجی سے حسب معمول اغماض برتا ہو۔ دور کاشغر میں میرزا حیدر نے سنا (ممکن ہے خود ہمایوں سے) کہ ہمایوں کو باپ نے آگرے کا حکم دیا تھا۔ ایک اور مصنف بابر کی طرف سے اس ملاقات کا واقعی یا خیالی حال اس طرح لکھ گیا ہے:

"میں اس کی ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ اس کو دیکھ کر ہمارے دل بھر آئے، آنکھیں چمکنے لگیں۔ میرا دستور تھا کہ روزانہ دستر خوان پر لوگوں کے ساتھ کھنا کھاتا۔ لیکن اس روز ہمایوں کے آنے کی خوشی میں اور اس کی عزت افزائی کی غرض سے میں نے بڑی ضیافت کی۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے رہے۔ اس سے باتیں کرنا اور اس کو جواں رعنا دیکھنا، حقیقت میں عجیب مسرت کا باعث ہے۔"

یہ بابر کے الفاظ نہ ہوں تو بھی ابتدا میں حیران رہ جانے کے بعد اس نے ہمایوں سے کمال عنایت کا برتاؤ کیا وہ اپنی ولایت چھوڑ کر بلا اجازت آگرے چلا آیا تھا۔ یہاں بابر نے دوآبے کا نہایت زرخیز پرگنہ سنبھل اسے دیا جہاں سے ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں نظر آتی تھیں اور ادھر آگرے سے گھوڑے پر دریا دریا دو دن کی مسافت پر تھا اسی کے ساتھ ہمایوں کے حسب مذاق الگ تھلگ بھی تھا جہاں اس نے اپنے مصاحبوں کا علیحدہ حلقہ بنا لیا۔

لیکن میرزا حیدر لکھتا ہے کہ دس سالہ ہندال کو بابر نے بدخشاں سے واپس بلا لیا اور یہ ولایت سمرقند نژاد کے امیر الاغری کے فرزند سلیمان تفویض کر دی۔ ایک زمانہ پہلے جسے لوگ بھول چکے تھے۔ اس نے میرزا حیدر سے کہا تھا کہ ''سلیمان کو میں اپنے بیٹے کی مثل خیال کرتا ہوں۔'' حیدر نے جو اس موقع پر یہ دیرینہ قول نقل کیا تو شبہ ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں اصل بیٹے کی نافرمانی کا خیال تھا۔ بہر حال ماہم کی خاطر یقیناً جمع ہو گئی کہ ہمایوں ہندوستان میں اس کے اتنے قریب آ گیا تھا جہاں سے ہر طرح کی خیر خبر ملنی آسان تھی۔ بایں ہمہ خاندان پر جس مصیبت کا ماہم کو خطرہ تھا وہ نہیں ٹلا۔ سرد کوہستانی علاقے سے ہندوستان کے گرم و مرطوب میدانوں میں آنے والوں میں بیماری پھیلنی ناگزیر تھی۔ بابر کو بار بار بخار اور پیچش ہوتی تھیں۔ گلبدن کی ماں دلدار بیگم کا بچہ جسے ماہم نے لے لیا تھا، موت کا پہلا شکار ہوا۔ یہ زرافشاں باغ میں بابر کی مایوسانہ گفتگو پر اہل محل کے رنج و غم کرنے کے پہلا شکار ہوا۔ یہ زرافشاں میں بابر کی میاوسانہ گفتگو پر اہل محل کے رنج و غم کرنے کے چند روز بعد کا واقعہ ہے۔ گلبدن بیگم بیان کرتی ہے: ''تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ شہزادہ انور بیمار پڑا۔ اس کے امعاء میں خرابی آ گئی تھی اور حکیموں کی سعی و تدبیر کے باوجود بیماری بڑھتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ وہ دنیا سے عالم بقا کو سدھارا۔ والدہ حضرت (ماہم) کو نہایت رنج ہوا۔ اور دلدار بیگم جس کا وہ اکلوتا فرزند تھا، غم و ماتم سے بے خود ہو گئی۔ اس کی نالہ وزاری کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے والدہ اور دوسری بیگمات سے کہا کہ ''چلو ہم لوگ دھول پور کی سیر کر آئیں۔ وہ تفریحاً کشتی سے روانہ ہوئے۔ بیگمات نے بھی

درخواست کی کہ انہیں بھی کشتیوں میں لے جایا جائے۔''

دلدار کے کئی بچے تقدیر نے چھنوا دیئے تھے۔ یہ اکیلا جورہ گیا، اسے اجل نے چھین لیا۔ ادھر اسی زمانے میں خبر آئی کہ ماہم کا بھی اکیلا سلامت ماندہ فرزند ہمایوں شدت گرما سے بیمار پڑ گیا۔

بابر کی دعا

ملک میں گرمی بلائے بد کی طرح بڑھتی چلی آتی تھی۔ محلات میں بیگمات دریا کنارے سایہ دار احاطہ بند باغوں میں سر چھپائے پڑی رہتی تھیں۔ لیکن بابر بادشاہ حسب معمول گشت میں مصروف تھا۔ کبھی وہ سلیمان کو ولایت بدخشاں جانے کی ضرورت ہدایتیں دیتا اور کبھی سرحد چین کے مغل نژاد خوانین کے پاس ضروری مراسلات بھیجتا اور انہیں گردوپیش کے خطرات سے خبردار کرتا تھا تاکہ وہ سلیمان میرزا کی مدد کرے اور کبھی لاہور کے تپتے میدانوں میں مڑ جاتا یا کسی فساد کے فرو کرنے پر متوجہ ہو جاتا تھا۔ کامران کے قندھاری پیاولوں کو باریاب کرتا اور پھر سرہند کے پار، جہاں گزشتہ سلاطین کا بڑا قلعہ تھا، کسی قدر ٹھنڈی بلندیوں پر جا کر شکار کھیلتا تھا۔ یہیں سے کشمیر کی مہم تیار کرتا اور پھر آگرے پلٹ کر اپنی کتاب کی نظر ثانی یا سیکری کے باغ کے تالاب میں کشتی رانی سے دل بہلاتا تھا۔

گوشہ گزیں اونگھتی بیگمات کو دہلی کے ایک خط نے چونکا دیا۔ (گلبدن لکھتی ہے کہ) ''اسی وقت مولانا کا خط آیا جس میں تحریر تھا کہ شہزادہ ہمایوں سخت علیل ہو

گئے ہیں۔ بیگم حضرت فوراً دہلی تشریف لے آئیں۔ شہزادے کو بڑی نقاہت ہو گئی ہے۔''

رقعہ لانے والے نے بتایا کہ مشیر وندیم مولانا علیل شہزادے کو دریا کے راستے دہلی لا رہے ہیں والدہ حضرت کو یہ خبر سن کر نہایت تشویش ہوئی اور بے قرار ہو کر فوراً دہلی روانہ ہوئیں۔ جیسے پیاسا کنوئیں کی تلاش میں دوڑتا ہوا جاتا ہے۔ لیکن راستے ہی میں تھیں کہ متھرا پر شہزادے سے ملاقی ہوئیں۔ ان کی تجربہ کار نگاہ میں وہ اس سے زیادہ بیمار و کمزور تھا، جتنا بتایا گیا تھا۔ متھرا سے ماں بیٹے، بی بی مریم و مسیح کی طرح آگرے روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچنے پر یہ حقیر کنیز اپنی بہنوں سمیت حاضر ہوئی اور راس سراپا نکوئی شہزادے کے بستر علالت کے سامنے لائی گئی۔ وہ روز بروز زیادہ زیادہ کمزور ہو رہے تھے۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اپنی زبان محبت آگیں سے فرمایا: ''بہنو، جیتی رہو۔ آؤ مجھ سے گلے ملو۔ مدت سے میں تم سے نہیں ملا۔'' دو تین دفعہ انہوں نے سر اٹھا کر یہی الفاظ کہے۔

جب اعلیٰ حضرت تشریف لائے اور بیماری دیکھی تو ان کا شگفتہ چہرہ افسردہ ہو گیا اور معلوم ہوتا تھا ان پر خوف طاری ہو رہی ہے۔ یہ دیکھ کر والدہ حضرت کہنے لگیں ''آپ میرے بیٹے دیئے ہیں۔ ہاں میں غمگین ہوں کہ میرا یہی ایک بیٹا ہے۔''

اعلیٰ حضرت نے جواب دیا، ''ہاں ماہم میرے اور بیٹے ہیں مگر وہ ہمایوں نہیں ہیں۔ جو میرا ابھی ایسا ہی فرزند ہے جیسا تمہارا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ زندہ رہے اور خدا اس کی خوشیاں بر لائے اور زمانے دراز تک اسے سلامت رکھے،

کیا میں نے سلطنت دوسروں کو چھوڑ کر اسی کے نام نہیں کر دی۔ دوسرے اس کی برابری نہیں کر سکتے۔

اطبا اپنی سی کوششیں کرتے رہے لیکن ہمایوں کو افاقہ نہیں ہوا۔ ماہم اور دیکھ بھال کرنے والی خواتین کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ مرض دوا دارو سے نہیں جائے گا۔ اب اس کی مرگ وزیست کا سوال تھا اور اس کا فیصلہ صرف خدائے عز وجل ہی کر سکتا تھا۔ بیمار کے نیم تاریک کمرے میں یہ خواتین چپ چاپ بیٹھ کر دعائیں کرتی تھیں کہ شہزادے کو تکلیف نہ ہو۔

ایک، سہ شنبہ تھا جب کہ بابر نے طبیوں کو رخصت کیا اور اس علاج کی تیاری کی جس کا دوا کی بجائے صرف خدائے قادر سے واسطہ تھا۔ اس کی قوم میں ایک عقیدہ چلا آتا تھا اور اتنا قدیم تھا، بلکہ اس سے بھی قدیم تر جب کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی جناب میں بیٹا قربان کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ یہ خدا سے رحم کی التجا میں شفاعت پیش کرنے کا طریقہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی سب سے عزیز چیز، حتی کہ فرزند اکبر کی قربانی دے تو رحمت الٰہی کا امیدوار ہو سکتا تھا۔

بیرونی دیوان خانے میں اہل عقل وفراست بادشاہ سے حجت کرتے تھے اور کہ یہ بہت پرانا عقیدہ ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسی نذر یا قربانی کا فائدہ کیا ہو گا؟ اس کی بجائے ان بزرگان مشائخ نے خاص طور پر وکالت کی کہ اللہ تعالٰی کے ننانوے (99) اسمائے حسنیٰ کا مل کرورد کیا جائے تو ضرور مؤثر ہو گا بعض مشیروں نے عرض کیا کہ پادشاہ اگر ایسا عمل کرنا ہی چاہتے ہیں تو جواہرات میں سب سے بیش بہا

ہیرا ''کوہ نور'' صدقہ کر دیں۔ بابر نے کہا۔ ''میں خدا کی جناب میں پتھر نذر نہیں کروں گا۔''

(گلبدن بیگم تصدیق کرتی ہے کہ) ''اس سہ شنبہ کو اور آئندہ دنوں میں پادشاہ نے ہمایوں کے گرد طواف کیا اور دعا مانگتا رہا۔ بابر بار سر اٹھاتا اور (بہ تصحیح مترجم) خدا کی رحمت و کرم کے واسطے دیتا تھا۔ کمال خضوع اور خشوع قلب سے دعائیں کرتا تھا۔ موسم شدید گرم اور پادشاہ کے قلب و جگر میں حدت تھی۔ چھپر کھٹ کے گرد طواف کرنے میں وہ اس قسم کے الفاظ کہتا جاتا تھا: ''بار الٰہ! اگر جان کے بدلے جان قبول ہو، تو میں ظہیر الدین بابر اپنی جان اور زندگی اپنے فرزند ہمایوں کی جان کے عوض پیش کرتا ہوں۔''

کمرے میں دوسرے لوگوں نے بابر کو یہ کلمہ با آواز بلند کہتے سنا کہ ''میں نے (بیماری) لے لی، لے لی، لے لی۔'' گلبدن کا بیان ہے کہ اسی شام سے پادشاہ کمزور اور بیمار ہو گیا اور اس کی برعکس ہمایوں کے سر پر پانی رکھا تو وہ اٹھ کر بیٹھنے کی قابل ہو گیا۔ گرمی کی عقوبت اور بیمار کے کمرے کی تاریکی میں عورتیں خاموش بیٹھی دعا کر رہی تھیں اور کچھ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بابر کی قربانی پیش کرنے کا کیا انجام اور کونسا زیادہ الم ناک انجام برداشت کرنا ہوگا؟

ہمایوں شفایاب ہو گیا اور چند روز بعد باپ کے حکم سے اپنی جاگیر پر سنبھل واپس گیا۔ لیکن بابر کو پھر آگرے سے باہر جانا نصیب نہ ہوا۔ جن درباریوں کی آنکھیں ادھر لگی ہوئی تھیں، انہوں نے مشاہدہ کیا کہ اس کا بخار عود کر آیا اور اس نے

علاج معالجے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔

تاہم لوگوں کو یاد تھا کہ بارہا پادشاہ بخار کے حملے، امعا کی خرابیاں جھیل چکا ہے۔ کتنی ہی دفعہ بستر علالت سے اٹھ کر سوار ہوا۔ گنگا کو تیر کر پار کیا، یا کسی نئے باغ کو دیکھنے نکل گیا ہے۔

ادھر کبوتروں کی طرح جنہیں وجدانی حس اپنی کابکوں کی طرف کھینچ لاتی ہے، سلطنت کے بڑے بڑے امرا، سپہ سالار و سردار اطراف و اکناف سے کوئی نہ کوئی عذر نکال کر اپنا مقام چھوڑ کر آگرے چلے آ رہے تھے۔ چین تیمور، بوڑھا تردی بیگ، ہندو بیگ اور کئی دوسرے، دیوان عام کے ایک جلسے میں جمع ہوئے، جہاں بابر شریک نہ تھا۔ ہمایوں کے غیر مستقل حکمران ہونے کی باتیں ہوئی۔ یہ بھی کہا گیا کہ باپ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن بابر کی اس دعا کے بعد کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ہمایوں کو ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ پھر وہ پرانا قضیہ زیر بحث آیا کہ خواہ مخواہ کلاں کی طرح ایک جماعت کی رائے میں مرکز حکومت کابل رہنا چاہئے تھا اور دوسرا گروہ بادشاہ کے اس فیصلے کا پابند تھا کہ دارالسطنت آگرہ ہی بنایا جائے گا۔ سخت پریشانی میں خلیفہ نے بعض امرا کو جتایا کہ ہمایوں ناعاقبت اندیش، قوت ارادی کا ضعیف اور صرف بابر کے بل بوتے پر چلتا رہا ہے۔ کیا اس کے احکام کی دوسرے تعمیل کریں گے؟ پھر خود ہی تجویز کیا کہ اس شہزادے کو قدیم ولایات میں بھیج دینا اور کسی صاحب عزم و ہمت کو ہندوستان کا فرماں روا بنانا مناسب ہوگا اور ایسا کوئی شخص ہے تو وہ شہزادی خانزادہ بیگم کا شوہر مہدی خواجہ ہے۔ لیکن جب مہدی کو بزم

شوری میں بلایا گیا تو اس نادان جنگ جو نے ثابت کیا کہ وہ شیر کی کھال میں گدھا تھا۔ یہ طریق راز امیروں سے کہنے لگا کہ ''میں بادشاہ ہوا تو پہلا کام یہ کروں گا کہ اسے بڈھے سر ہلتے خلیفہ کو جو سلطنت کا ستون بنا بیٹھا ہے، نکال باہر کیا جائے گا۔'' اس پر خلیفہ کو اس کی حمایت سے کانوں پر ہاتھ دھرنے پڑے۔

امراء انتظار میں تھے کہ شاید بابر کے افاقے کی خبر سنیں۔ لیکن (گلبدن لکھتی ہے) ''جب اس کی حالت ردی ہوتی گئی تو ہمایوں کو بلانے کے لئے قاصد بھیجا گیا۔ یہ شہزادے کالنجر چلا گیا تھا۔ پیام ملتے ہی بہ سرعت آگرے آیا اور پادشاہ کی خدمت میں آداب بجالایا۔ اسے بھی نظر آ گیا کہ باپ کس قدر کمزور و ناطاقت ہو گیا ہے۔ تیمارداری کرنے والوں سے بار بار پوچھتا تھا کہ اعلیٰ حضرت کی اتنی جلدی یہ کیا حالت ہوگئی، اتنے کمزور کس طرح ہو گئے؟ طبیبوں کو بلا کر بھی اس نے یہی سوال کیا کہ ''میں بادشاہ کو اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟''

''ادھر میرے والد حضرت برابر دریافت کر رہے تھے کہ ہندال کہاں ہے؟ چند روز میں کسی نے آ کر عرض کیا کہ شہزادے کا اتالیق بردی بیگ حاضر ہے۔ میرے باپ نے مضطربانہ اسے بلوایا اور پوچھا ''ہندال کہاں ہے، وہ کب آئے گا؟ ''بردی بیگ نے عرض کیا حضور کے فرزند کل بند دہلی پہنچ گئے ہیں، آج ہی یا کل باریابی کا شرف حاصل کریں گے۔ پادشاہ نے خفگی سے فرمایا ''ارے نامراد، مجھے معلوم ہے کہ تو نے لاہور میں اپنی شادی رچائی اور اسی کے راگ رنگ میں میرے بیٹے کے آنے میں اتنی دیر ہوئی اور میں برابر اتنے دن انتظار کی زحمت اٹھاتا رہا۔

اچھا یہ تو بتا ہندال کا قد اب کتنا نکل آیا ہے، وہ کیسا معلوم ہونے لگا ہے؟''

اتفاق سے بردی بیگ شہزادے کا دیا ہوا جامہ پہنے ہوئے تھا۔ اسے دکھا کہ اعلیٰ حضرت سے عرض کیا کہ یہ جامہ شہزادہ سلامت نے اپنے خادم کو عطا کیا ہے۔ تب بادشاہ نے اسے اور نزدیک بلایا اور برابر کہتے رہے ''دیکھوں تو سہی وہ کتنا بڑا اور کتنے قد قامت کا ہو گیا ہے؟'' اور یہ بھی کہے جاتے تھے کہ وہ کب آئے گا؟''

غیر حاضر شہزادے کی فکر کرتے بابر کا دھیان گلبدن اور اس کی بڑی بہنوں کی طرف گیا۔ اس نے دو سپہ سالاران سے شادی کے لئے نامزد کئے اور خانزادہ بیگم کو بلوایا کہ وہ بھی ان رشتوں کی تائید کرے۔

آخر ایک دن اس نے اپنے تمام بڑے امراء کو طلب کیا اور ان سے اس قسم کے کلمات کہے:۔

''میرے دل میں تھا کہ سلطنت ہمایوں میرزا کے حوالے کر کے خود باغ زرافشاں میں گوشہ نشین رہوں خدائے کریم کے فضل سے میرے دل کی بہت مرادیں پوری ہوئیں، سوائے اس خواہش کے۔ لیکن اب مجھے مرض نے دبا لیا ہے۔ میں تم سب کو وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد ہمایوں کو بادشاہ تسلیم کرو، اس کے وفادار، آپس میں متحد رہو۔ مجھے خدا سے امید ہے کہ ہمایوں بھی حسب دلخواہ کام کرے گا۔''

پھر اس نے علیحدہ ہمایوں سے یہ بات کہی ''تمہارے بھائیوں کو میں تمہاری

حفاظت میں چھوڑتا ہوں۔ان سے اخلاص ومحبت اور ساری رعایا کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا۔‘‘

ہم خاندان والوں اور حرم سرا میں جب یہ خبر آئی ،تو سب کے حواس جاتے رہے۔رونا پیٹنا مچ گیا۔

اس کے تیسرے دن ان نے ملک بقا کی راہ لی۔انتقال اتوار (25۔دسمبر 1530ء مطابق 4 سے جمادی الاول 937ھ) کو ہوا۔مردوں نے خانزادہ بیگم اور میری ماؤں کو یہ کہہ کر اطبا آئیں گے باہر بلوایا اور پھر ہم سب کو بڑے محل میں واپس پہنچادیا۔اس یاس وغم کے دن ہر ایک کونے میں منہ چھپائے پڑا رہا۔‘‘

وقائع مابعد

جیسا کہ گلبدن بیگم نے آخری دن کی کیفیت میں اشارہ کیا ہے، کچھ دیر کے لئے بابر کی وفات کو مخفی رکھا گیا۔ خاندان کے لوگ اور بڑے امراء کو اندیشہ تھا کہ اس خبر کو سن کر عوام فساد برپا کر دیں۔ پھر گلبدن لکھتی ہے " آرائش خاں نے جو ہندوستان کا امیر تھا، سب سے کہا کہ انتقال کو چھپانا مناسب نہیں ہے۔ ورنہ یہاں کے بازاری شبہ کریں گے کہ بادشاہ پر کوئی آفت آ گئی اور جیسی یہاں والوں کی عادت ہے چوری، لوٹ مار شروع کر دیں گے۔ خدانخواستہ بے خبر مغلوں کے مکان انہوں نے لوٹے تو بہت برا ہوگا۔ بہتر ہے کہ ہم کسی سرخ پہنا کر ہاتھی پر سے اعلان کرائیں کہ پادشاہ نے ترک دنیا کر کے خلوت اختیار کی اور بادشاہی ہمایوں بادشاہ کے حوالے کر دی۔

اس رائے پر عمل کیا گیا۔ بظاہر باپ کی وفات کے وقت ہمایوں آگرے میں نہ تھا لیکن تیسرے دن زرافشاں باغ میں اس نے دربار عام کیا اور بے شمار سکے لوگوں میں نچھاور کیے۔ ان حالات میں وراثت کا کوئی قضیہ پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ بڑے امرا شاہی وراثت کی روایت پر قائم رہے، جیسے خود بابر کے معاملے میں اندجان میں عمل کیا گیا تھا اور مغلوں کی پسند کو اہل ہند نے بھی تسلیم کر لیا۔ ہندال جس کا بابا کو اتنا سخت انتظار اور فکر تھی، آخر آگرے پہنچ گیا۔ قندھار کو کامران اور کابل کو خواجہ کلاں نے پوری طرح قابو میں رکھا۔ خواجہ نے اپنے آقا کی وفات پر ایک غم

ناک قطعہ بھی لکھا تھا۔ خانزادہ بیگم کے زیر اثر اہل حرم بھی شروع میں نہایت متحد رہے اور ہمایوں نے باپ کی خواہش پر کہ بھائیوں پر اعتماد اور ان کی شایان شان کفالت کی جائے، حرف بہ حرف عمل کیا۔ وزیر سلطنت خلیفہ کی وفاداری آخری مہینے میں مشکوک ہوگئی تھی۔ اس کا ہم آئندہ نام نہیں سنتے اگرچہ اس کے بیٹے سرکاری عہدوں پر مامور رہے۔

غرض سارے خاندان اور طاقتور امرا میں جس قسم کی ہم آہنگی اور یک جہتی اس موقع پر دیکھی گئی ایسی سولہویں صدی کے اوائل میں ایشیا اور ایشیا ہی کیا یورپ کے وقائع میں بھی شاذونادر مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ یہ چند سال بعد کا واقعہ ہے جب کامران کا ہمایوں سے تنازع ہوا اور لائق اور خطرناک شیر شاہ نے ہندوستان میں بغاوت کر کے ہمایوں کو نکال باہر کیا اور اسے پہلے کابل، پھر ایران جا کے شاہ طہماسپ صفوی کی پناہ لینی پڑی۔ گلبدن جو اپنی اصلی ماں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ مارے مارے پھرنے میں ہمایوں کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی دوبارہ ہندوستان آئی جہاں واپس آ کر ہمایوں کا انتقال ہوا اور گلبدن بیگم نے اس کا اور اپنے باپ کا تذکرہ ''ہمایوں نامہ'' تحریر کیا۔ لیکن ہمایوں کے سوانح کتاب کے موضوع سے خارج اور ہندوستان کے مغل سلاطین کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔

شیر کی قبر کچھ عجیب طرح محفوظ رہی۔ پہلے وہ آگرہ کے ایک باغ میں دفن کیا گیا۔ یہ شہرہ آفاق روضہ ممتاز محل کے عین مقابل میں تھا۔ نو سال تک قبر وہیں رہی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے بابر نے خواجہ کلاں یا دوسروں کو اس بارے میں ضروری ہدایتیں

کر دی تھیں اور جب ہمایوں اور مغل دربار ہندوستان سں دھکیل دیئے گئے تھے، بی بی مبارکہ آگرے آئی اور اپنے شوہر کی باقیات کو بہ حفاظت دروں کے راستے کابل منتقل کئے جانے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ کوہاں بابر کی پسندیدہ تفریح گاہ میں قبر بنا دی گئی۔ یہاں چنار کے جھنڈے سے بالا حصار اور دوسری طرف میدانوں کے پار پغمان کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی ہیں قبر کے چٹپے تعویذ کے قریب ایک چشمہ بہتا ہوا کابل ندی تک گیا ہے۔ اوپر، بغیر دیوار کے پتلے ستونوں پر چھت ڈال دی ہے۔ مگر پہلے چھت نہ تھی۔ ٹیکرے کے نیچے شاہجہاں۔ چھوٹی سی مسجد بنوائی تھی۔ قبر پر سنگ مرمر کی لوح اور کتبہ جہانگیر نے لگایا۔ ٹیکرے کی ڈھلانوں پر خاکی چٹانوں، کائی یا خودرو پھول کی جھاڑیوں کے سوا کوئی آرائش نہیں نظر آتی۔ موجودہ کابل شہر سے درختوں اور بالا حصار کی پہاڑی نے اس مقام کو اوجھل میں کر دیا ہے۔ قبر کے باغ کو رحلت گاہ بابر کے سادہ نام سے پکارتے ہیں۔

بابر نے 48 برس کی عمر پائی، جس میں 36 برس حکومت کی۔ سمرقند کی بادشاہی بیس برت تک جدوجہد کرنے کا باوجود ہاتھ سے نکل گئی تو اس نے ہندوستان میں نئی سلطنت کی بنا ڈالی مگر اس کی شان و شوکت دیکھنے کو زندہ نہیں رہا۔ مغل سلاطین اعظم کی یہ سلطنت نوجوان اکبر کی 1556ء میں تخت نشینی کے بعد ہی منظم واستوار ہو سکی۔ تاہم عہد اکبری میں وہ اسی راستے پر چلی جس کی داغ بیل بابر نے ڈالی تھی۔

شیر نے کابل و کشمیر کو کوہستانی فصیلوں کے پار پنجاب کی ندیوں اور گنگا کی وادیوں سے ملا کر ہندوستان کا نقشہ ہی بدل ڈالا اور اسی ضمن میں لودھی سلاطین اور

راجپوت راجاؤں کی جاگیرداری جتھوں کے ساتھ مذہبی تفریق و منازعت کا بھی خاتمہ کر دیا۔اس نے ممالک ہند میں فرماں روائے واحد کا اقتدار جو بہت مدت سے نابود ہو چکا تھا، از سر نو بحال کیا اور اپنی سلطنت کو ماضی کی بجائے مستقبل کا سوچنے کی فکر و نظر عطا کی۔ مقامی روایات اور مالی نظام بحال رہنے دیئے لیکن نظم و نسق کی باگ بادشاہ کے وزیروں کے ہاتھ آ گئی۔ خود بادشاہ کی ذات ان سے ماوری رہی تا کہ عمال کی بے لاگ نگرانی اور انصاف کر سکے۔ بادشاہ پر قلندری کی جو چھاپ لگی تھی، وہ بابر سے اکبر موارث ہوئی۔

بابر کا طرز عمل کہ جنگ و فتح کے وقت کمال سفا کی اور اس کے بعد غیر معمولی عفو و رواداری، بڑے بڑے منگول خوانین کی روایات کی جھلک دکھاتا ہے۔ غازان ،منگو، قبلائی نے بھی اسی طرح حکومت کی تھی۔ اکثر کہا گیا ہے کہ ممالک یورپ کے بادشاہوں نے ''کریم النفس جابروں'' کا جو کردار پیش کیا، بابر ان سے ایک صدی پیشتر اس کا نمونہ بنا تھا۔ بایں ہمہ اس کے افعال عموماً اس کی شخصی صفات کے مظہر تھے۔

وہ اپنے تیموریوں کا نغمہ و شعر......اور شراب کا ذوق ہندوستان میں لایا۔ ایسے ایسے مقامات پر جہاں کسی خیال بھی نہ جاتا تھا، بابر نے بیسیوں باغ تیار کرائے اور اسی شیفتگی کی بدولت ''شاہ باغ ساز'' کے خطاب کا مستحق ہوا۔ سایہ دار و ثمر ور درختوں کے علاوہ اور عمارات بھی اس کے پیچھے پیچھے آگرے تک آئیں جہاں جہاں سے مغلوں کے قدم گزرے جہاں سنگ و مرمر کے محلات۔ بڑی بڑی مسجدیں اور

مقبرے نمودار ہونے لگے۔ بابر تو یہ منظر دیکھنے کے لئے زیادہ نہ جیا، لیکن اس کا گمشدہ وطن سمرقند، ہندوستان میں اٹھالایا گیا۔

اسی دور میں دوسری سرزمینوں میں نئی نئی ں کی بناپڑ رہی تھی، جن کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ بھی طاقت اور زبردستی کی بجائے تہذیب وتمدن کا گھر تھیں۔ ازبک خوانین سولہویں صدی کے آخر تک سمرقند پر قابض تو تھے لیکن وہ اپنے منگول اسلاف کی فقط پرچھائیں رہ گئے تھے۔ اصلی خانہ بدوش صحرائی میدانوں میں ہٹتے چلے جا رہے تھے۔ سولہویں صدی کے چھٹے عشرے میں جب اکبر کی امن رواداری کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، صفوی شاہوں اور عثمانلی سلاطین کے مابین بھی صلح ہوگئی۔ ادھر شمال میں کنارِ والگا کے شہر قازان سے آخری تاتاری خوانین کو ماسکو کے آئی ون المعروف بہ ''دہشت ناک'' کی توپوں سے نکال باہر کیا۔

وسط ایشیا کے شہ سوار تیر اندازوں کی ہزار سالہ برتری کا خاتمہ ہوا اور نہ صرف پہلی مرتبہ بلکہ ہمیشہ کے لئے تہذیب کے آلات جسمانی بدوی قوت پر غالب آ گئے۔

وسط صدی کے عبوری دور ہی میں جستجو کا قدم ایشیا کے محفوظ گوشوں تک آیا۔ فرنگی آنکھوں نے تبت کی پہاڑی فصیلیں مشاہدہ کیں۔ پھر نورد پادری چین کے دروازوں میں داخل ہوئے۔ تاکہ یقین سے معلوم کریں کہ منچو سلطنت میں تو اس ''کیتھے'' (خطا) کا کوئی اثر آثار باقی نہیں، جس کی کیفیت مارکو پولو نے تحریر کی تھی۔ ایک صاحب عزم انگریز انتھونی جنکنسن موسکو سے مشرق میں چلتے چلتے سمرقند کی کاروانی شاہراہ تک پہنچ گیا۔ عثمانلی ترکوں نے جو شہر سو سال پہلے نصاری سے چھینا

تھا، اب وہاں لندن و پیرس کے سفارت خانے قائم ہوئے اور انہوں نے اسے " سلیمان عالی شان" کا دربار کہنا شروع کیا۔

1600ء کے آتے آتے انگریزوں کی نئی بحری سلطنت کے متجسس تاجر پرتگیزوں اور ولندیزوں کے پیچھے لگے ہوئے مغلوں کے دربار تک پہنچنے والے تھے اور بابر کی ساختہ سلطنت میں ان کی پذیرائی ہونے والی تھی۔ صدی کے اسی آخری سال میں معزز (ایسٹ) انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے بنی تھی جس نے آگے چل کر سارے ملک ہی کو اپنا مقبوضہ بنالیا۔ تاہم یہ آنریبل کمپنی اس مشرقی مقبوضہ کی روایات اور گوناگوں معاشیات بدلنے کی کوشش میں اتنی کامیاب ہونے والی نہ تھی جتنی شیر سمرقند کو اس حکمت عملی کی بدولت نصیب ہوئی کہ رعایا کو اپنی پسند کے مطابق زندگی گزارنے دی جائے۔

بابر کا اپنی قلم کا لکھا ہوا تزک کا نسخہ معدوم ہو گیا۔ تاہم اس کی زندگی میں اور کچھ بعد اس کی نقول، اور اکثر فارسی میں کر لی گئی تھیں۔ بظاہر ایک خواجہ کلاں کے پاس تھی اور میرزا حیدر دوغلات یقیناً ایک نسخے کا مالک تھا۔ ہمایوں نے اپنے ہاتھ سے ایک نقل کی تھی اور شرحی حواشی بھی بڑھا دیئے تھے۔ باپ نے خود اس کے افعال پر جو نکتہ چینی کی، حتی کہ دہلی کے خزانے تڑوانے کے ذکر میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں کی تھی۔ گلبدن بیگم نے بھی صریحا بابر نامے کے فارسی نسخے سے کام لیا تھا۔ شاہ جہاں کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود تھا جس کی بہت عمدہ تذہیب و تزئین کی گئی تھی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل خاندان ان سوانح کی بڑی قدر کرتے تھے اور

دوسرے کتاب میں بھی تزک نہایت محترم تھی۔ نتیجہ یہ کہ یہ مخطوطے بغیر کسی تدوین و تبویب کے اور یقیناً بلاتصرف ہم تک پہنچے۔ ان دور دور پھیلے ہوئے فارسی اور ترکی کے نسخوں میں لفظی، اختلافات پائے جاتے ہیں مگر معنی و مطالب میں فرق نہیں اور جو خلا بابر نے چھوڑ دیئے تھے وہ بھی سلامت ماندہ نسخوں میں قریب قریب اسی طرح چھٹے ہوئے ہیں۔ ہم پورا یقین رکھ سکتے ہیں کہ جو تزک بابری ہم آج پڑھ رہے ہیں، وہی ہے جسے ساڑھے چار سو برس پہیل اس نے لکھا تھا) (بجز چند مشکوک جزئیات کے)۔ ہندوستان کے اس پہلے بادشاہ کی ساری زندگی کے ایام جس طرح چین لئے بغیر گزرے اس کے باعث وہ پوری کتاب کی نظرثانی کرنے کی فرصت نہ پاسکا اور غالباً تمام اجزا کو اچھی طرح مرتب بھی نہیں کرسکا۔ اس نے کتاب کا کوئی نام بھی تجویز نہیں کیا تھا۔ وہ از خود بابر نامہ کہلانے لگی۔ اس کا آغاز بلا کسی تمہیں کے ایک دم (59) ان کلمات سے شروع ہوتا ہے کہ: ''در سنہ ہشت صد و نو دو نہ، در ولایت فرغانہ سن دوازدہ سالگی پادشاہ شدم۔'' اور فوراً ہی وہ بے تکلف اس مملکت کا جغرافیہ، وہاں کے مشاہیر کا حال لکھنے لگتا ہے جن سے اسے سابقہ پڑا اور جن میں خود اس کا باپ شامل ہے۔ بعد میں جب اسے کابل میں کچھ سکون حاصل ہوا تو ادھر ادھر بعض جملے بڑھائے۔ جیسے یہ جملہ کہ ''ہندوستان کو زیر نگیں لانے کا میں ہمیشہ سے قصد کرتا تھا۔'' (فارسی تزک میں: ''در تاریخ ...... کہ ولایت کابل مسخر شد، ازاں تاریخ تا حال ہمیشہ ہوس ہندوستان جکردہ می شد۔'' مترجم) یہ لاف زنی بھی اس کی فطرت کا ایک پہلو دکھاتی ہے: یعنی جب داؤپیچ سے یا لڑ جھگڑ کے اتفاقاً کوئی

کام بن گیا تو فرط شادمانی میں کہتا ہے کہ میں ہمیشہ سے اسے کرنے کی فکر میں تھا۔ کبھی کبھی کسی بدنمائی کی بات کو وہ گول بھی کر جاتا ہے جیسے سمرقند میں خانزادہ بیگم کو شیبانی کے حوالہ کرنے کا واقعہ۔لیکن آج تک کسی نے جو شاہ کے لقب سے ملقب ہوا ،اپنی کوتاہیاں، ناکامیابی، فراریاں، نشہ بازیاں اتنی وضاحت اور قوت سے بیان نہیں کیں۔معلوم ہوتا ہے وہ اپنے اعمال کو بالکل ایک غیر آدمی کی طرح دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا تھا۔

تزک کے بعض اجزا جن کے ملنے کی افسوس ہے کوئی امید نہیں پائی جاتی، یقیناً اس نے تحریر کئے تھے۔کیونکہ ایسی بیاضوں کے بعد آئندہ اوراق کے سلسلہ بیان میں وہ اکثر ان واقعات کا حوالہ دیتا ہے جو گم شدہ پچھلے صفحات میں درج کئے تھے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ ایسے واقعات کا ذکر کئے بغیر ہرگز نہ رہ سکتا تھا جیسے اس کے بیٹے کامران اور عسکری کی ولادت۔یا آخری سال میں ہمایوں کا یکا یک آگرے آجانا۔علی ہذا۔پتھر کے پل پر ازبکوں کو بلا امداد غیرے اس کا اچھی طرح رگڑنا ،جس کا میرزا حیدر نے تذکرہ کیا ہے اور یا پہلی مرتبہ لذت مے کشی سے آشنا ہونا ، یقین ہے کہ ان پر اس نے حسب عادت خوب لکھا ہوگا۔مگر وہ تزک میں محفوظ نہیں رہا۔ ابتدائی عمر میں اپنی بیویوں کے مختصر مگر بڑی باریکی سے نقشے اتارے ہیں۔لیکن کابل کی بیگمات کا تذکرہ مبہم ہے،حتی کہ دلدار بیگم اور ماہم کے حالات آئے ہیں لیکن ان کے خاندان ونسب یا ذاتی اوصاف ومزاج کا ذکر نہیں جیسا کہ بابر معمولاً تحریر کیا کرتا ہے۔ 1525ء (931ھ) خاص ہندوستان پر حملے کے ساتھ سے تزک غیر مربوط

اور وقتاً فوقتاً سلسلہ بیان منقطع ہو گیا ہے اس زمانے میں بیماری بار بار اسے تنگ کرنے لگی تھی۔ حسن اتفاق سے گلبدن بیگم نے اہل حرم کے آگرے میں وردو سے اپنی سرگزشتہ کا آغاز کیا ہے۔ اگرچہ خاندان کے خانوادہ شاہی بن جانے کے بعد اس نے ہمایوں کی تصویر بہتر سے بہتر رنگ میں کھینچی ہے۔

☆............☆............☆

اعتراف اور شکریہ

بابر اپنی تزک میں عموماً ہر نام کے ساتھ پورے القاب وخطاب تحریر کرتا ہے۔ مگر ہم نے اپنی کتاب میں اس سے اقتباسات کرتے وقت انہیں چھوڑ دیا یا مختصر کر دیا ہے۔ جیسے سلطان علی میرزا کو صرف ''پرنس علی'' لکھا ہے۔ پھر کوئی جشن ہو یا جنگ یا معمولی حادثہ، ان میں اپنے رفیقوں کا وہ نام بنام ذکر کرتا ہے اور اس کا غیر معمولی حافظہ بیسیوں نام کی فہرست تیار کر دیتا ہے۔ یہ سب اس کے لئے مانوس تھے مگر ہمارے آج کے ناظرین کے لئے نہیں ہوسکتے۔ لہذا میں نے صرف مشہور یا پیش نظر احوال کے لئے ضروری ناموں کو رہنے دیا، باقی حذف کر دیئے ہیں۔ پھر اس کا اچٹتا ہوا بیان، خصوصاً ترکی میں، کہیں کہیں مطلب کو مبہم بنا دیتا ہے۔ واقعتہ گھوڑے پر ملک ملک کی منزلیں مارتے ہوئے اس نے کتاب لکھی تھی۔ واقعات ذہن میں تازہ اور مقصداً اختصار سے لکھنا تھا۔ پھر قدرتی طور پر بہت سے مقامات جو اس کے وقت میں معروف تھے ان کی پتہ دیئے بغیر وہ نام لکھ دینا کافی سمجھتا ہے لہذا ایسے موقعوں پر ہمیں کچھ تشریحی کلمات اضافہ کرنے ضروری معلوم ہوئے۔

ترکی متن کے اس فاضلانہ ترجمے (بابر نامہ ان انگلش) کا میں نہایت مرہون ہوں جسے اینٹ ایس بیورج نے کیا (لندن، 1921ء) اور فارسی سے جسے لیڈن اور ارسکن کے لاجواب ترجمے (''میموائرز اوف ظہیر الدین بابر۔ لندن 1826ء) کا جس سے میں نے زیادہ تر افادہ کیا کیونکہ فارسی سے واقف ہوں اور چغتائی ترکی

سے واقفیت نہیں رکھتا ہے۔ ان تینوں لائق برطانی مترجموں نے جغرافی حواشی دیئے ہیں جو ان کے زمانے میں بہت مفید تھے ال منسکی کا روسی ترجمہ (قازان 1857ء) جس کا کورتل نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا (1871ء) لفظی اور بلا حواشی کے ہے۔

دوسرے بیش بہا ہم عصر ماخذ یہ ہیں: گلبدن بیگم کا "ہمایوں نامہ" (ترجمہ بیورج "دی ہسٹری اوف ہمایوں" لندن، 1902ء) میرزا حیدر کی "تاریخ رشیدی" (خلاصہ از ڈینی سن راس۔ لندن، 1895ء) "شیبانی نامہ" محمد صالح (ویمبری، 1885ء) اور خواندمیر کی "حبیب السیر" (فارسی۔ طہران 1271ھ) عام ادبی کتب جن سے استفادہ کیا گیا: براؤن کی "تاریخ ادبیات فارسی۔" بودے کی "ل انپائر منگول۔" بارٹولڈ اور منورسکی کی "فور اسٹڈیز اون دی ہسٹری اوف سینٹرل ایشیا۔" اولاف کاروکی "دی پٹھانز" اور ایشوری پرشاد کی "دی لائف اینڈ ٹائمز اوف ہمایوں ہیں۔"

ڈاکٹر عزیز احمد جو اس وقت ناظم اطلاعات عامہ تھے اور حکومت پاکستان کا میں خاص طور پر زیر بار احسان ہوں کہ مجھے کابل سے لاہور تک بابر کی آمد کے راستوں کی تحقیق کرنے کے زمانے میں اپنا مہمان بنایا اسی طرح بریگیڈر گلزار احمد کا جنہوں نے خاص خاص قلعوں کی کیفیت بتائی جو بابر کے زمانے میں دریائے سندھ کے کنارے پر موجود تھے۔ جامعہ استنبول کے پروفیسر ذکی ولدی توگن نے اس عہد کی کم معروف خوارزمی تہذیب کی نہایت مفید حقیقت بیان کی۔

1960ء کی گرمیوں سوویت روس کی اکاومی کے ادارہ مشرقیہ کے ارکان نے ازبکوں کے دوسری قوموں سے تعلقات کے بارے میں، شیبانی کی سیرت و خصائل کی وضاحت میں اور تیموری عہد کے شہر سمرقند کا خاتمہ کھینچنے میں مدد دی۔ تاشقند کے درس گاہ کی ناظمہ ڈاکٹر اعظم جانوا نے کمال عنایت سے بابر کی عائلی زندگی کے متعلق اپنے مطالعے سے مستفید فرمایا اور کتاب ''مبین'' کے اقتصادی حصے کے بارے میں بھی میں نے انہی کی تحقیقات سے اپنی کتاب میں کام لیا۔

☆..........☆..........☆

حوالہ جات

1۔ ''شش محرم'' بہ حساب جمل ہجری سال ولادت 888 اور روز ولادت بھی ہے۔ (مترجم)

2۔ مصنف اپنے دوسری کتابوں: ''چنگیز خاں'' اور ''دی ارتھ شیکرز'' میں مغول کے ظہور کی کیفیت لکھی ہے۔

3۔ متن میں یہ نام ''ابوسید'' لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ (مترجم)

4۔ یہ مصنف کی ناواقفیت کی بات ہے۔ قرآن مجید سے تفاٗل کر سکتے ہیں لیکن وہ یا شاہ نامہ پیش گوئیوں کی کتاب نہیں ہے۔ (مترجم)

5۔ جو شخص کلام حافظ سے بہرہ اندوز ہو اس کا صاف نام ادا نہ کر سکنا بالکل خلاف قیاس بات ہے۔ (مترجم)

6۔ اس کا املا ایسن (دولت بیگم) بھی کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

7۔ مغلوں میں رسم تھی کہ نئی دلہن کا گھونگھٹ کوئی بچہ اٹھا کر بھاگ جاتا تھا۔ شاید مصنف نے ٹھیک بات نہیں سمجھی۔ (مترجم)

8۔ اصل ترکی تلفظ آخشی۔ (مترجم)

9۔ فارسی تزک میں: ''دہ کجا و درختان کجا'' (مترجم)

10۔ فارسی میں: ''خربزہ میر تیموری'' (مترجم)

11۔ مراد شیخ عبید اللہ احرار قدس سرہ سے ہے۔ (مترجم)

12۔اصل نام قہر علی (مترجم)

13۔ بہ تصحیح مترجم)

14۔ بہ تصحیح مترجم۔

15بہ تصحیح مترجم۔

16۔فارسی تزک میں معاجیذن یا منشیات لکھا ہے۔مترجم۔

17۔اصل لفظ ''رتیق۔''مترجم۔

18۔ بہ تصحیح مترجم۔

19۔مصنف نے یہاں نافعی سے ''حرام گوشت'' تحریر کیے ہیں۔مترجم۔

20۔صحیح پورا نام:ویس لاغری۔مترجم۔

21۔فارسی تزک میں ''خواجہ کلاں، بڑا بھائی، ملا صدر۔''مترجم۔

22۔فارسی تزک میں: اذیر فع ابراهیم القواعد ......الایہ۔مترجم

23۔ بہ تصحیح مترجم۔

24۔مطلب ہے:ویس بیگ لاغری۔مترجم۔

25۔فارسی تزک میں ہے کہ اسے جانے کی آخر اجازت دی۔مترجم۔

26۔اصل فارسی شعر:شوم شرمندہ ہر گہ یار خود را درنظر بینم۔رفیقاں سوئے من بینند و من دگر بینم۔مترجم۔

27۔مصنف نے اسے بابر کے طبع زاد چو بولہ تحریر کیا ہے۔میں نے تزک فارسی کا تتبع مناسب سمجھا۔مترجم۔

28۔ کوہ ''سرہ تاق'' مترجم۔

29۔ بہ تصحیح مترجم۔

30۔ فارسی تزک میں یہ الفاظ نہیں ہیں اگر چہ مراد لئے جا سکتے ہیں۔مترجم۔

31۔ یہ وہی درویش ہیں جو مرغنیاں کی دعوت ملنے سے پہلے بابر کو ملے تھے۔ مصنف نے وہاں نام نہیں دیا اور یہاں غلطی سے عبدالمکارم لکھا ہے۔ہم نے صحت کر دی۔مترجم۔

32۔ مراد: سلطان حسین میرزا۔مترجم۔

33۔ مصنف نے اس کا ترجمہ Ten Tops لکھ دیا ہے اصل تزک سے صحیح نام یہاں لکھا گیا۔مترجم۔

34۔ تزک فارسی میں ''تاجیک'' لکھا ہے۔مترجم۔

35۔ بہ تصحیح مترجم۔

36۔ تزک میں نام مومن، لیکن مصنف کا قول کہ وہ مفعول بلا سند اور غلط ہے بابر کوکلتاش کے غم میں کئی دن روتا رہا۔مترجم۔

37۔ انگریزی متن میں Alasha لکھا ہے۔اصل تزک میں الچھ (الاچی بہ معنی قتال) ہے اور یہ عرف ہے۔اصل نام احمد خاں تھا۔مترجم)

38۔ مصنف نے اس اس کا نام بھی صرف انگریزی ترجمہ لکھ دینا پسند کیا تھا۔ یہاں اصل نام تزک سے نقل کیا گیا ہے۔مترجم۔

39۔ ایضاً مترجم۔

40۔مصنف نے ’دگل خانہ‘‘ لکھا ہے۔مترجم۔

41۔مصنف نے اوپر کا شعر بابر کے کسی ندیم سے منسوب کیا اور یہ مصرع (شعرلکھ کر)بابر کا بتایا ہے اور یہ دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔مترجم۔

42 ۔ فارسی تزک میں یہ قصد مسجد کی بجائے ایک مزار سے منسوب ہے۔ مترجم۔

43۔فارسی تزک کی رو سے یہ واقعہ دریائے سندھ کے پار پیش آیا۔مترجم۔

44۔انگریزی میں: Happy Princess فارسی تزک میں فیروزہ بیگم نام لکھا ہے۔مترجم۔

45۔تزک میں بابر نے لکھا ہے کہ شرم کی وجہ سے مجھے اجازت نہ دی۔ مترجم۔

46۔مصنف نے مولانا رومیؒ کے ان مشہور افکار کو (قصہ شبان وموسیٰ جماد کا ارتقا) اپنی سمجھ کے موافق بیان کیا ہے۔ہم نے خفیف تبدیلی کے ساتھ نسخہ ترجمہ کر دیا۔مترجم۔

47۔مصنف نے لکھا ہے کہ بابر کا شیبانی کو ان پڑھ کہنا غلط ہے۔لیکن فارسی تزک میں لکھا ہے کہ ’’وہ ان پڑھ نہ تھا‘‘ علمائے ہرات کو بھی صرف جھڑ کنا لکھا ہے تفسیر کا ذکر نہیں نظر آیا۔مترجم۔

48۔مصنف نے دو ارغون بھائی اور تیسرا مقیم لکھا ہے حالانکہ مقیم ہی (شاہ بیگ)ارغون کا بھائی تھا ہم نے صحت کر دی۔مترجم۔

49۔ اس فصل میں فاضل مصنف نے روحانیات اور مسلمانوں کے تصوف کی نسبت اپنے افکار عالیہ پیش کئے ہیں بابر کے تذکرے یا تاریخ سے ان کا کچھ تعلق نہیں نظر آتا اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو محض دخل در معقولات معلوم ہوں گے۔ مگر ہم نے حقیقت تصرف اور ضروری تصحیح کے ساتھ بجنسہ ان کا ترجمہ کر دیا ہے۔ مترجم۔

50۔ مصنف نے جتنے شاعروں کا اوپر نام لیا، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا۔ مترجم۔

51۔ مصنف کا مطلب ''وحدت الوجود'' سے ہے۔ لیکن واقفیت کی کمی سے اس کا یہ سارا بیان نادرست خیال کیا جائے۔ شیعہ عقائد میں یہ اعتقاد شامل نہیں ہے اور نہ سینوں کو اس مطلق انکار ہے۔ (مترجم)

52۔ مصنف نے یہاں ''Acrobat'' لکھا ہے۔ لیکن نٹ قدیم ہندی زبانوں میں رقاص کو کہتے ہیں۔ اسی طرح متن میں ''بخشیش'' لکھا ہے۔ جس کا ہم نے انعام ترجمہ کیا ہے۔ مترجم۔

53۔ فارسی تزک سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ مترجم۔

54۔ یہ نام مشکوک ہے۔ فارسی تزک میں ''ہل ہل اتکہ'' لکھا ہے۔ مترجم۔

55۔ تزک فارسی میں ''جنگ جنگ۔'' مترجم۔

56۔ تزک فارسی میں بہار لکھا ہے اور ''بارہ'' کوئی معروف نام نہیں ہے۔ مترجم۔

57۔ مصنف نے اسے ''Vivtory'' لکھا ہے۔ تزک میں غازی نام آتا

ہے۔مترجم۔

58۔مصنف نے اردو کے متعلق وہی عام اور فرسودہ نظریہ دہرایا ہے مگر یہ پوری طرح صحیح نہیں ہے۔مترجم۔

59۔شروع میں مختصر حمد و نعت، اپنا نام اور ولدیت تحریر کر دی ہے۔یا کم سے کم فارسی تزک میں درج ہے۔مترجم۔

☆............☆............☆

The End------------------ختم شد